قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2026 قیمت ₹25

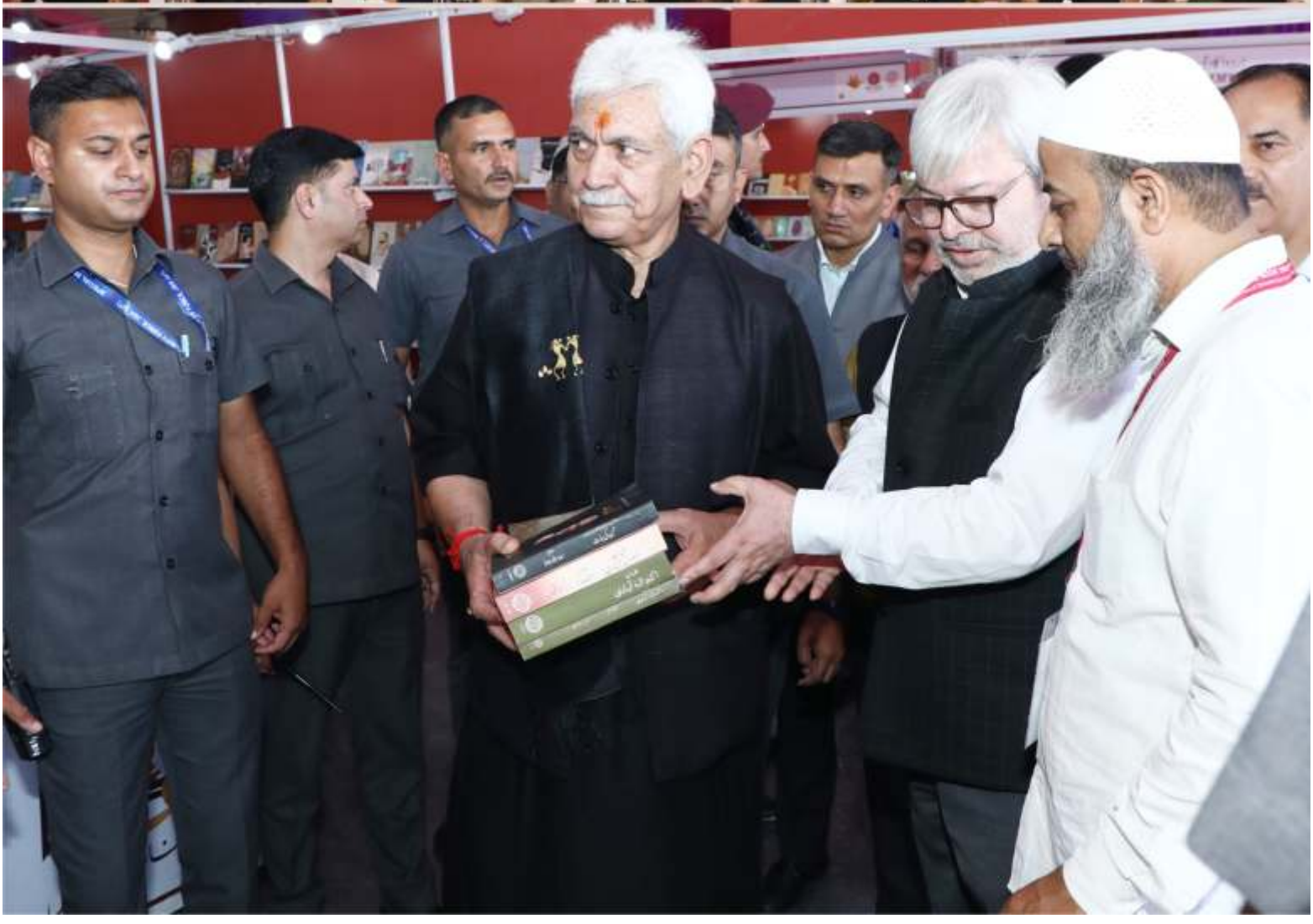
CHINAR BOOK FESTIVAL

ماہنامہ اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi





چنار بک فیسٹیول 2026 کی ادبی تقاریب و مذاکرات کے شرکا


جناب مظفر علی


پروفیسر افتخار عالم


پروفیسر نذیر احمد کتانی


پروفیسر نصیر اقبال


ڈاکٹر شمس اقبال


پروفیسر محمد زاہد الحق


پروفیسر روپ کرشن بھٹ


پروفیسر مفتی مدثر فاروقی


جناب رفیق راز


پروفیسر نذیر آزاد


پروفیسر اعجاز محمد شیخ


پروفیسر عرفان احمد ملک


پروفیسر خالد جاوید


پروفیسر شفق سوپوری


پروفیسر شہاب عنایت ملک


پروفیسر دانش اقبال


پروفیسر احمد محفوظ


پروفیسر محمد الطاف آہنگر


جناب پاپولر میرٹھی


محترمہ رخسانہ جبیں


جناب نعمان شوق


جناب نوشید اکرم


پروفیسر ستیش دہل


ڈاکٹر حفیظ الرحمن


ڈاکٹر نیتا پانڈے


جناب سلیم سالک


محترمہ آسیہ قدیر


ڈاکٹر شفیع ایوب


جناب نذیر کتانی


جناب شفیع اتو


ڈاکٹر عبدالحی


ڈاکٹر اشرف بستوی


ڈاکٹر فیضان الحق


جناب عمر فرحت


جناب محمد اکرام


محترمہ نہاں رباب


جناب محمد فرقان عالم

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:9، ستمبر 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس
B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: اختر حسین
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: Total Pages:100

- قلمکاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

ای-میل

editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746،
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین — 5

رپورٹ

چنار بک فیسٹیول 2026 — 7



قومی یوم اساتذہ

- ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن: ایک استاد اور معمار — سلمان عبدالصمد — 18



ادب: زاویے اور جہات

- اساسِ ثلاثہ: فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ کالج — ابوبکر عباد — 20
- علامہ جمیل مظہری کی فکری جہات — خان محمد رضوان — 23
- وارث علوی اور افسانہ کی تنقید — تنویر احمد — 26
- غالب: حیات نو کا استعارہ — ریاض احمد — 29
- ویریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر — مہر النساء — 32
- اُردو میں نسوانی شاعری کی روایت — وجے کمار — 34
- مرزا محمد رفیع سودا کا قصیدہ 'تضحیکِ روزگار': ایک مطالعہ — صدام حسین — 38



جہان ترجمہ

- تمل ناڈو کا ایک باکمال شاعر: گنڈو عبدالقادر شاکر — سید سجاد حسین — 41
- اردو ادب میں ویکّم محمد بشیر: تراجم کا ایک جائزہ — عارف این — 44



- منور لکھنوی: بحیثیت سنسکرت-اردو مترجم — محمد اسجد — 47

فلم و تھیٹر کا رنگ منچ

- ہندوستان میں فلم کا آغاز اور اس کی ترقی کے مراحل — مجید بیدار — 50
- لوک داستانیں اور ہندی سنیما — احمد خان — 54
- فینٹسی فلموں میں داستانوی عناصر — محمد فیضان — 58



- ہندستانی رنگ منچ کے ارتقا میں یورپین ڈرامے کا کردار — شارق محمد عزیز — 62

کتابوں کی دنیا

- تبصرہ و تعارف — ادارہ — 65



جہانِ آگہی

- خبرنامہ — ادارہ — 74

ہماری بات

معزز قارئین!

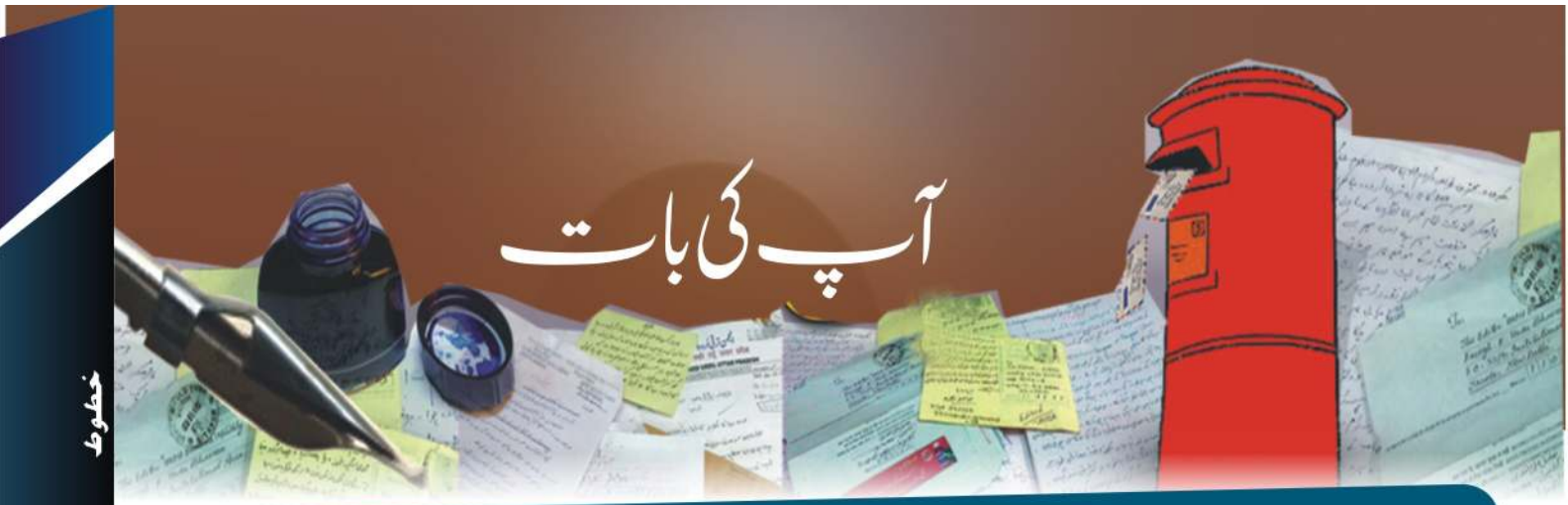
کتاب کسی بھی مہذب معاشرے کی فکری بنیاد اور تہذیبی شناخت کا اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کو صرف معلومات فراہم نہیں کرتی بلکہ سوچنے، سمجھنے اور زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت بھی عطا کرتی ہے۔ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں موبائل فون، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے معلومات تک رسائی کو بے حد آسان بنا دیا ہے، لیکن معلومات اور علم میں بنیادی فرق آج بھی برقرار ہے۔ سرسری معلومات سے انسان وقتی طور پر باخبر تو ہو سکتا ہے مگر اس کے اندر وہ گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی جو کتابوں کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے مطالعے کی عادت اور کتابوں سے تعلق آج بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے ماضی میں تھے، بلکہ بدلتے ہوئے حالات میں ان کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے۔ اسی احساس کو تقویت پہنچانے کی غرض سے چنار بک فیسٹیول 2026 اپنے تیسرے ایڈیشن کے ساتھ وادیٔ کشمیر کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی میں ایک اہم اور خوش آئند سرگرمی کے طور پر سامنے آیا۔ یہ نو روزہ فیسٹیول محض کتابوں کی نمائش اور فروخت تک محدود نہیں رہا بلکہ علم، ادب، مکالمہ، ثقافت اور تخلیقی اظہار کا جامع پلیٹ فارم ثابت ہوا۔ کتابوں کے اسٹالز کے ساتھ علمی و ادبی مذاکرے، مصنفین سے ملاقات، شعری نشستیں، فکری مباحث، ثقافتی پروگرام، صوفیانہ موسیقی، بچوں کی سرگرمیاں اور دیگر پروگرام منعقد کیے گئے۔ ان سرگرمیوں کا بنیادی مقصد کتاب اور قاری کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنا اور نئی نسل میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ خاص طور پر طلبہ، نوجوان اور عام قارئین کی بھرپور شرکت اس بات کا روشن ثبوت رہی کہ کشمیر میں کتاب اور علم سے محبت آج بھی زندہ ہے۔ کتابوں کے اسٹالز پر قارئین کی آمد، علمی نشستوں میں شرکت اور مصنفین سے ملاقات کا شوق اس امید کو مضبوط کرتا ہے کہ اگر نئی نسل کو کتاب اور مطالعے کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے تو کتاب دوستی کی روایت کو مزید مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر چنار بک فیسٹیول 2026 پہلے دو ایڈیشن کے مقابلے میں زیادہ منظم، وسیع اور کتاب دوستی کے احیا کی جانب ایک مثبت قدم ثابت ہوا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں اس فیسٹیول کی تفصیلی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے جو یقیناً شائقینِ علم و ادب کی ترغیب کا سامان بنے گی۔



دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ 5 ستمبر کو ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی سالگرہ کی مناسبت سے قومی یومِ اساتذہ منایا جاتا ہے۔ رادھا کرشنن ایک عظیم فلسفی، استاد، مفکر اور ماہرِ تعلیم ہونے کے ساتھ ہندوستان کے اہم تعلیمی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے دوسرے صدر جمہوریہ اور نائب صدرِ جمہوریہ اور وزارتِ تعلیم کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ تعلیم کے میدان میں ان کی ایک بڑی خدمت 49-1948 کا یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن ہے، جس کی سفارشات نے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم کا مقصد صرف وقتی معلومات کا حصول نہیں بلکہ شعور کو پروان چڑھانے کے ساتھ پوری شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یومِ اساتذہ کو صرف ایک شخصیت کی یاد کا دن تصور نہیں کیا جاتا بلکہ استاد اور تعلیم کے بنیادی رشتے پر غور کرنے کے زریں موقع کے طور پر بھی عمل میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رادھا کرشنن کو بھارت رتن، جرمنی کا 'پورلے میریٹ'، 'پیس پرائز آف دی جرمن بک ٹریڈ'، 'آرڈر آف میرٹ'، ساہتیہ اکادمی فیلوشپ اور ٹیمپلٹن پرائز سمیت متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ ان اعزازات سے بڑھ کر ان کی اصل پہچان ایک ایسے استاد اور مفکر کے طور پر رہی جس نے تعلیم کو شخصیت سازی اور معاشرتی تعمیر کے اہم ذریعے کی شکل عطا کی۔ آج کے بدلتے ہوئے تعلیمی ماحول میں بھی ان کی فکر ہماری رہنمائی کرتی ہے اور ہمیں یہ سوچنے کی دعوت دیتی ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے اور ہمیں اپنے بچوں کو کس طرح کا انسان بنانا چاہیے۔

چنار بک فیسٹیول 2026 اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی فکر، دونوں ہمیں ایک ہی بنیادی بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ کسی معاشرے کی حقیقی ترقی علم، مطالعے، تعلیم اور فکری بیداری سے ہوتی ہے۔ اس شمارے میں ترجمہ اور فلم و تھیٹر کے متعلق دو اہم گوشے بھی شامل ہیں جو ہمارے علمی و ادبی کلچر کو فروغ دینے کا اہم حوالہ ہیں۔

شمس اقبال



آپ کی بات

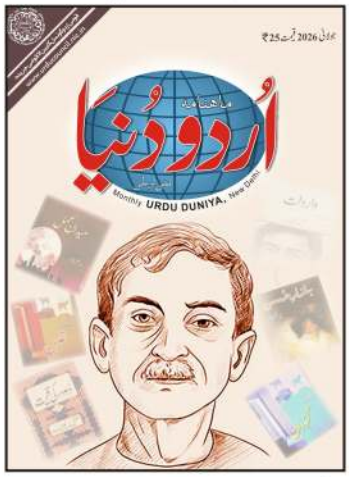
ماہنامہ’اردو دنیا‘ میں ’آپ کی بات‘ کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلمکاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ مشمولات سے اندازہ ہوا کہ اس شمارے میں کچھ ایسی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں جن سے لسانی تہذیب و ثقافت، جدید طریقۂ تدریس، اردو ماس میڈیا کی تدریس کے طریقِ کار اور موجودہ دور میں پریم چند کے فکر و فن کی معنویت کو سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ گوشۂ پریم چند میں پریم چند کی افسانوی کائنات کو بھی سمیٹنے کی سعی کی گئی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کا مضمون اس گوشے کو مزید اعتبار بخشتا ہے۔

یہ شمارہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اردو کے دو اہم قلمکاروں پر بھی جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہیں، خراجِ عقیدت کے طور پر دو معیاری نگارشات شامل ہیں۔ کسی شمارے میں چھ سات مستند اور معتبر ادیبوں کی تحریروں کو یکجا کر دینا اپنے آپ میں ایک بڑی کامیابی ہے۔ بلاشبہ اس شمارے کو وقیع اور لائق توجہ بنانے میں مدیران کا اہم کردار رہا ہے۔

غضنفر، علی گڑھ، اتر پردیش

ماہنامہ’اردو دنیا‘ جولائی 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق منشی پریم چند کے ناول اور افسانوی مجموعے کی تصاویر سے مزین ہے، اس لیے اس کی خوبصورتی مزید بڑھ گئی ہے۔ ہماری بات میں مدیر منشی پریم چند کی تخلیقات، سماج کے لیے ان کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان کی تخلیقات میں محض کہانی نہیں بلکہ ایک پورا عہد سانس لیتا دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود پریم چند کا نام ادب، انسان دوستی اور حقیقت نگاری کی علامت کے طور پر زندہ ہے، ویسے پریم چند سماجی ادیب و حقیقت نگار تھے، ان کی تخلیقات میں سماجی کوائف، حالات و واقعات اور مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ’آپ کی بات‘ میں قارئین کی آرا کو پیش کیا جاتا ہے، ادارے کی کوشش ہوتی ہے کہ ان آرا کے ذریعے رسالے کے محاسن و معائب کو بیان کیا جائے۔ شمارے میں شامل پہلا مضمون علی رفاد فتیحی کا ہے جو بہت عمدہ مضمون ہے، اس میں زبانوں کے خاندانوں سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ عطاء الرحمٰن نے ’اسسمنٹ: افادیت اور طریقہ کار‘ میں تجزیے اور تبصرے کے ذریعے جائزہ لیا ہے، اسسمنٹ کئی برسوں سے لاگو ہے، اس پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اسسمنٹ میں جانبداری ہوتی ہے، پروجیکٹ منصوبہ میں کوئی صلاحیت اجاگر نہیں ہوتی ہے۔ پھر بھی جانچ تو ہر عام انسان کرسکتا ہے مگر اسسمنٹ کے لیے زبان اور مضمون پر عبور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ گوشہ منشی پریم چند میں نامور سنگھ اور ہندستانی ادب کا پرامیتھیوس: پریم چند (قدوس جاوید)، دور حاضر میں پریم چند کی معنویت و افادیت (صغیر افراہیم)، پریم چند: قلم کا سپاہی چند مباحث (شہزاد انجم)، کفن کی ایک اور قرأت (ارشاد نیازی)، پریم چند کی حقیقت نگاری ’کفن‘ اور پوس کی ایک رات (محمد انعام الحق)، پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی احتجاجی آوازیں (عافیہ حمید)، سورداس، بھوشن، جنگل میں منگل (منشی پریم چند)، بشیر بدر ایک منفرد شاعر (احمد نثار)، اردو ماس میڈیا کی تدریس اور پروفیسر شاہد حسین (شفیع ایوب)، ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی استاد اور ادیب (شعیب رضا فاطمی)، فاروق سید اور گل بوٹے (فیروز بخت احمد)، سائنسی متن کا اردو ترجمہ: مسائل و مباحث (تلمیذ فاطمہ نقوی)، اظہار خضر کی تنقید نگاری (ریاض توحیدی)، قاضی عبدالستار کے افسانوں میں تہذیبی قدریں (عبدالرزاق زیادی) وغیرہ مضامین میں نیا پن نظر آرہا ہے، مواد اور معلومات جدت ندرت لیے ہوتے ہیں، مضامین میں نئے احساسات، خیالات اور معلومات کو جگہ دی گئی ہے۔ طلبا،



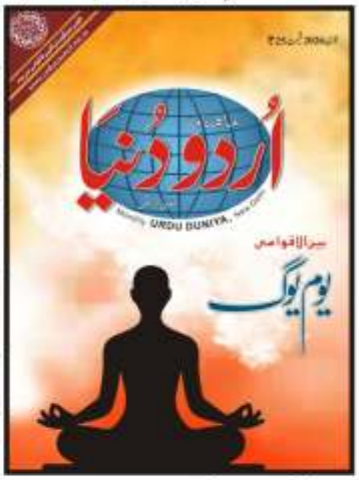
اسکالر اور عام قاری کے لیے 'اردو دنیا' کے شمارے کسی نعمت سے کم نہیں، اس میں ادبی، علمی، معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ مسابقتی امتحانات کے لیے یہ بھی رسالہ بہت معاون اور مددگار ہے۔ بہتر ہوگا کہ 'اردو دنیا' خرید کر پڑھیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل:9603018825

ماہنامہ 'اُردو دنیا' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند، نئی دہلی سے شائع ہونے والا ایک خالص علمی وادبی بین الاقوامی جریدہ ہے۔ رسالہ میں علم وادب، تاریخ، تہذیب، صحافت، سائنس وٹکنالوجی، سماجیات، تراجم، طب وصحت، ملک کی جنگِ آزادی، ہندی فلموں میں اردو کے کردار پر مثبت انداز کے غیر مطبوعہ مضامین فیچرز کے ساتھ نئی کتابوں پر تبصرے اور پورے ہندوستان میں زبانِ اردو سے جڑے تہذیبی، ثقافتی علم وادب کے سمیناروں، پروگراموں اور دیگر سرگرمیوں سے متعلق خبریں بھی شامل ہوا کرتی ہیں۔ اردو دنیا کے ہر شمارے کے مطالعہ سے سبھی قسم کے قارئین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہر شمارہ اتنا دلچسپ ہے کہ ایک پڑھا نہیں دوسرے کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ اپنے طور پر ضرور منگوائیں اور اُردو کی بقا، ترقی ونشوونما میں حصّہ لیں۔

افضل بیگ، بنگلورو، کرناٹک

ماہنامہ 'اردو دنیا' شمارہ جون 2026 موصول ہوا، پہلی نظر سرورق پر ٹھہر سی گئی۔ یہ خوبصورت سرورق یوگا کی مناسبت سے تیار کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں یوگا پر ایک گوشہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں یوگا کے تعلق سے اہم گفتگو کی گئی ہے۔ 'اداریہ' یعنی 'اپنی بات' میں ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال صاحب نے جسمانی کثرت (یوگا) اور روحانی توانائی حاصل کرنے کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔



بین الاقوامی یومِ یوگ کے تناظر میں پیش کی گئیں تحریریں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ یوگا کی معرفت صحت مند زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ اس میں دورائے نہیں کہ یوگا سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، یوگا کو دنیا میں مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ یوگا تاریخی تہذیبی اور فکری منظر نامہ (معین الدین،) جسمانی صحت اور فلسفۂ یوگ (اسعداللہ)، یوگا موجودہ عہد کی ایک ضروت (محمد طلحہ)، یوگا کی عصری معنویت (عبدالحافظ فاروقی علیگ) سبھی نے یوگا کے موضوع کا حق ادا کیا اور شاندار طریقے سے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ گوشۂ عالمی یوگ کے علاوہ تعلیم اور خواتین کی بااختیاری (ڈاکٹر سیدہ مبین زہرہ) عمدہ واور معلوماتی مضمون ہے۔ امید ہے یہ مضمون تعلیمی بیداری اور خواتین میں تعلیمی شعور پیدا کرنے نیز انھیں اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے میں مددگار ثابت ہوگا۔

تہذیب وثقافت کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور اردو ادب، محمد علی جوہر کے ساتھ 'ہو' قبیلے کا لسانی اور تہذیبی جائزہ بھی خوب ہے۔

شبنم حمید کا مضمون 'معاصر شاعرات کی تخلیقات میں نسائی حسیت' بھی بہترین کہلانے کا مستحق ہے۔ نسائی حسیت ایک پیچیدہ، تہہ دار اور متحرک تصور ہے جو عورت کے سماجی ثقافتی اور نفسیاتی تجربے سے جنم لیتا ہے، مگر اس تک محدود نہیں رہتا۔ یہ حسیت ہمیں دنیا کو طاقت کے زاویے سے نہیں بلکہ تجربے، احساس اور تعلق کے تناظر میں دیکھنا سکھاتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی معلوماتی اور لائق مطالعہ ہیں۔ میرا خیال ہے راہ کی لاکھ دشواریوں کے باوجود آج بھی قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' رسالہ ملک میں اردو زبان ترسیل کے اعتبار سے بہت ہی مستحکم اور لسانی ہم آہنگی کے نقطۂ نظر سے گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہے۔ بلاشبہ اردو زبان میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی بھی زبان کو بین الاقوامی وقار بخشتی ہیں۔

ڈاکٹر حبیب سیفی، حوض رانی، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی شمارہ مارچ 2026 ہمارے مطالعہ کی میز کی زینت ہوا۔ یہ نہایت دیدہ زیب سرورق رنگا رنگ، صفحات عمدہ ترین ڈیزائننگ اور تحقیقی، ادبی مضامین کا آئینہ دار ہے، پختہ کار قلمکاروں کی شرکت مدیر ماہنامہ، عزت مآب پروفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کا ادیبانہ ذوق اور اردو قافلہ کی عمدہ قیادت قابل تعریف ہے۔ 'اردو دنیا' کا یہ ماہنامہ 'اردو دنیا' اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں میں عرصہ دراز سے شہرت یافتہ ہے۔



کتابوں کے کئی میلوں میں میں نے شرکت کی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے بک اسٹال سے کونسل کی شائع شدہ الگ الگ موضوعات پر بہت ساری کتابیں بھی خریدیں۔ الحمدللہ آج ہمارے پاس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع شدہ کتابیں ایک بڑی تعداد میں ہماری رضوی عزیزی لائبریری میں موجود ہیں۔ میں کونسل کی خدمات سے پچھلے کئی برسوں سے متعارف ہوں، ماہنامہ اردو دنیا کی ممبری کا میرا پرانا خواب تھا جو اب شرمندہ تعبیر ہوا، ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ اس کے علاوہ آپ کی ادارت میں سہ ماہی فکر وتحقیق ماہنامہ خواتین کی دنیا اور ماہنامہ بچوں کی دنیا بھی نکلتے ہیں۔ اردو زبان کے فروغ میں ان رسالوں کا اہم رول ہے۔ خدا کرے ان رسالوں کی عمر دراز سے درازتر ہو۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے ماہنامہ اردو دنیا کے علاوہ شائع ہونے والے دیگر رسائل بھی ہم اپنی لائبریری کے لیے جاری کروائیں گے تاکہ ان جرائد سے عام قارئین سے مستفید ہوں۔

معین رضا رضوی، شالیمار، ناسک، مہاراشٹر

ادارہ

چنار بک فیسٹیول 2026



وادیِ کشمیر کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت کو نئی توانائی عطا کرنے کے مقصد سے منعقد ہونے والا نوروزہ بک فیسٹیول محض ایک کتاب میلہ نہیں بلکہ علم، ادب، مکالمے، ثقافت اور تخلیقی اظہار کا ایک جامع پلیٹ فارم ثابت ہوا۔ فیسٹیول کے دوران کتابوں کی نمائش اور فروخت کے ساتھ ساتھ مختلف علمی مذاکرے، ادبی نشستیں، مصنفین سے ملاقات، شعری محفلیں، ثقافتی پروگرام، صوفیانہ موسیقی، بچوں کی سرگرمیاں اور فکری مباحث منعقد کیے گئے تاکہ کتاب اور قاری کے درمیان تعلق کو مزید مضبوط بنایا جاسکے۔

چنار بک فیسٹیول کا بنیادی مقصد نئی نسل کے اندر مطالعے کا ذوق پیدا کرنا، انھیں مثبت اور تعمیری فکر کی طرف راغب کرنا اور کتابوں کے ذریعے ایک باشعور، ذمہ دار اور مہذب معاشرے کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف شعبہ ہائے علم سے تعلق رکھنے والے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے قارئین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی گفتگو نے نوجوان نسل کو نہ صرف کتابوں کی اہمیت سے آگاہ کیا بلکہ انھیں مطالعے کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنانے کی ترغیب بھی دی۔

آج کے دور میں جب نوجوان نسل کا ایک بڑا طبقہ سوشل میڈیا اور اسکرین کی دنیا میں مصروف نظر آتا ہے، ایسے میں چنار بک فیسٹیول نے یہ پیغام دیا کہ تخلیقی صلاحیت اور وسیع النظر شخصیت کی تشکیل صرف سنجیدہ مطالعے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کتاب کے لمس، مسلسل قرأت اور اس کے ساتھ ذہنی مکالمہ انسان کے اندر وہ فکری گہرائی پیدا کرتا ہے جو محض سرسری معلومات سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بک فیسٹیول کے مختلف سیشنز میں بارہا اس بات پر زور دیا گیا کہ مطالعہ ہی بہتر معاشرے کی تشکیل اور تہذیبی شعور کی بنیاد ہے۔

اس بک فیسٹیول کی کامیابی کا سب سے روشن پہلو طلبہ، نوجوان اور عام قارئین کی غیر معمولی شرکت رہی۔ خراب موسم اور مسلسل بارش کے باوجود لوگوں کا جوش وخروش کم نہ ہوا۔ کتابوں کے اسٹالز پر قارئین کی مسلسل آمد، مصنفین سے ملاقات کا شوق، علمی نشستوں میں بھرپور شرکت اور کلچرل اسٹیج و آتھرز کارنر میں سامعین کی کثیر تعداد اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ کشمیر کی سرزمین میں کتاب اور علم سے محبت آج بھی زندہ ہے۔



پریس کانفرنس (16 جولائی 2026)

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، قومی اردو کونسل اور ضلع انتظامیہ، سری نگر کے باہمی اشتراک سے 18 جولائی 2026 تا 26 جولائی 2026 ایس کے آئی سی سی، سری نگر میں منعقد ہونے والے چنار بک فیسٹیول کے تعلق سے آج صبح 11 بجے ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، اس پریس کانفرنس میں این بی ٹی کے ڈائرکٹر جناب یوواراج ملک، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال ، ڈپٹی کمشنر سری نگر اکشے لابرو اور چنار بک فیسٹیول کے چیف کنوینر ڈاکٹر امت وانچو نے صحافیوں سے بات چیت کی اور چنار بک فیسٹیول 2026 کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کیں۔

این بی ٹی کے ڈائرکٹر جناب یوواراج ملک نے صحافیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چنار بک فیسٹیول اب ایک سالانہ کیلنڈر ایونٹ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، جو مطالعے کے فروغ، ادبی مکالمے اور ثقافتی تبادلے کے لیے ایک موثر پلیٹ فارم ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فیسٹیول میں مختلف زبانوں کی کتابیں نمائش کے لیے رکھی جائیں گی، جب کہ متعدد ادبی، ثقافتی اور فکری پروگرام بھی منعقد ہوں گے۔

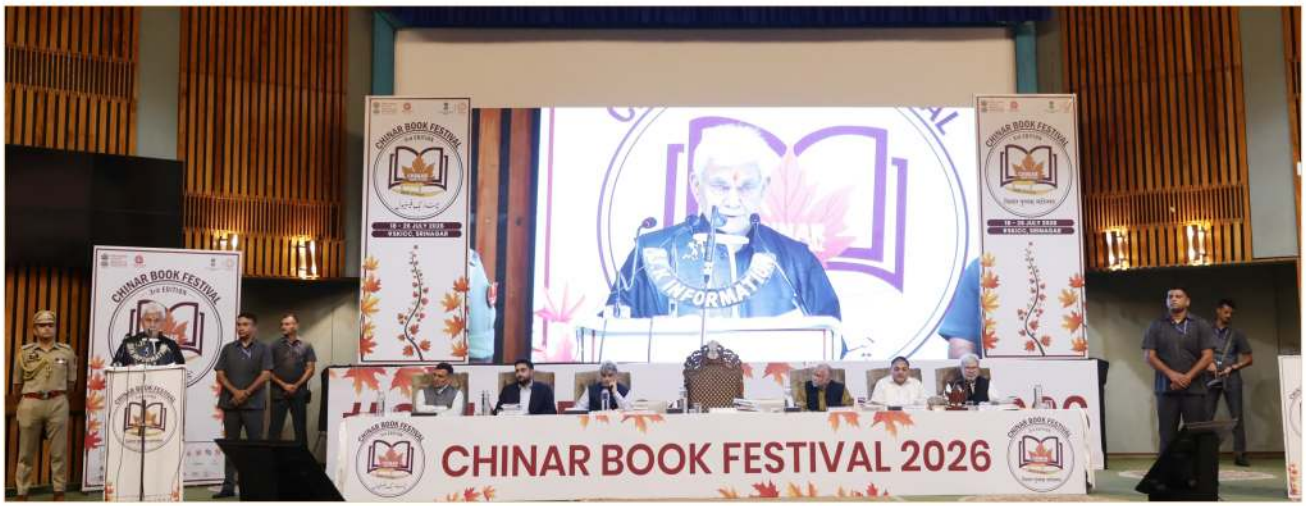
قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے بتایا کہ چنار بک فیسٹیول کے تیسرے ایڈیشن میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے اردو پبلشر شریک ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اس سال کتاب میلے کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آپ نے بتایا کہ ایک شاندار مشاعرہ، شام صوفیانہ اور مظفر علی جیسی اہم شخصیات سے مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

ڈپٹی کمشنر سری نگر اکشے لابرو نے شکارا ریلی کو جھنڈی دکھائی اور کہا کہ 18 سے 26 جولائی تک جاری رہنے والا یہ فیسٹیول عوام کے لیے مکمل طور پر مفت ہوگا اور اس میں داخلے کے لیے کسی ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چنار بک فیسٹیول کے چیف کنوینر ڈاکٹر امت وانچو نے بھی صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فیسٹیول کی مختلف ادبی و ثقافتی تقاریب میں کالج و یونیورسٹی کے بچے بھی شرکت کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ چنار بک فیسٹیول کے تیسرے ایڈیشن میں ملک بھر سے تقریباً 200 ناشرین، 250 سے زائد بک اسٹالز اور 800 سے زیادہ ادیب، شاعر، فنکار، دانشور اور مفکرین شرکت کر رہے ہیں۔







پہلا دن (18 جولائی 2026)

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی و ضلع انتظامیہ سری نگر کے باہمی اشتراک سے منعقد ہونے والے کتابوں کے سب سے عظیم جشن، 'چنار بک فیسٹول 2026' کا شاندار افتتاح عزت مآب جناب منوج سنہا (لیفٹیننٹ گورنر، صوبہ جموں و کشمیر) کے ہاتھوں آج ایس کے آئی سی سی، سری نگر میں کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کے اس سنہری موقعے پر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھا کر مراٹھے، این بی ٹی کے ڈائرکٹر جناب یوراج ملک، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، ڈپٹی کمشنر، سری نگر جناب اکشے لابرو، سیکرٹری جموں و کشمیر جناب اتل دلو اور سیکرٹری ہائیر ایجوکیشن، جموں و کشمیر جناب رام نواس شرما شریک رہے۔

افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر جناب منوج سنہا نے اس موقعے پر اپنے خیالات کے اظہار کا آغاز بشیر بدر کے چند اشعار سے کیا اور کہا کہ چنار بک فیسٹول نہایت مختصر وقت میں علم، تہذیب اور وراثت کی علامت بن گیا ہے۔ وادیِ کشمیر کے لیے یہ فیسٹول صبر، تسلسل اور استقامت کی نشانی ہے۔ یہ اب محض کتابوں کی نمائش نہیں ہے بلکہ خیالات کے لین دین کا مرکز بن کر ابھرا ہے۔ چنار بک فیسٹول میں قومی یکجہتی بھی نظر آتی ہے اور انیکتا میں ایکتا کی صورت بھی۔ یہ فیسٹول نوجوانوں کو پیغام دیتا ہے کہ قلم کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔ کتابیں زندگی سے مکالمہ قائم کرتی ہیں اور ہمیں بہتر بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ چنار بک فیسٹول نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ادب اطفال کو پیش کر کے ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ جب بچہ اپنی مادری زبان میں پڑھتا ہے تو اپنی جڑوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ کتاب میلوں کی کامیابی کا اندازہ کتابوں کی فروخت کی در کے بجائے علمی و ادبی خیالات کے تبادلے اور ڈسکورس سے لگانا چاہیے۔ فیسٹول تبھی کامیاب تصور کیا جائے گا جب یہ خیالات یہاں سے نکل کر کالج اور یونیورسٹی میں سنجیدہ ڈسکورس کا حصہ بن جائیں۔ انھوں نے اس بک فیسٹول کے منتظمین کو مبارکباد دیتے ہوئے اپنی گفتگو گوپال داس نیرج کے ان اشعار پر ختم کیا۔

ہم تری چاہ میں اے یار وہاں تک پہنچے
ہوش یہ بھی نہ جہاں ہیں کہ کہاں تک پہنچے
ایک اس آس پہ اب تک ہے مری بند زباں
کل کو شاید مری آواز وہاں تک پہنچے
چاند کو چھو کے چلے آئے ہیں وگیان کے پنکھ
دیکھنا یہ ہے کہ انسان کہاں تک پہنچے

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھا کر مراٹھے نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور



چنار فک فیسٹول کے نام کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ چنار کا درخت گھنی اور شیتل چھاؤں کے لیے جانا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس درخت میں ایک قسم کی سرخی بھی ہوتی ہے۔ جو سرخی گیان کی روشنی سے میل کھاتی ہے۔ یہ درخت کشمیر کی تہذیبی اور علمی وراثت کا نشان بھی ہے۔ انہی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے بک فیسٹول کا نام چنار بک فیسٹول منتخب کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسے کشمیر کی عوام، طلبہ اور اساتذہ کا فیسٹول قرار دیا اور کہا کہ اس فیسٹول کو کشمیر کے باشندوں نے نہایت محبت سے اپنا بنا لیا ہے۔ اس سال بک فیسٹول کی تھیم 'Together We Read, Together We Lead' ہے۔ قرآن کے پہلے لفظ 'اقرا' سے بھی یہی پیغام ملتا ہے کہ پڑھائی کو اولیت دی جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی یہی خواہش ہے کہ وہ پہاڑی، گجری اور دیگر علاقائی زبانوں کو ہندوستان کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ان میں مواد فراہم کرے۔ کتاب میلے کے انعقاد کا ایک بڑا مقصد علمی، تہذیبی اور ثقافتی لین دین ہے۔

اخیر میں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے ڈائرکٹر جناب یوراج ملک نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چنار بک فیسٹول محض ایک فیسٹول کا انعقاد نہیں بلکہ تہذیبی وراثت کا نام ہے۔ اس فیسٹول سے لٹریری ٹورزم کو فروغ ملا ہے اور عالمی پیمانے پر چنار بک فیسٹول کی ستائش کی جارہی ہے۔ اس فیسٹول میں 200 سے زیادہ ناشرین اور 800 سے زیادہ فنکاروں کی شرکت متوقع ہے۔

چنار بک فیسٹول کے اس تیسرے ایڈیشن کی افتتاحی تقریب میں چند اہم کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس افتتاحی اجلاس میں بڑی تعداد میں دانشور، ادبا اور طلبا و طالبات کی شرکت رہی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ فیسٹول شائقین علم وادب کے دلوں میں خاص جگہ بنا چکا ہے۔

دوسرا دن (19 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول کے تیسرے ایڈیشن میں آتھر کارنر میں آج ایک مذاکرہ بعنوان 'اردو، کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات کی مینا کاری' منعقد کیا گیا۔ قومی



اردو کونسل نئی دہلی کی جانب سے منعقد کیے جانے والے اس مذاکرے میں پروفیسر مفتی مدثر فاروقی (نامور اسکالر و صدر شعبۂ انگریزی، یونیورسٹی آف کشمیر)، اور محترمہ آسیہ قدیر (صدر برلا اوپن مائنڈس انٹرنیشنل اسکول، سری نگر) نے بطور پینلسٹ شرکت کی اور ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن نئی دہلی) نے اسے موڈریٹ کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل نے اپنے مہمانوں کا شال پوشی کے ذریعے استقبال کیا اور اس اہم پروگرام میں شریک ہونے پر ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے پہلے مہمان پروفیسر مفتی مدثر فاروقی نے کہا کہ تصوف اور مشترکہ تہذیبی روایات کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے صوفیا کی آمد سے قبل ہی کشمیر کی سرزمین مشترکہ تہذیبی عناصر کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یہاں کے رشیوں نے مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ماحول کو سازگار بنایا اور مختلف طبقات و مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تصوف کے بنیادی نکتے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ محبت ہی کائنات کی تخلیق کا بنیادی محرک ہے۔ کشمیریت اور یہاں کی تہذیب سے نئی نسل کی وابستگی کے لیے اردو اور کشمیری زبان سے واقفیت کو لازمی قرار دیتے ہوئے انھوں نے ان زبانوں کو سیکھنے کی ترغیب دی اور کہا کہ اردو اتنی شیریں زبان ہے کہ اگر اس سے معمولی سی بھی واقفیت ہو تو مزید جاننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ نئی نسل کو اپنی وراثت کے تحفظ کے لیے اس زبان کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ کشمیریت کی جڑ اردو، فارسی اور کشمیری زبانوں میں پیوست ہے۔

مذاکرے کی دوسری مہمان محترمہ آسیہ قدیر نے کشمیریت اور مشترکہ تہذیبی روایات کے فروغ میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ماں کا کردار ہمارے گھر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ایک خاتون صرف گھر کی معمار نہیں ہوتی بلکہ وہ سوسائٹی اور ملک کی بھی تعمیر کرتی ہے۔ انھوں نے شعر و ادب کی دنیا میں خواتین کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ادا جعفری کا بطور خاص ذکر کیا۔ اس کے علاوہ نئی نسل کی انگریزی زبان سے دوستی اور سوشل میڈیا سے اثر پذیری کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو نئے پلیٹ فارم پر بھی اپنی تہذیبی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے نہ صرف زبان کو فروغ ملتا



ہے بلکہ تہذیب سے ان کا رشتہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔

آج کے اس مذاکرے کو ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے نہایت خوبصورتی سے موڈریٹ کرتے ہوئے مہمان مقررین سے کئی اہم نکات پر گفتگو کی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے اس تاریخ ساز بک فیسٹیول میں اتنے اہم موضوع پر مذاکرے کا انعقاد کیا۔ اس مذاکرے میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال، کونسل کے افسران اور بڑی تعداد میں طلبا و قلمکار موجود رہے۔

چنار بک فیسٹیول کے دوسرے روز چلڈرن کارنر میں بچوں سے متعلق کئی سرگرمیاں بھی انجام دی گئیں اور مختلف ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے گئے۔ ایک سیشن میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے بچوں سے ملاقات کی اور آرٹ اینڈ کرافٹ سے متعلق بچوں کی دلچسپیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ شائقین کتب کی بھی بڑی تعداد کتاب میلے میں موجود رہی۔

تیسرا دن (20 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول 2026 کے تیسرے دن بھی مختلف علمی اور ادبی سرگرمیاں انجام دی گئیں جن میں 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت سہ لسانی فارمولہ اور کثیر لسانی تعلیم' کے عنوان سے آتھر کارنر میں ایک اہم مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مذاکرے میں پروفیسر افشار عالم (سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)، پروفیسر نصیر اقبال (رجسٹرار، یونیورسٹی آف کشمیر) نے بطور پینلسٹ اور پروفیسر اعجاز محمد شیخ (ماہر لسانیات و سابق صدر شعبۂ لسانیات، کشمیر یونیورسٹی) نے موڈریٹر کے طور پر شرکت کی۔

موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر افشار عالم نے ہندوستان میں نافذ کی جانے والی پرانی قومی تعلیمی پالیسیوں اور نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے درمیان مطابقت اور تبدیلیوں کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نفاذ سے طالب علموں کے لیے زبانوں کے انتخاب کا پیٹرن تبدیل ہوگیا ہے۔ اس پالیسی میں مادری زبان کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ لسانیات اور انڈین نالج سسٹم پر بھی خاصی توجہ دی گئی ہے۔ انھوں نے نئی تعلیمی پالیسی



اور انڈین نالج سسٹم کے درمیان ربط پر بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں حکومتی سطح پر مختلف غیر ملکی یونیورسٹیوں کو جگہ دی جارہی ہے تاکہ دیگر زبانوں سے ہندوستانی زبانوں کا رشتہ مضبوط ہوسکے اور انگریزی کے ساتھ علاقائی زبانیں بھی ترقی کرسکیں۔ NEP 2020 نے مادری زبان میں لکھنے پڑھنے کی جھجک کو دور کیا ہے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر زبان کے اساتذہ کی مناسب ٹریننگ دی جائے تاکہ اس پالیسی کا نفاذ بہتر طور پر ہوسکے۔

آج کے دوسرے مہمان مقرر پروفیسر نصیر اقبال نے کشمیر یونیورسٹی میں نئی تعلیمی پالیسی کے اطلاق کے حوالے سے کئی کارآمد نکات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی نافذ کرنے والے اداروں میں کشمیر یونیورسٹی کو اولیت حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی میں نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق ایک سال کا پی جی کورس بھی شروع کیا جارہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے مقامی زبانوں پر توجہ دی جانے لگی ہے اور یونیورسٹی بھی اس کے لیے بھرپور کوشش کررہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں چیلنجز ضرور ہیں لیکن اگر منظم طریقے سے کوشش کی جائے تو یہ ایک بہتر تبدیلی ثابت ہوگی۔

مذاکرے کے اختتام سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کنکلوڈنگ ریمارک دیتے ہوئے کہا کہ ہر ادارے کی سرگرمیاں ایک خاص تقاضے کے مطابق سامنے آتی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے تعلیم کے میدان میں نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے تقاضوں کے تحت کئی اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ اردو کا رشتہ ہندوستان کی دیگر زبانوں سے مضبوط کیا جاسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانیں ہماری اپنی زبانیں ہیں اور اردو کے تئیں انھیں کشمیر سے بہت امیدیں ہیں۔ اردو زبان پر کیسی ہی دشواری کیوں نہ آجائے لیکن کشمیر اسے بچالے گا۔ انھوں نے اس اہم مذاکرے میں شریک ہونے والے تمام مہمانوں کا شال پوشی کے ذریعے استقبال کیا اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

اس مذاکرے کو پروفیسر اعجاز محمد شیخ نے موڈریٹ کرتے ہوئے اس کا تعارف بھی پیش کیا اور کئی اہم سوالات قائم کیے جن کی روشنی میں مہمان مقررین سے قومی تعلیمی پالیسی کے تحت سہ لسانی فارمولہ اور کثیر لسانی تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں آسانی ہوئی۔





انھوں نے اس پالیسی کے اطلاق اور نفاذ کے متعلق بھی استفسار کیا جن کے تحت اہم تجاویز منظر عام پر آئیں۔

اس مذاکرے میں یونیورسٹی اور کالجز کے طلبا اور طالبات کے علاوہ بڑی تعداد میں دانشور اور قلمکار موجود رہے جنھوں نے انٹریکٹو سیشن میں موضوع سے متعلق کئی اہم سوالات بھی کیے جن کا مہمان مقررین نے تسلی بخش جواب دیا۔

مذاکرے کے بعد شام چار بجے کلچرل اسٹیج پر ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لانے والے معروف و معزز شعرائے کرام نے اپنے خوبصورت کلام سے نوازا۔ اس موقعے پر سامعین کا جم غفیر موجود رہا۔ مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرا میں جناب رفیق راز، جناب پاپولر میرٹھی، محترمہ رخسانہ جبیں، پروفیسر شفق سوپوری، جناب نعمان شوق، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر ستیش ول کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ شعرائے کرام نے مختلف موضوعات و مسائل سے متعلق غزلیں پیش کیں، بطور نمونہ یہاں ان کا ایک ایک شعر پیش کیا جا رہا ہے:

گلے پہ خاک تمھارے سر اور تال پہ خاک
غزل پہ خاک مضامین پائمال پہ خاک
(رفیق راز)

کتنی کنجوسی پہ آمادہ ہے سسرال مری
راز کی بات بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
ایسے کمرے میں سلا دیتے ہیں سالے میرے
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے
(پاپولر میرٹھی)

کٹا تو سکتے ہیں اس کو جھکا نہیں سکتے
تمام جسم میں سر کے سوا کچھ اور نہیں
(رخسانہ جبیں)

سنو یہ نالے سنو دشت آشنائی کے
اتر رہے ہیں کہیں قافلے جدائی کے
(شفق سوپوری)

ریل دیکھی ہے کبھی سینے پہ چلنے والی
یاد تو ہوں گے تجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہم
(نعمان شوق)

جانے ہم کس خیال میں گم تھے
آنکھ اٹھی تو سامنے تم تھے
(احمد محفوظ)

پیش منظر سے جدا شور تماشا سے الگ
سر بکف بیٹھے رہے ہم تیری دنیا سے الگ
(ستیش ول)

چوتھا دن (21 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول 2026 کے چوتھے دن بھی میلے میں شائقین کتب کی بڑی تعداد موجود رہی اور مختلف ادبی اور ثقافتی تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والی پروفیسر شفق سوپوری کی منفرد کتاب 'میر تقی میر کی غزلیہ شاعری کا غنائی پہلو' کی تقریب اجرا و مذاکرے کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ اس تقریب میں پروفیسر احمد محفوظ (ممتاز اردو اسکالر، شاعر و ناقد، نئی دہلی)، صاحب کتاب پروفیسر شفق سوپوری (ممتاز شاعر، ماہر تعلیم، افسانہ نگار و نقاد)، پروفیسر شہاب عنایت ملک (ماہر تعلیم، صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف جموں)، پروفیسر محمد الطاف انجم (اردو اسکالر ڈائرکٹر سینٹر فار ڈسٹینس اینڈ آن لائن ایجوکیشن، یونیورسٹی آف کشمیر) نے بطور مقرر اور جناب عمر فرحت (مدیر رسالہ تفہیم) نے بطور موڈریٹر شرکت کی۔ مقررین نے میر کی شاعری کے غنائی پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کتاب کو میریات کے باب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے مصنف اور کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے میر کی شاعری کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور پروفیسر محمد الطاف انجم نے بھی میر کی شاعری کے اس تکنیکی پہلو کو اہم قرار دیا۔ پروفیسر احمد



محفوظ نے کتاب تصنیف کرنے کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر نہایت قیمتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میر کی غزلوں میں موجود غنائی پہلوؤں کو مثالوں سے واضح کرتے ہوئے شاعری میں عروض و آہنگ، وزن، بحر اور موسیقی کے رشتوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مصنف کو اس بات پر مبارکباد پیش کی کہ کلام میر کا ایک نیا زاویہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب پروفیسر شفق سوپوری نے کتاب تصنیف کرنے کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب قومی اردو کونسل کی جانب سے 2024 میں منعقد ہونے والے میر سمینار کا نتیجہ ہے، جس میں پیش کیے گئے مقالے کی روشنی میں ڈاکٹر شمس اقبال اور پروفیسر احمد محفوظ کی ترغیب پر انھوں نے اسے باضابطہ ایک کتاب کی شکل عطا کرنے کا عزم کیا اور بہت کم وقت میں یہ کتاب منظر عام پر آ گئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ میر کی شاعری کا یہ پہلو اس اعتبار سے اہم ہے کیونکہ میر کے اشعار کی روانی و نغمگی ہر کسی کو متاثر کرتی ہے۔

اس سے قبل 'ڈیجیٹل عہد میں اردو کا مستقبل' کے عنوان سے ایک مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر محمد زاہد الحق (ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) اور جناب شاہد شفیع ایتو (ماہر تعلیم) نے بطور پینلسٹ اور جناب نذیر گنائی (آرٹسٹ اور ہیلتھ رپورٹنگ صحافی) نے بطور موڈریٹر شرکت کی۔ اردو کے مستقبل اور نئی تکنیکی تبدیلیوں کے حوالے سے دونوں مہمان مقررین نے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کو ڈیجیٹل پلیٹ فارم سے قریب کرنے کا مشورہ دیا اور اس کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالی۔

پروفیسر محمد زاہد الحق نے خدا بخش اورینٹل لائبریری



کے قیام اور موجودہ عہد میں مخطوطات کو محفوظ رکھنے اور عوام کے لیے قابل استفادہ بنانے کی تراکیب پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے 'کتاب الحشائش' اور 'کتاب التصریف' جیسی گراں قدر ہزار سالہ قدیم تصانیف کے مخطوطات پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ ان جیسے ہزاروں مخطوطات کو کیمکلائزیشن کے ذریعے محفوظ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ جلد ہی خدا بخش اورینٹل لائبریری کے مخطوطات سے عوام کو سوشل میڈیا کے ذریعے روشناس کرایا جائے گا۔

آج کے دوسرے مہمان جناب شاہد شفیع ایتو نے اردو اور ڈیجیٹل عہد کے موضوع پر کئی نکات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عملی طور پر کی جانے والی کاوشوں کا ذکر کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے جنوبی کشمیر کے خطے بطور خاص اقبال لائبریری میں ڈیجیٹل تبدیلیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ریڈنگ روم ایک لائبریری کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس میں بچوں کے استفادے کے لیے تمام نئے وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں۔

اس مذاکرے میں موجود معروف صحافی جناب اشرف بستوی اور ڈاکٹر عبدالحی نے ڈیجیٹل عہد اور اردو کے حوالے سے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔

قابل ذکر ہے کہ دونوں مذاکروں میں طلبہ و طالبات اور اسکالر کی بڑی تعداد موجود رہی جن میں متعدد طلبا نے کئی اہم سوالات بھی کیے جن کا مہمان مقررین نے تشفی بخش جواب دیتے ہوئے چنار بک فیسٹیول کے انعقاد پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کو مبارکباد پیش کی جنھوں نے ایسا خوبصورت پلیٹ فارم مہیا کیا۔

پانچواں دن (22 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول کے پانچویں دن 'میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات' کے عنوان سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر خالد جاوید (مشہور فکشن نگار) اور جناب خورشید اکرم (شاعر، افسانہ نگار اور مدیر) بطور پینلسٹ شریک ہوئے، مذاکرے کو ڈاکٹر فیضان الحق (ریسرچ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) نے موڈریٹ کیا۔ اس مذاکرے میں دونوں معروف قلمکاروں کے قلمی سفر پر گفتگو کی گئی اور ان کی تخلیقات کے حوالے سے اہم سوالات بھی کیے گئے جن کا دونوں قلمکاروں نے نہایت خوبصورتی سے جواب دیا۔

پروفیسر خالد جاوید نے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے متعلق خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اہم محرکات کی نشاندہی کی اور کہا کہ میری پہلی تخلیق 10 سے 12 سال کی عمر میں ہی منظر عام پر آ گئی تھی۔ تخلیق کار بہت حساس ذہن کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی حساسیت اس کو ہمیشہ بے چین رکھتی ہے جو مختلف سطحوں پر تخلیقی عمل میں کام کرتی ہے، اس عمل میں تخلیق کار ایک بالکل مختلف دنیا کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی لکھنے کے بعد لمبے وقفے تک میں اس کی گرفت میں رہتا ہوں لیکن دنیا کی خوشیاں اور دیگر مسائل ہمیں دوبارہ اپنی





اصل میں لوٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اپنی تخلیقات میں موجود تاریکی، دھند اور خوف کی فضا سے متعلق استفسار کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دنیا کی کوئی چیز حقیقی اور خوبصورت نہیں ہے، بدصورتی یا خوبصورتی دونوں کے معانی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ خوبصورت صرف خدا کی ذات ہے اس لیے دنیا کو دیکھنے کا یہ میرا اپنا زاویہ ہے۔ جب کوئی حقیقت ایک بار آشکار ہوجاتی ہے تو اسے دہرانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ میں تخلیق کے عمل کو مراقبے کا عمل سمجھتا ہوں، اور مراقبے میں ایک ہی لفظ کا مسلسل ورد کیا جاتا ہے۔

آج کے دوسرے قلمکار جناب خورشید اکرم نے اپنے تخلیقی سفر کے اسباب و محرکات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لکھنا سرنگ کے اندر سفر کرنے جیسا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق سے قبل اور اس کے بعد کی دنیا بالکل مختلف ہوتی ہے۔ کوئی بھی فن پارہ پڑھنے یا لکھنے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے۔ اپنی تخلیقات میں موجود زندگی، سماج اور فرد کے متعلق استفسار کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سیاسیات اور سماجیات میری فکری تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے عناصر میں ان کی شمولیت ضروری ہے اس لیے میں زندگی اور محبت کو اپنی تخلیقات کا بنیادی محرک تصور کرتا ہوں۔ ایک تخلیق کار کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ قارئین کے ذہنوں کو مختلف طور پر متاثر کرے۔ فکشن اور نظم کی اصناف پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شاعری کرنے کا عمل ناؤ پر دریا پار کرنے جیسا اور افسانہ لکھنے کا عمل تیر کر دریا پار کرنے جیسا ہے۔ شاعری کی زبان اپنے مرکز سے زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ کوئی بھی موضوع خود طے کرتا ہے کہ وہ کس ہیئت میں بہتر طور پر ڈھل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فکشن کے ساتھ نظمیں بھی لکھتا رہا ہوں۔

مذاکرے کے اختتام سے قبل انٹریکٹیو سیشن میں مختلف سامعین نے اپنے پسندیدہ قلمکاروں سے کئی اہم سوالات کیے جن کا دونوں قلمکاروں نے تسلی بخش جواب دیا اور فن پارہ تخلیق کرنے و پڑھنے کے متعلق اہم نکات کی جانب رہنمائی بھی کی۔

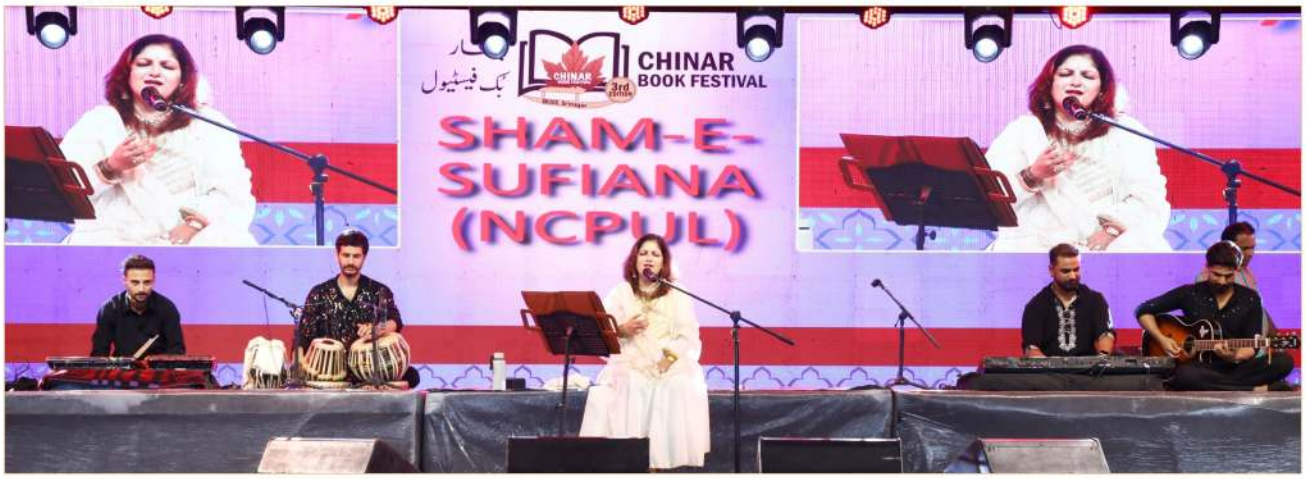
چھٹا دن (23 جولائی 2026)

آج چنار بک فیسٹیول کے چھٹے دن آتھر کارنر میں 'کشمیر کی ادبی جمالیاتی وراثت: روایت، جدت اور اثرات' کے عنوان سے ایک علمی و ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر روپ کرشن بھٹ (سابق پروفیسر، سی آئی آئی ایل، منسٹری آف ایجوکیشن، حکومت ہند اور معروف اسکالر و ماہر لسانیات)، پروفیسر نذیر آزاد (ممتاز ادیب، ماہر تعلیم، محقق و ناقد) اور پروفیسر عرفان احمد ملک (صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف کشمیر) بحیثیت پینلسٹ شریک ہوئے جب کہ ڈاکٹر سلیم سالک (جموں کشمیر کلچرل اکادمی سے وابستہ ادبی شخصیت و ایڈیٹر) نے مذاکرے کو موڈریٹ کیا۔

مذاکرے میں ماہرین نے کشمیر کی ادبی جمالیاتی وراثت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس کے تاریخی تناظر کو بھی واضح کیا تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کشمیر کی ادبی جمالیات روایت کے ساتھ جدت سے کتنی ہم آہنگ ہے۔ اس تعلق سے پروفیسر روپ کرشن بھٹ نے جمالیات کے عناصر، منظر نامہ، تصوف، رومانس اور تخیل کی جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے کشمیر کی ادبی جمالیات کی روایت اور تاریخ کو بھی اجاگر کیا بالخصوص کشمیری لوک ادب کی جمالیات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے سنسکرت اور فارسی کی جمالیات پر گفتگو کرتے ہوئے کشمیری ادب کی 500 سالہ تاریخ میں جمالیات کس طرح اثر انداز ہوئی اور شعرا بالخصوص چکبست نے اپنی شاعری میں کشمیر کی جمالیات کا کس طرح ذکر کیا، ان تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی۔

دوسرے مہمان پروفیسر نذیر آزاد نے استفسار کے جواب میں جمالیات کے مجموعی تناظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے یونانی اور سنسکرت جمالیات پر بھی گفتگو کی، ساتھ ہی ہندوستانی ماہرین جمالیات کی تعریفات کو اجاگر کرتے ہوئے پرفارمنگ آرٹس میں جمالیاتی عناصر کی بھی عمدہ طریقے سے نشاندہی کی۔ انھوں نے کشمیری شاعر رسول میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے لیے پرفارمنگ آرٹس جب ممنوع ٹھہرا تو شاعروں نے الفاظ سے ہی وہ کام لینا شروع کیے جو پرفارمنگ آرٹس میں لیے جاتے تھے۔ انھوں نے تصوف کی شاعری میں پوشیدہ جمالیاتی پہلوؤں کی طرف





اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس کو صرف تصوف کے نام سے ہی موسوم کرنا اس کی اہمیت کو کم تر ثابت کرنا ہے، جب کہ بہتر یہ ہوگا کہ اسے مغربی ماہرین جمالیات کے نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے، جس سے جمالیات کی بہت سی پرتیں واضح طور پر نمایاں ہوسکیں۔

مذاکرے کے تیسرے مہمان پروفیسر عرفان احمد ملک نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر تہذیب کی اپنی جمالیات ہوتی ہے جو ڈکشن کے تنوع کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے، ادب کی بنیاد جمالیات پر ہی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ مختلف پیرایے میں ادبی اصناف اور تحریکات میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ انھوں نے مزید کشمیر کی جمالیات کو اجاگر کرنے والے ان اہم ادبا کا بھی ذکر کیا جنھوں کشمیری ادب کی جمالیات کے الگ الگ گوشوں اور زاویوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں کرشن چندر، حامدی کاشمیری، شکیل الرحمٰن وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

انٹریکٹیو سیشن میں سامعین نے مہمانوں سے موضوع کے متعلق مختلف سوالات کیے جن کا انھوں نے تسلی بخش جواب دیا۔

مذاکرے کے بعد کلچرل اسٹیج کے وسیع ہال میں شام صوفیانہ کا بھی اہتمام کیا گیا جسے صوفی غزل سنگر ڈاکٹر نیتا پانڈے اور ان کی پوری ٹیم نے اپنے بہتر پرفارمنس سے یادگار بنایا۔ سامعین اس پروگرام سے کافی محظوظ ہوئے۔



ساتواں دن (24 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول کے ساتویں دن 'نئی نسل اور قومی تعمیر: چیلنجز، امکانات اور فرائض' کے عنوان سے علمی و ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر نذیر احمد گنائی (ممتاز ماہر تعلیم و وائس چانسلر ایس۔ کے۔ یو۔ اے۔ ایس۔ ٹی) اور پروفیسر نصیر اقبال (رجسٹرار یونیورسٹی آف کشمیر) نے بطور پینلسٹ اور ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی) نے بطور موڈریٹر شرکت کی۔ مذاکرے میں دونوں مہمانوں نے نئی نسل اور قومی تعمیر کے تمام پہلوؤں سے متعلق گفتگو کی اور چیلنجز کے ساتھ مستقبل کے امکانات کو بھی واضح کیا۔ اس تعلق سے پروفیسر نذیر احمد گنائی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ انسٹی ٹیوشنز کا کام سوچ کو جہت دینا ہوتا ہے، جس میں اس بات پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے کہ اپنے مقصد کے تئیں نئی نسل کا ذہن بہت ہی واضح ہو اور ان کو یہ پتہ ہو کہ انھیں جانا کہاں ہے۔ انھوں نے اپنے ملک ہندوستان کے مختلف انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے مستقبل کے شاندار امکانات پر امید افزا گفتگو کی اور یہ کہا کہ وکست بھارت 2047@ کا سب سے اہم عنصر ملک کے نوجوان ہیں، جن کا شعور سوالات قائم کرنے سے ہی پروان چڑھے گا، یہی وجہ ہے کہ عزت مآب وزیر اعظم حکومت ہند نے وکست بھارت 2047@ کے وژن کی کامیابی کے لیے نوجوانوں کو ہی مخاطب کیا ہے۔ مجھے امید ہے وکست بھارت 2047@ میں جموں و کشمیر کے نوجوانوں کا رول بہت ہی اہم ہوگا۔ انھوں نے نئی نسل کو یہ بھی کہا کہ خود اعتمادی پیدا کیے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں، اس لیے نوجوانوں کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی بہت زیادہ ضرورت



ہے۔ آخر میں اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ ہمارا مقصد وکست بھارت کے ضمن میں جموں وکشمیر کو ایک آئیڈیل مرکز بنانا ہے۔

مذاکرے کے دوسرے پینلسٹ پروفیسر نصیر اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کے ذہن میں یہ چیزیں ہمیشہ رہنی چاہیے کہ انھوں نے کیا کیا، کیا کر رہے ہیں اور انھیں کیا کرنا چاہیے؟ ان سوالات سے جو ذہن پروان چڑھے گا وہ بہت ہی خود اعتماد ہوگا۔ انھوں نے اس پہلو پر بھی زور دیا کہ شاندار مستقبل کے حصول کے لیے پریشانیاں لاحق ہوں گی لیکن ایسے میں ثابت قدم رہنا ہی مستقبل کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ نئی نسل کو بلند خواب دیکھنے اور اس کی تکمیل کے لیے عملی طور پر سرگرم رہنے کے ساتھ چیلنجز کو مواقع کے طور پر لینے کی ضرورت ہے۔

ڈسکشن کے دوران قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش رہی ہے کہ چنار بک فیسٹیول کے مرکز میں نئی نسل ہو، یہی وجہ ہے کہ اس کی بیشتر سرگرمیاں انہی کے مطابق ڈیزائن کی گئی ہیں۔ چونکہ ہندوستان نوجوانوں کا ملک ہے جہاں 65 فیصد سے زائد آبادی 35 برس سے کم عمر کی ہے، ایسے میں مستقبل کا ترقی یافتہ ہندوستان کیسا ہوگا یہ نئی نسل کی سرگرمیوں سے ہی طے پائے گا۔ انھوں نے کتاب کلچر پر روشنی ڈالتے ہوئے کتابوں کے ذریعے شخصیت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مثبت پہلوؤں کا ذکر کیا اور نئی نسل کو کتابوں کے مطالعے سے



اپنی فکر و خیال کو روشن کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

آخر میں انٹریکٹیو سیشن بھی ہوا جس میں نئی نسل کے سامعین نے مہمانوں سے مختلف سوالات کیے جن کا انھوں نے تسلی بخش جواب دیا۔

آٹھواں دن (25 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول کے آٹھویں دن 'ہندوستانی سنیما: اردو اور تہذیبی اقدار کا خزانہ' کے عنوان سے علمی و ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان کے ممتاز فلم ساز، مصور، ثقافتی احیا کے علم بردار اور پدم شری جناب مظفر علی بحیثیت پینلسٹ شریک ہوئے۔ جب کہ اس ڈسکشن کو معروف ڈرامہ نگار، ہدایت کار اور قومی اعزاز یافتہ ادیب پروفیسر دانش اقبال نے موڈریٹ کیا۔ پروفیسر دانش اقبال نے ڈسکشن سے قبل موضوع کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فلموں اور تہذیب کا اردو کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے۔ بولتی فلموں سے قبل خاموش فلموں میں بھی اردو زبان کلیدی رول ادا کر رہی تھی۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کے ساتھ مختلف تہذیبوں اور موضوع کے مختلف اہم نکات اور سوالات کے ذریعے گفتگو کو نہایت بامعنی اور فکر انگیز انداز میں آگے بڑھایا۔ پروفیسر دانش اقبال نے اردو زبان کی تہذیبی اہمیت، ہندوستانی سنیما میں اس کے ارتقائی سفر، ادبی تخلیقات کی فلمی تشکیل اور معاصر فلم سازی میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے تحفظ سے متعلق بھی متعدد اہم استفسار کیے، جن کے جواب میں جناب مظفر علی نے ہندوستانی سنیما میں اردو زبان، تہذیبی روایت، ادبی جمالیات، موسیقی، شاعری اور مشترکہ ثقافتی ورثے کے کردار پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا، ساتھ ہی انھوں نے اپنے فلمی سفر کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ کی تہذیب، ماحول اور شاعری نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اپنی پہلی فلم کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کر رہے عام لوگوں کے کرب اور ان کی آباد ہو رہی نئی دنیا نے مجھے پہلی فلم پر بنانے پر آمادہ کیا، علاوہ ازیں یہ بھی کہا کہ وہ تہذیبی دنیا بھی میرے ذہن میں تھی جو میں لکھنؤ اور علی گڑھ میں چھوڑ آیا تھا۔ اس طرح دونوں مناظر کے تصورات نے میری پہلی فلم کو تیار کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ مزید انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، شائستگی،





حسنِ اظہار اور فکری روایت کی نمائندہ زبان ہے، جس نے ہندوستانی سنیما کی تشکیل اور ارتقا میں گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اپنی کچھ مشہور فلموں گمن، امراؤ جان، انجمن جانثار وغیرہ کے تخلیقی سفر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب، موسیقی، مصوری اور سنیما جب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں تو وہ ایسی ثقافتی دستاویز تخلیق کرتے ہیں جو نسلوں تک اپنی معنویت برقرار رکھتی ہے۔ مظفر علی نے کشمیر کی تہذیب اور اس سے وابستگی کے حوالے سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ تہذیب ایک ایسا بامعنی لفظ ہے جو ہمیں منزل کی کامیابیوں تک پہنچاتا ہے۔ جب تک ہمیں دوسرے کی تہذیب کا احترام اور احساس نہیں ہوگا تب تک تہذیبی قدروں کی حقیقی تصویر نہیں بن سکتی۔ اس موقعے پر نئی نسل کو مشورہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ تہذیب کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں جس سے زندگی کے خوبصورت نقش کا احساس ابھرتا ہے۔ فنون پر گفتگو کرتے ہوئے اس سے مضبوط رشتہ قائم کرنے اور اسے بچوں کو ہر عہد میں سمجھنے اور اپنانے پر زور دیا۔ انھوں نے کشمیر کو ایک گلوبل ایستھیٹک کا حصہ بتایا اور کہا کہ کشمیر کا فن اتنا لازوال ہے کہ اس کی پوری دنیا عاشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی جمالیات کو وسیع پیمانے پر پیش کرنا میری دلی خواہش ہے۔

اس سے قبل قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے جناب مظفر علی اور پروفیسر دانش اقبال کے کارناموں اور ان کی خدمات پر اجمالی گفتگو کی۔ ڈسکشن کے دوران وقتاً فوقتاً جناب مظفر علی سے ہندوستانی سنیما میں اردو کے مستقبل، ادبی تخلیقات کو فلمی قالب میں ڈھالنے کے امکانات، نئی نسل میں تہذیبی شعور کی آبیاری اور ثقافتی ورثے کے تحفظ سے متعلق اہم سوالات کیے جن کے انھوں نے مدلل اور فکرانگیز جوابات دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اردو ادب اور ہندوستانی تہذیب سنیما کی روح ہیں اور ان کے فروغ کے لیے ادبی، ثقافتی اور تعلیمی اداروں کو مشترکہ طور پر کام کرنا چاہیے۔

مذاکرے کے آخر میں موجود ادیبوں، دانشوروں، فلمی شخصیات، طلبا اور ادب دوست سامعین نے مذاکرے میں بھرپور دلچسپی لی اور موضوع کے کچھ اہم پہلوؤں کے تعلق سے سوالات بھی کیے جن کا انھوں نے تسلی بخش جواب دیا۔

نواں دن (26 جولائی 2026)

چنار بک فیسٹیول 2026 کا تیسرا ایڈیشن نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ یہ ایڈیشن کئی معنوں میں اپنی حصولیابیوں کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ اس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل کو کتابوں سے جوڑنا تھا۔ بچوں کی دلچسپی اور ان کے مطالعے کے ذوق کا ہی نتیجہ تھا کہ کئی دن موسم کی خرابی کے باوجود انھوں نے نہ صرف اپنی حاضری درج کرائی بلکہ بک اسٹال تک پہنچ کر کتابوں کی خریداری بھی کی۔ اس کے علاوہ چنار بک فیسٹیول کے ادبی و ثقافتی پروگرام سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ اس لیے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر نوجوان نسل کو کتاب کلچر سے جوڑنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کی جائیں تو معاشرے میں ایک نئی تبدیلی دیکھنے کو ملے گی۔ یہ فیسٹیول ایک ادبی تقریب ہی نہیں بلکہ نالج کے آدان پردان کے ساتھ، تہذیب، مکالمے اور انسانی اقدار کے فروغ کی ایک مؤثر تحریک ثابت ہوا۔ اس کتاب میلے کے مثبت اثرات مستقبل میں بھی کشمیر کی خوبصورت وادی میں برسوں تک یاد رکھے جائیں گے۔

2026 چنار بک فیسٹیول میں ملک بھر سے تقریباً 200 ناشرین، 250 سے زائد بک اسٹالز اور 800 سے زیادہ ادیب، شاعر، فنکار، دانشور اور مفکرین نے شرکت کی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی جانب سے مختلف موضوعات پر 10 ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تقاریب منعقد کی گئیں جن میں کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے تقریباً 50 ماہرین شریک ہوئے اور اپنی قیمتی آرا سے سامعین کو روشناس کرایا۔

چنار بک فیسٹیول 2026 کتابوں کی خریداری کے لحاظ سے بھی بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس بار ملک بھر سے 106 اردو پبلشرز نے شرکت کی۔ مجموعی طور پر 75 لاکھ سے زائد کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ جب کہ دوسرے ایڈیشن 2025 میں 60 پبلشرز شریک ہوئے تھے اور مجموعی خریداری 48 لاکھ روپے کی رہی تھی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ چنار بک فیسٹیول 2026 پہلے دو ایڈیشن کے مقابلے میں زیادہ بہتر، منظم اور کتاب دوستی کے احیا کی جانب ایک مثبت قدم ثابت ہوا ہے اور اس نے کشمیر میں لٹریری ٹورزم کو بڑھاوا دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

■



ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن
ایک استاد اور معمار

سلمان عبدالصمد

’ہر کامیاب انسان کے پیچھے کسی نہ کسی کا ہاتھ ہوتا ہے...‘ یہ جملہ آپ نے یقیناً لاکھوں مرتبہ سنا اور دہرایا ہوگا مگر حقیقی کہانی کچھ یوں بھی بیان کی جاسکتی ہے: ہر کامیاب انسان کے ’سامنے‘ ایک استاذ کھڑا ہوتا ہے جس کی رہنمائی، محنت، قربانی اور مسلسل مشقت کامیاب فرد کی منزل کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ کامیابی، کامیاب انسان اور استاذ... یہ ایک مثلث ہے۔ ظاہر ہے، مثلث میں کسی ایک زاویے کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی لیکن معنوی اعتبار سے اگر کسی کا مقام مقدم ہے تو وہ استاذ کا ہے، کیونکہ وہی منزل سے پہلے راستہ بناتا ہے اور میدانِ کامرانی میں وہی اول، وہی آخر۔

بلاتفریق اقوام وملل استاذ کی عظمت مسلم ہے۔ ماں کے دودھ اور استاذ کے نور کا قرض کبھی نہیں چکایا جاسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا نے اس کی خدمات، علم اور کردار کے اعتراف کے لیے ایک دن مخصوص کرلیا ہے۔ اسی احساس کے تحت 5 اکتوبر کو عالمی یوم اساتذہ منایا جاتا ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر کچھ یوں ہے کہ 5 اکتوبر 1966 کو فرانس کے شہر پیرس میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اساتذہ کی حیثیت و وقعت اور اہمیت وافادیت سے متعلق تاریخی سفارشات منظور کی گئیں۔ اس میں پہلی مرتبہ عالمی سطح پر اساتذہ کے حقوق، پیشہ ورانہ وقار، تربیت، تقرری، مناسب تنخواہ، ملازمت کے تحفظ اور تدریسی آزادی جیسے بنیادی اصول متعین کیے گئے۔ بعدازاں انہی سفارشات کی یاد اور اساتذہ کی عالمی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1994 سے ہر سال 5 اکتوبر کو عالمی یوم اساتذہ منایا جانے لگا، جو آج دنیا کے بیشتر ممالک میں علم، معلم اور تعلیم کے احترام کی ایک مشترکہ علامت بن چکا ہے۔

ہندوستان میں اساتذہ کے احترام کی روایت اور جان نثاری میں شدت کی کہانی اس سے بھی زیادہ منفرد ہے۔ ان سب کے بیان کے لیے طول طویل تاریخی حوالوں کی ضرورت ہوگی، فی الحال جس سے گریز مناسب ہے۔ سامنے کی بات کچھ یوں ہے کہ 5 ستمبر کو قومی یومِ اساتذہ منایا جاتا ہے جو عظیم فلسفی، ماہر تعلیم اور سابق صدر ہند ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے یوم پیدائش سے منسوب ہے۔ روایت کچھ یوں ہے کہ جب ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان کی سالگرہ منانے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے کہا کہ اگر اس دن کو ان کی سالگرہ کے بجائے اساتذہ کے احترام کے دن کے طور پر منایا جائے تو انھیں زیادہ خوشی ہوگی۔ ان کی اسی خواہش کی تکمیل میں ہر سال 5 ستمبر کو پورے ہندوستان میں اساتذہ کی علمی، تعلیمی اور قومی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔[1]

ہم ہندوستانیوں کی خوش نصیبی دوسرے بہت سے ممالک کے باشندوں سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں اساتذہ کے احترام کے لیے صرف ایک دن یعنی 5 اکتوبر مخصوص ہے لیکن ہمارے یہاں 5 ستمبر بھی قومی یومِ اساتذہ کے لیے مختص ہے۔ پھر یہ پہلو بیان کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ دونوں تاریخ کے درمیان فقط ایک ماہ کا دورانیہ ہوتا ہے، کیوں نہ ہم اس دورانیہ کا نام ’’یک ماسہ جشن استاذ‘‘ رکھ دیں، ہندی پکھواڑہ کی طرح۔ یوں ہم نہ صرف ’’یوم اساتذہ‘‘ پر فخر کرسکتے ہیں بلکہ ’’ایامِ اساتذہ‘‘ کے احساس سے بھی سرشار ہوسکتے ہیں۔

ہندو روایت میں ’’رادھا اور کرشن‘‘ گہری محبت بلکہ عقیدت کی ایک علامت ہے۔ اس لیے انھیں گہری وابستگی اور ناقابل بیان شیفتگی کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔[2] شاید اسی وجہ سے عظیم ماہرِ تعلیم ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے نام میں بھی ’’رادھا‘‘ اور ’’کرشن‘‘ کی نسبت موجود ہے۔ فطرت کا کرشمہ دیکھئے اور نام کے اثر کا فیضان سمجھیے کہ ان کے نام سے قوم کے تمام افراد کو گہری وابستگی ہوگئی۔ وہ بھی ایسی وابستگی، جس کے بیان کے لیے کسی نہ کسی نئے جملہ کو تراشنے کی ضرورت آن پڑتی ہے۔ اس لیے معنوی تناظر میں ہم ڈاکٹر کرشنن کو ’’ٹیچروں کا رادھا‘‘ کہہ سکتے ہیں۔ گویا ہم سب کو ان سے ایسی ہی محبت ہے، جیسا کہ کرشن جی کو رادھا سے تھی۔ پھر رادھا کی اس معنویت کو نیا آہنگ دیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ’’اساتذہ، تعلیمی دنیا کے رادھا‘‘ ہوتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے شاگردوں کو اپنے اساتذہ سے ویسی ہی محبت تھی، جیسے رادھا سے کرشن جی یا کرشن جی سے رادھا کو۔ بالفاظ دیگر، ڈاکٹر کرشنن جی ’’ٹیچروں کے رادھا‘‘ اور دیگر اساتذہ ’’تعلیمی دنیا کے رادھا‘‘ کہے جاسکتے ہیں۔ سردست اس کی وضاحت بھی کیے دیتے ہیں کہ یہاں استعمال کی جانے والی علامت میں ’’عقیدے‘‘ یا ’’آستھے‘‘ کا کوئی پہلو شامل نہیں، فقط ادبی تناظر میں رادھا اور کرشن کی شیفتگی سے ’’معنویت‘‘ مستعار لی گئی ہے۔ گویا معنوی اعتبار سے استاذوں کو تعلیمی دنیا کا رادھا کہنا اخلاص، محبت اور بے غرض خدمت کو ایک نیا معنوی پیرہن عطا کرنا ہے۔

اساتذہ کی معنویت کے تناظر میں ہم بچپن میں سنتے تھے کہ ہر فرد کے تین والدین ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی اس سماعت میں اتنی شدت ہوتی تھی کہ ہم اسے حدیث سمجھ بیٹھتے تھے۔ حالانکہ یہ حدیث نہیں ہے۔[3]

مگر اتنی بات ضرور ہے کہ یہ ایک خوب صورت تصور ہے؛ یعنی انسان کے تین والد ہوتے ہیں: پہلا وہ جس کے ذریعے کسی فرد کی پیدائش ہوتی ہے۔ دوسرا وہ جو اسے علم وشعور سے آراستہ کرتا ہے، اور تیسرا وہ جو اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دیتا ہے۔ الغرض استاد کو ہمیشہ ’’والد‘‘ کا درجہ حاصل رہا ہے، کیونکہ وہ صرف تعلیم نہیں دیتا بلکہ انسان کی شخصیت بھی تعمیر کرتا ہے۔ بااعتبار نمبر، استاد دوسرے نمبر ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی حالات نے اس ’’دوسرے باپ‘‘

کی ذمے داری کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا ہے۔

اس کی تفہیم کچھ یوں ہوسکتی ہے۔ایک وقت تھا جب گھر ہی تربیت کی پہلی درسگاہ تھا۔ والدین بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام چست درست تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام میں بزرگوں کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ گویا بچوں کی ذہنی، فکری، اخلاقی، سماجی تربیت میں ان کا خاص حصہ شامل ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی شخصیت سازی میں کلی طور پر شریک ہوتے تھے۔ بچے محبت، شفقت، احترام اور اخلاق کی ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کر کے اسکول پہنچتے تھے، اس لیے استاذ کی بنیادی ذمے داری علم کی آبیاری تھی تاہم آج صورتِ حال مختلف ہے۔ معاشی تقاضوں کی بنیاد پر ہماری زندگی کا روپ ریکھا تبدیل ہوگیا ہے۔ ملازمت پیشہ والدین کی وجہ سے گھر کا نظام بدل گیا ہے۔ پھر مشترکہ خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی) سے کہیں زیادہ انفرادی خاندانی نظام (نیوکلیئر فیملی) کا رجحان عام ہے۔خود ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس پہلو پر اچھی بحث کی ہے۔[4]

پیش نظر تین پہلوؤں کی وجہ سے بچوں کے تربیتی نظام میں خاصا فرق محسوس کیا جارہا ہے۔ اس پس منظر میں تعلیمی اداروں اور خصوصاً اساتذہ کی ذمے داری مزید بڑھ جاتی ہے۔اس طرح اساتذہ نہ صرف بچوں کی تعلیم میں اہم ہوجاتے ہیں بلکہ ان کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی تربیت کا مسئلہ بھی اساتذہ سے جڑ گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ''دوسرے باپ'' کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے، آپ بھی کہہ اٹھیں گے تربیتی نظام کے پس منظر میں اساتذہ یعنی ''دوسرا باپ'' اب دوسرے نہیں بلکہ ''دہرے باپ'' کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ بلاشبہ والدین کی محبت میں آج بھی کمی نہیں آئی، لیکن ان کے پاس وقت کم ہوگیا ہے۔ یہی وہ خاموش خلا ہے جسے پر کرنے کی ذمے داری اساتذہ کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔

''تدریس'' کو ''تقدیس'' سے ملا کر سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ پہلے کے مقابلے اساتذہ کی ذمے داریاں مزید بڑھ گئی ہیں، ساتھ ہی ساتھ پیچیدہ بھی ہوگئیں۔ پہلے بچوں کے سامنے امتحانات ہوتے تھے۔ وہ ششماہی اور سالانہ امتحانات میں شریک ہوتے تھے، اور ان امتحانات کی بنیاد پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ان نتائج سے اساتذہ کے طرز تدریس اور ان کی محنت کا بھی اندازہ لگایا جاتا تھا مگر گردشِ زمانہ نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب صرف بچوں کے امتحانات نہیں ہوتے بلکہ اساتذہ ہر روز امتحان دیتے ہیں۔ یہ امتحان نہ ششماہی ہوتا ہے، نہ سالانہ؛ بلکہ ہر کلاس اور ہر لیکچر ایک نیا امتحان بن کر سامنے آتا ہے۔ پہلے بچوں کے ممتحن اساتذہ ہوتے تھے مگر آج ہر کلاس میں بیٹھا ہر بچہ خود استاذ کا ممتحن ہے۔ وہ صرف استاذ کے علم کو نہیں بلکہ اس کے لہجے، اس کے رویے، اس کی تیاری، اس کے اخلاص اور اس کی شخصیت کو بھی پرکھتا ہے۔

گویا آج تدریس کا سب سے بڑا استعارہ ''لمحاتی امتحان'' ہے، جس طرح دوسرے لفظوں کے معنیاتی نظام میں تبدیلی آئی ہے، اسی طرح ''لمحہ'' کے معنی میں بھی، اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ یہ لمحاتی امتحان، لمحے بھر کا امتحان نہیں ہوتا۔ یہ پل پل جاری رہنے والی وہ آزمائش ہے جس سے ایک کامیاب استاذ کے لیے گزرنا لازمی ہے۔ اس لیے آج وہی استاذ حقیقی معنوں میں کامیاب ہے جو ''لمحاتی امتحان'' کو ''لمحاتی یا وقتی'' نہ سمجھے، بلکہ اسے اپنی دائمی ذمہ داری اور مسلسل خود احتسابی سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرے۔ پھر یہ امتحان غیر مرئی ہوتا ہے، اس کے سوالات بھی مبہم ہوتے ہیں، اس لیے اس میں کامیابی کوئی آسان نہیں۔ اس کے علاوہ ایسے امتحانات میں کامیاب ہونے کی فکر فقط ان اساتذہ کو ہی ہوسکتی ہے جو واقعی ''تدریس'' کو بہ نظر ''تقدیس'' دیکھتے ہیں۔ ورنہ تو اقتصادی عینک میں ''محسوسات'' کو ماپنے کی سکت کہاں!

تدریس کے متعلق آج عام بیانیہ یہ ہے کہ وہ بہت آسان ہوگئی ہے مگر راقم کا خیال ہے کہ رفتہ رفتہ تدریس کا سفر یا عملِ تدریس مزید پیچیدگی سے دوچار ہوتا جارہا ہے۔ اس پیچیدگی کا صحیح احساس شاید اسی استاذ کو ہوسکتا ہے جس کے نزدیک تدریس واقعی تدریس ہے۔ نصابی تکمیل کی روایت سے مربوط یا ملازمت کے احساس سے سرشار استاذہ کو اس کا قطعاً احساس نہیں ہوگا۔ بلاشبہ آج ہمارے پاس جدید ٹیکنالوجی سے لیس ادارے ہیں، مصنوعی ذہانت کا ساتھ ہے، ڈیجیٹل لائبریریاں ہیں، اسمارٹ کلاس روم ہیں، پیش کش کے نت نئے آلات ہیں؛ ان تمام ذرائع نے معلومات تک رسائی کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آج استاذ کے پاس پہلے سے کہیں زیادہ سہولتیں موجود ہیں۔ بلاشبہ وسائل نے معلومات تک پہنچنے کا راستہ ضرور آسان کر دیا ہے، مگر تدریس کو آسان نہیں بنا سکا۔ آج کا طالب علم معلومات کی کمی کا شکار نہیں بلکہ معلومات کے ہجوم میں کھڑا ہے۔ اسے صرف جواب نہیں چاہیے، بلکہ ممکنہ معتبر جواب چاہیے، کیونکہ طالب علم کے ذہن میں جو سوال پیدا ہورہا ہے، اس کا جواب وہ سکنڈوں میں حاصل کر لیتا ہے مگر حصولِ جواب ہی سب کچھ نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ حصولِ جواب سے ذہن میں تشکیک کی کیفیت پیدا ہورہی ہے۔ یہ تشکیک ایک طرح سے مناسب ضرور ہے، مگر اس کا علاج بھی لازماً چاہیے، ظاہر ہے کہ اس کا علاج آرٹیفیشل یعنی مصنوعی آلات میں شاید نہیں۔ گویا آج کا سوال برائے علم سے بڑھ کر برائے تشکیک ہوگیا ہے۔ گویا اس چیلنجز سے نبرد آزمائی بھی آج استاذ کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے آج تدریس پہلے سے زیادہ فکری، نفسیاتی اور اخلاقی ذمہ داری بن چکی ہے۔

زمانہ قریب میں ہی ماہر استاذ کے تعارف میں ''چلتی پھرتی ڈکشنری'' کا فقرہ استعمال کیا جاتا تھا۔ بلاشبہ حقیقی اور مجازی معنی میں ڈکشنری معلومات کا سب سے معتبر ذریعہ ہوتی ہے۔ طالب علم کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا تھا تو وہ سیدھا ایسے استاذ کے پاس جاتا تھا، جس کو ڈکشنری کہا جاتا تھا۔ لیکن وقت نے یہ منظر بدل دیا ہے۔ آج ہر طالب علم کی ہتھیلی پر ایک ایسی چلتی پھرتی لائبریری موجود ہے، جہاں چند لمحوں میں ہزاروں کتابیں، لاکھوں مضامین اور دنیا بھر کی معلومات تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر استاذ آج بھی اپنی شناخت صرف معلومات کے ذخیرے تک محدود رکھے گا تو وہ اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گا۔ آج کے استاذ کو محض معلومات کا امین نہیں، بلکہ ''شعور کا جادوگر اور لاشعور کا انجینئر'' بننا ہوگا جو معلومات کو فہم میں، فہم کو بصیرت میں اور بصیرت کو عمل میں تبدیل کر سکے۔

حوالے:

1. مولانا قمر الزماں ندوی، ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن، مشمولہ: سیل رواں ڈاٹ کام، ستمبر 2022
2. شری رادھا کرشنا وہار پنچ پرکاشن ست گھرا متھرا، 2025، ص128
3. عثمانی دارالافتا، آدمی کے تین باپ ہوتے ہیں حدیث کی تحقیق، مشمولہ ستمبر 2021
4. ایس رادھا کرشنن، کلکی یا تمدن انسانی کا مستقبل، مترجمہ: سید احتشام حسین، این بی ٹی دہلی، 1961، ص9

Salman Abdus Samad
Head, Department of Urdu
Khwaja Bandanawaz University
BI BI Raza P.G. Campus
Kalaburagi-585104
Mob.9810318692
Email: salmansamadsalman@gmail.com



اساسِ ثلاثہ

فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ کالج

ابوبکر عباد

تصنیف و تالیف کی اصطلاح میں انیسویں صدی کو نئے علوم کی ایک مبسوط کتاب سے تعبیر کیا جائے تو فورٹ ولیم کالج اس کتاب کا مقدمہ قرار پائے گا، دہلی کالج اصل کتاب اور علی گڑھ تحریک اس کا ضمیمہ۔ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ان دونوں کا ذکر یوں ضروری ہے، کہ کسی حد تک یہ ایک دوسرے سے منسلک اور کافی حد تک ایک دوسرے کی توسیع ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تحریکیں جو تعلیمی اداروں کے قیام کے بطور شروع ہوئیں تھیں، ان میں سیاسی مصلحت یا تعلیمی ضرورت تو بالکل سطح پر نمایاں تھی لیکن انگریزی حکومت کے استحکام کا مشن رگوں میں خون کی مانند رواں اور پوشیدہ تھا۔ اس کا ثبوت ہے فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی کتابوں کے دیباچے، دہلی کالج کے بعض اساتذہ کی تصانیف اور ان کے خیالات اور سرسید کا زبان کے ذریعے سماجی فلاح و ترقی کا تصور۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو یا دیسی زبانوں کی ترویج و ترقی، یا اہل وطن کی علمی بہبود اور ان کے ادب کو پُر ثروت بنانے کے لیے نہیں بلکہ غیر ملکی حاکموں کو اشارے کنایوں کی زبان سے بچانے اور ملکی رعایا کی بات چیت اور ان کے بود و باش سے واقف کرانے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ مگر اس کالج کے قیام کے دوران غیر ارادی طور پر دو باتیں ایسی پیش آئیں جو کالج کے بنیادی مقاصد اور انگریزوں کی منشا سے کسی طور مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کالج کی وجہ سے اردو کا جمود ٹوٹا، زبان کو فروغ ملا اور تخلیقی نثر یا ادب کی راہ ہموار ہوئی۔ دوسری یہ کہ فورٹ ولیم کالج کے طلبہ اور اس کے ملازمین مشرقی علوم کی طرف راغب ہوئے، ان کے حصول پر توجہ دینے لگے اور ان سے متاثر بھی ہوئے۔ سی، ای، ٹریولیان کی کتاب ''باشندگان ہند کی تعلیم'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''لارڈ ویزلی کے کالج واقع فورٹ ولیم کے اثر سے جو کمپنی کے محرروں کی تعلیم کے لیے قائم ہوا تھا، سول سروس کے ارکان کے نزدیک واحد معیارِ لیاقت مشرقی علوم کا جاننا قرار پا گیا تھا''۔

(بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید، ص 273)

ظاہر ہے یہ حیرت انگیز انکشاف کہ نوجوان انگریزوں نے مشرقی علوم میں شدت سے دلچسپی لینی شروع کر دی ہے، اور یوں کمپنی کے مفاد پر مشرقی علوم کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اہل اقتدار کی سخت مایوسی کا سبب بنا۔ جب کہ جی۔ اینڈرسن کے مطابق ''عیسائی مبلغین ملک کو انگریزی زبان اور مغربی علوم سے واقف کرانے میں مصروف تھے''۔ ان مبلغین کی کوششوں کے حوالے سے نوجوان مبلغ الیگزنڈر ڈف (Alexander Duff) اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ''انگریزی زبان کو موثر آلے کے طور پر استعمال کرنے اور تھوڑی سی تربیت کے نتیجے میں ہندوستان کے نوجوان بہت جلد عیسائیت کی آغوش میں آجائیں گے۔''

(Shan Muhammad, Sir Syed Ahmad Khan, P13, Lahore, 1976)

امیدوں کی شکست کی اس صورت حال میں تجارت کے وسیلے سے ملک، اور ملک کے بعد یہاں کے مذاہب پر فتح پانے کا خواب دیکھنے والی قوم یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ ان کے نوجوانوں کو محکوم کی زبان سکھا کر حاکموں کی خو بو سے آشنا اور ان کے اندر احساس تفاخر پیدا کرنے والا ادارہ ہی انھیں محکوموں کے علوم کا گرویدہ بنائے۔ نتیجتاً متعصب انگریز سیاستدانوں نے فورٹ ولیم کالج کی سخت مخالفت کی اور بالآخر یہ ادارہ زبان و ادب کے ایک دور کو متحرک اور متاثر کرنے کے بعد مختلف بہانوں کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک پر قابض ہونے کے روزِ اول سے ہی دو مقصدوں کو بنیادی اہمیت دی تھی۔ پہلا: منفعت بخش حکمرانی کے لیے ہندوستانی معاشرے اور زبان کی تفہیم — جسے فورٹ ولیم کالج نے کافی حد تک پورا کر دیا تھا اور دوسرا مقصد ہندوستانی رعایا کو انگریزی حکومت کا ہمنوا بنانے کے لیے مغربی علوم کا تعارف اور انگریزی زبان اور تہذیب کی ترویج و اشاعت۔ سو اس مقصد کی تکمیل کے لیے برطانوی سرکار کو ایک نئی تحریک اور نئے ادارے کی ضرورت پیش آئی، جو 1825 میں دہلی کالج کے قیام کی صورت میں پوری ہوئی۔ مغربی علوم کی اشاعت کا یہ ادارہ 1793 سے چلنے والے مدرسے غازی الدین حیدر کی اس عمارت میں قائم کیا گیا جس میں حفظ قران کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کے آغاز کے تین سال بعد سر چارلس مٹکاف کی تجویز پر اس میں ایک انگریزی کا شعبہ بھی الگ سے قائم کر دیا گیا، جو غالباً ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا پہلا باضابطہ شعبہ تھا، جسے ہندو مسلم علما شک اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے، اور بعض محبین وطن اسے عیسائیت کی تبلیغ کے قانونی طریقۂ کار اور سرکاری ادارے سے تعبیر کرتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے برعکس دہلی کالج کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبانیں سکھانا نہیں، بلکہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم سے بہرہ مند کرنا تھا۔ سو یہاں فورٹ ولیم کالج کی طرح خیالی طوطا مینا اڑانے اور دیو پریوں کے قصے سنانے والی کتابوں کی اشاعت کے بجائے حقیقی اور کارآمد فنون کی تصنیف کو بنیادی حیثیت حاصل ہوئی، اور داستانوں اور ڈراموں کی تدریس کے مقابلے میں ریاضی اور دوسرے سائنسی علوم کی تحصیل کو کلیدی حیثیت دی گئی۔ چنانچہ یہاں مغربی، بالخصوص سائنسی علوم کو رائج کرنے اور انھیں مقبول عام بنانے کے لیے دیسی زبان کو بطور میڈیم اختیار کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے 1833 میں دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا، جس کے تحت سائنسی علوم مثلاً ریاضی، کیمیا، طبیعیات، نباتیات، مقناطیس، جراحی، حرکیات وسکونیات، طب، حرارت اور علم برق وغیرہ کی متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ ہندوستان میں سائنسی علوم کے ترجمے اور اس کی اشاعت کے حوالے سے اتنے وسیع پیمانے پر یہ پہلی، باضابطہ، کارآمد اور کامیاب کوشش تھی۔ اس سوسائٹی نے سائنسی علوم کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی بھی متعدد کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں۔ جن میں تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، فلسفہ، معاشیات، مذہبیات اور ادبیات وغیرہ شامل ہیں۔

ظاہر ہے ان تراجم کے ذریعے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سی اصطلاحوں اور نئے لفظوں کی شمولیت نے نہ صرف اردو زبان کی بے بضاعتی، کم مائیگی اور علمی غرابت کو دور کیا، بلکہ اسے تعلیمی، سائنسی اور پیشہ ورانہ زبان کے اس مقام تک پہنچایا جس میں کسی بھی نوع کے مضامین کو ادا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں سائنسی مضامین کو اردو کے ذریعے پڑھانے کا جو کامیاب تجربہ کیا گیا اس کا سہرا بھی ایک طرح سے دہلی کالج کو جاتا ہے، کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کی ہی اقتدا کی تھی۔

دہلی کالج محض تعلیمی نصاب کی تیاری، کتابوں کی تالیف وترجمے کے کام اور درس وتدریس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کا دائرہ کار زندگی کے مختلف شعبوں اور علوم کی نشر واشاعت کے متعدد پہلوؤں کو محیط تھا۔ کالج کے اساتذہ اور ان کی تصانیف کے علاوہ کالج کا رسالہ ''قران السعدین'' بھی اس مہم میں شامل تھا۔ اس رسالے میں معاشرتی مسائل، سائنسی علوم اور ادب وحکمت کے موضوعات پر آزادی کے ساتھ بحث ونظر کا سلسلہ جاری تھا، اور دوسرے رسائل اس کی اتباع کرنے لگے تھے۔ اسی کالج کے ہر دلعزیز استاذ ماسٹر رام چندر کے دو رسالے ''رسالہ فوائد الناظرین'' اور ''خیر خواہ ہند'' (جسے بعد میں ''محبِّ وطن'' کا نام دیا گیا) بھی علمی موضوعات پر سائنسی انداز میں مضامین لکھنے کی فضا تیار کررہے تھے۔ ان رسائل میں طبیعیات، ہیئت اور

> **ہندوستان میں سائنسی علوم کے ترجمے اور اس کی اشاعت کے حوالے سے اتنے وسیع پیمانے پر یہ پہلی، باضابطہ، کارآمد اور کامیاب کوشش تھی۔ اس سوسائٹی نے سائنسی علوم کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی بھی متعدد کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں۔ جن میں تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، فلسفہ، معاشیات، مذہبیات اور ادبیات وغیرہ شامل ہیں۔**

اخلاقیات کے موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے، اور مختلف مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے اور سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کہنا چاہیے کہ ان رسائل نے اردو نثر کو سائنسی صداقت اور عقلیت پسندی کی تحریک سے روشناس اور ادبی صحافت کو سائنسی طرز استدلال سے متعارف کرایا۔ اس کالج کے دو اساتذہ ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ نے تو باضابطہ سائنسی علوم پر کتابیں تحریر کیں۔ ان کے علاوہ منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد نے علم کے دوسرے شعبوں مثلاً تاریخ، تنقید، غیر افسانوی ادب اور فکشن میں سائنسی طریقۂ کار کو اپنایا اور عقلیت پسندی کی طرح ڈالی۔

دہلی کالج نے طلبہ کی تعلیمی صلاحیت کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت سازی میں بھی اہم کردار نبھایا۔ یہاں کے ماحول نے طلبہ میں جس طور آزادیِ رائے کے اظہار کا حوصلہ پیدا کیا، اسی طرح اعتراضات اور اختلافات کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے انداز بھی سکھائے۔ انھیں اجتہادی بصیرت سے آشنا کیا، اور حالات کے رخ کو سمجھنے کی فہم بخشی۔ اس جگہ ڈپٹی نذیر احمد کا، کالج سے بننے والی اپنی شخصیت کا یہ اعتراف دلچسپ اور برمحل ہوگا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''اگر میں (دہلی) کالج میں نہ پڑھا ہوتا، تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا، **صم بکم عمی فھم لا یعقلون، ماصابنی من حسنة فی الدین او فی الدنیا فمن الکالج**''. (بحوالہ مرحوم دہلی کالج۔ص183)

دہلی کالج کی حیثیت محض تعلیمی ادارے کی نہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرنے والی ایک پُر قوت فکری تحریک کی تھی۔ جس نے قدامت اور توہمات کی تاریکی کو جدید سائنسی علوم کی روشنی سے منور کیا، عقلیت پسندی کو عام کیا، آزادیِ رائے کو فروغ دیا، رواداری، برداشت اور ٹالریشن کا سبق سکھایا اور اسکالرس اور دانشوروں کی ایک پوری کھیپ تیار کرکے ملک میں نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کی۔

یہ کالج ابھی اپنے عروج کی منزل میں داخل ہی ہوا تھا کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی قیامت صغریٰ بن کر نازل ہوئی۔ اس ہنگامے میں کالج کے ساتھ بھی وہی سب کچھ پیش آیا جو دہلی کے مکینوں، ان کے مکانوں اور مال واسباب کے ساتھ پیش آیا۔ لائبریری لوٹ لی گئی، سائنس کی تجربہ گاہ برباد کردی گئی، عمارت پر کسی اور کا قبضہ ہوگیا اور اس کے کئی اساتذہ قتل کردیے گئے۔

لیکن فکر کبھی مرتی نہیں، تحریک زندہ رہتی ہے، ثمر آور درخت کا بیج ضائع نہیں ہوتا۔ دہلی کالج کے دو پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر کارگل کے ہم خیال، اور کالج کے دو اساتذہ مولوی مملوک علی اور امام بخش صہبائی کی صحبت کے فیض یافتہ سرسید احمد خاں نے یہ عزم مصمم کیا کہ وہ اس اثاثے کو کسی طور برباد ہونے سے بچائیں گے، سو انھوں نے دہلی کالج کی علمی، ادبی اور سائنسی امانت کو روحانیت کے اضافے کے ساتھ

بحفاظت ملک وقوم کے سپرد کیا اور 1863 میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ چونکہ سرسید کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ حکومت برطانیہ کے زیر تسلط مسلم معاشرے کی بہتری کی تدبیریں کی جائیں۔ سرسید ٹیپو سلطان اور سید احمد بریلوی کی ناکامی دیکھ چکے تھے اور کسی حد تک اس کے اسباب کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ چنانچہ سرسید نے اس حوالے سے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا جو خاکہ ترتیب دیا وہ اس طرح تھا:

1 مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو مذہبی اور سیاسی اختلافات ہیں انھیں دور کر کے مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے تاکہ دونوں قوموں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا ہوسکیں۔

2 مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول کی جانب راغب کیا جائے تاکہ وہ انتظامی امور میں انگریزوں کے شریک کار بن سکیں۔

3 انگریزی کے ساتھ اردو کو ایک معاون زبان کا درجہ دیا جائے اور اس کے لیے جدید علوم اور سائنس کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔

لہٰذا سرسید نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انگریزی سے اردو میں تقریباً 40 کتابیں ترجمہ کروائی گئیں جن میں تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات کو دوسرے مضامین پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن دستیاب کتابوں کی تعداد محض پندرہ ہے۔ سوسائٹی کی کمیٹی میں جن کتابوں کو اردو زبان میں ڈھالنے کی فہرست بنائی گئی تھی ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: رسالہ بھاپ کے کلوں کے بیان میں، رسالہ جیالوجی، رسالہ علم جغرافیہ، رسالہ علم فلاحت (یعنی جدید کاشتکاری) رسالہ علم طبیعات، رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی، رسالہ در باب سڑک و ریل، رسالہ علم برقی، رسالہ در باب استعمال بجلی، رسالہ علم مدن اور رسالہ حقوق انسانی وغیرہ۔ اس سوسائٹی نے صرف سائنسی اور سماجی علوم کے اردو ترجمے ہی نہیں کروائے بلکہ سرسید نے یورپ سے چند سائنسدانوں کو بلوایا اور سائنسی آلات بھی منگوائے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان میں سوڈا واٹر کی بوتل اور روئی دھننے کی مشین کا استعمال اور فوٹو گرافی کا کام سب سے پہلے اسی سوسائٹی نے شروع کیا اور یہ بھی کہ زراعت کے جدید آلات کے استعمال اور عملی زراعت کی ٹریننگ کے لیے علی گڑھ میں ایک خطہ ارض بھی مخصوص کیا گیا تھا۔

اعتراف کرنا چاہیے اردو میں علمی کتابوں کی تصنیف وتراجم کے اداروں میں فورٹ ولیم کالج کو اہمیت نہ سہی اولیت ضرور حاصل ہے۔ یوں کہ یہاں ترجمے کے نام پر بس چند لغات کی تدوین اور کچھ کہانیوں اور ڈراموں کے ترجمے کیے گئے اور ایک آدھ تاریخ کی کتاب۔ یہ تمام ترجمے عربی، فارسی اور سنسکرت سے کیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں کسی بھی

فورٹ ولیم کالج ، دھلی کالج ، دارالترجمہ حیدرآباد اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی برکت سے ہی آج دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی، این، سی، ای، آر، ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا، ساھتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ اور بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دھلی، انجمن ترقی اردو ہند وغیرہ جیسے اداریے وجود میں آئے۔

انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا، بلکہ یہ کہیے کہ یہاں سوائے قصہ کہانیوں کے کسی بھی علمی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا گیا تو غلط نہ ہوگا۔ جب کہ اسی عہد میں اودھ کے نوابین نے بھی سماجی اور سائنسی علوم کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ انگریز مورخوں نے ان کے کارناموں کو پوشیدہ رکھنے اور انھیں (بطور خاص واجد علی شاہ کو) بدنام کرنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ بقول گارساں دتاسی:

''واجد علی شاہ اور ان کی حکومت کو بدنام کر کے اودھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے ناپاک مقصد سے انگریزوں اور ان کے ضمیر فروش ہندوستانی پٹھوؤں نے پروپیگنڈہ کر کے وہ مہم چلائی کہ واجد علی شاہ کا نام عیش کوشی اور نفس پرستی کا مترادف بن گیا۔ کون تصور کرسکتا ہے کہ اس بدنام بادشاہ کو اپنی ہوسنا کیوں اور عشق بازیوں سے کتابیں لکھنے کی فرصت ملی ہوگی۔ پھر کتابیں بھی دو چار نہیں، دس بارہ نہیں، سو سے زیادہ۔''

(خطبات گارساں دتاسی، خطبہ ہفتم، بحوالہ اردو میں سائنسی وتکنیکی ادب، ڈاکٹر محمد شکیل خاں، دہلی، 1988، ص 70)

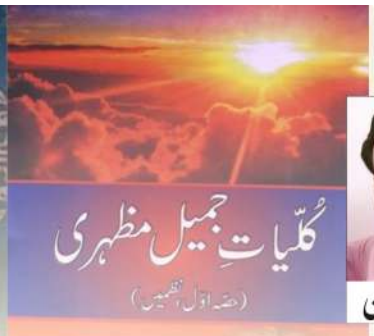
یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ سائنسی اور سماجی علوم کو اردو کی کتابی شکل میں لانے کا فریضہ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی سے بھی زیادہ منظم، منضبط اور موثر طریقے سے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ادا کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے ایک برس پہلے دارالترجمہ (1917) کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ یہاں کے اولین مترجمین میں قاضی تلمذ حسین، چودھری برکت علی، نظم طباطبائی، مولوی عبدالحلیم شرر مرزا محمد ہادی رسو کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانوں سے تراجم کیے۔ ادارے کے پہلے ناظم بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ چونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا اس لیے یہاں سے آرٹس، سائنس، سوشل سائنسز، انجینئرنگ اور میڈیسن وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق 395 اور بعض کے مطابق تقریباً 500 کتابیں شائع کی گئیں، جن میں سائنسی اور سماجی علوم پر خاص طور سے توجہ مرکوز رکھی گئی۔

حاصل کلام کے طور پر یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دارالترجمہ حیدرآباد اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی برکت سے ہی آج دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، این، سی، ای، آر، ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا، ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ اور بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند وغیرہ جیسے ادارے وجود میں آئے۔ تسلیم یہ بھی کرنا چاہیے کہ یہ سب وہ ادارے ہیں جن کے تصوراتی بنیاد کا سہرا فورٹ ولیم کالج کو جاتا ہے، اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ان اداروں کی وجہ سے ہندوستان کی ظاہری حالت اور ہندوستانیوں کی ذہنی کیفیت میں اہم تبدیلی رونما ہوئی، کہ اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو اردو میں وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے بجائے راسخ العقیدگی اور تنگ نظری کا بول بالا ہوتا، اور تسخیر کائنات کے علوم وفنون کی جگہ مکتبی علم اور قدیم نصابی تعلیم کی تنگنائے شاید ہمارا مقدر ہوتی۔

Abu Bakar Abbad
Department of Urdu
University of Delhi-110007
Mob. 9810532735
E-mail: bakarabbad@yahoo.co.in









خان محمد رضوان

علامہ جمیل مظہری کی فکری جہات

بہار روزِ اول سے شعروادب اور علم وآگہی کا مرکز شمار کیا جاتا رہا ہے۔ بہار کا تہذیبی، ثقافتی اور علمی منظرنامہ ملک کے دیگر صوبوں سے قدرے مختلف رہا ہے کہ بارہویں صدی کے آغاز سے ہی صوبہ بہار میں تواتر کے ساتھ مسلم حکومتیں رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کی تہذیب، زبان اور ادب پر مسلم معاشرت کے اثرات مرتب ہوئے۔ سرزمین بہار اس طور پر بھی علمی، ادبی اور روحانی سرمایے سے مالا مال ہوئی۔ کیونکہ عہدِ وسطیٰ میں صوفیائے عرب وعجم بڑی تعداد میں دہلی ہوتے ہوئے بہار آئے۔ ان کے فیض سے وہ روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور ادبی خلا پر ہوا، جو صدیوں سے پاٹلی پترا کی تباہی کے بعد یکسر خالی چلا آرہا تھا۔

گیارہویں صدی ہجری کے اواخر اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل کا زمانہ صوبہ بہار میں اردو شاعری کے ارتقا کا ایک اہم، نمایاں اور قابل توجہ دور تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں شعری میلانات اور ادبی رجحانات نے ایک نئے شعور کے ساتھ ابھرنا شروع کیا۔ بارہویں صدی ہجری کے اوائل ہی سے بہار کے مختلف علاقوں میں مسلم اقتدار کے قیام کے باعث یہاں کی سماجی و ثقافتی فضا اسلامی تہذیب سے گہرے طور پر متاثر ہوئی۔ یہی تہذیبی وتمدنی پس منظر اردو زبان کے فروغ اور شعری روایت کے استحکام کا اہم محرک ثابت ہوا۔ چنانچہ اسی عرصے میں بہار کے مختلف مراکز سے اردو شاعری کی نئی لہریں اٹھیں جنھوں نے بعد کے عہد میں اس خطے کی ادبی شناخت کی بنیاد رکھی۔

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ بہار کا ادبی منظرنامہ عہد بہ عہد روشن وتابناک تر ہوتا گیا، اور شعروادب کی دنیا میں بہت سی نابغہ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہاں ہر صنف میں تاریخ ساز شعرا وادبا پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف بہار میں بلکہ دنیا بھر میں صوبے کا نام روشن کیا ہے۔ ان شخصیتوں میں بیدل عظیم آبادی، حسرت عظیم آبادی، فضل حق عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، اختر قادری، صفیر بلگرامی، مسلم عظیم آبادی، علامہ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پرویز شاہدی، اختر اورینوی، رضا نقوی واہی، عطا کاکوی، محسن دربھنگوی، سید ضیاء الدین فضا، صابر براری، یوسف خورشیدی، یوسف چھلواروی، قتیل داناپوری، بسمل سنسہاروی، سریر کابری، (بلبل بہار) رمز عظیم آبادی، کیف عظیم آبادی، شفیق عمادوی، ثمر ٹکاروی، شجر ٹکاروی، فرحت قادری، اشراق حمزہ پوری، رضا دائروی، نادم بلخی، تمنا تمادی، عرش گیاوی، قسیم الحق گیاوی، ناصر حسین زیدی، افسر ماہ پوری، شبنم کمالی، کلیم عاجز، مظہر امام، لطف الرحمٰن، اویس احمد دوراں، شاداں فاروقی، جمیل پہاڑپوری، حسرت بہاری، نیر زیدی، اختر ماہ پوری اور مجاز نوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس طور پر اگر ہم صرف بہار کے شعرا کی فہرست سازی کریں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ گزرے ہوئے شعرا کی طرح اگر ہم ان کے بعد کے شعرا کی فہرست تیار کریں تب بھی کئی صفحات کی ضرورت پیش آئے گی، ناوک حمزہ پوری، طلحہ رضوی برق، علیم اللہ حالی، سلطان اختر، صدیق مجیبی، شکیب ایاز، برسہیل تذکرہ عبدالمنان طرزی، شان الرحمٰن، کوثر مظہری، غضنفر اور خلیق الزماں نصرت کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قاضی عبدالودود اپنی کتاب 'شعرا کے تذکرے' میں لکھتے ہیں کہ:

''صوبہ بہار کی تین نئی ہند آریائی علاقائی بولیاں حسب ذیل ہیں، بھوجپوری، مگہی اور میتھلی۔ ان سب بولیوں میں ''ریختہ'' کی شکلیں پیدا ہوئیں۔ مگر پٹنہ (عظیم آباد) کی مرکزیت کی وجہ سے ''مگہی ریختہ'' کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بہار میں یہی ریختہ اردو کی بنیادی زمین بنی۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ نالندہ وکرم شیلا اور پاٹلی پترا کا علاقہ تہذیب وتمدن کا گہوارا تھا۔''[1]

یہی سچ بھی ہے کہ پٹنہ بہار کا وہ اہم شہر ہے جس نے ایشیائی تہذیب کے مرکز کی حیثیت سے نہ صرف پورے بہار کو بلکہ دنیائے شعروادب کو تہذیب وتمدن کے چراغ سے منور کیا ہے۔ یوں تو بہار کے بعض ادبا دنیائے ادب میں اپنی غیر معمولی اہمیت کے سبب ناقابل فراموش شمار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نقد وتنقید میں بالخصوص امداد امام اثر، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، سید سلیمان ندوی، اختر اورینوی، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، اختر قادری، قمر اعظم ہاشمی، ابوالکلام قاسمی، لطف الرحمٰن، علیم اللہ حالی، عبدالقوی دسنوی اور شکیل الرحمٰن وغیرہ اہم ہیں۔ تو وہیں اردو فکشن میں سہیل عظیم آبادی، انجم مانپوری، شکیلہ اختر، سید محمد محسن، سید محمد حسنین، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، منظر کاظمی، عبدالصمد، حسین الحق، انیس رفیع، شوکت حیات، قمر جہاں، ذکیہ مشہدی، شفیع مشہدی، شموئل احمد، غضنفر اور مشرف عالم ذوقی۔

علامہ جمیل مظہری ہماری اردو شعری روایت کے ان اہم اور غیر معمولی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو فکری، فنی اور معنوی سطح پر ایک نیا زاویہ عطا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں ان کے مقام و مرتبے کے اعتبار سے وہ پہچان اور قبولیت عام حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ جمیل مظہری کا شعری سرمایہ اپنی کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے نہایت وقیع ہے۔ اگر ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک گہری فکری بصیرت، بلند شعور اور مضبوط فنی بنیادوں کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت کی سنجیدگی اور جدید احساس کی تازگی ساتھ ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

جمیل مظہری کی شاعری میں جو فکری تنوع، تہذیبی شعور اور انسانی کرب کی ترجمانی ملتی ہے، وہ انھیں اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ ان کے یہاں محبت، غم دوراں، انسان دوستی، اخلاقی تطہیر اور روحانی بالیدگی جیسے موضوعات غیر معمولی وسعت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی شاعری میں جمالیات اور معنویت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان پر ایک حد تک تحقیقی اور تنقیدی کام بھی ہوا ہے، تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کے تناسب سے اس کام کی وسعت اب تک محدود رہی ہے۔ اردو ادب میں جمیل مظہری کی حیثیت کا منصفانہ تعین ابھی باقی ہے۔ اجتماعی سطح پر ان کی شعری، فکری اور ادبی خدمات کے سنجیدہ جائزہ کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے، لیکن اس تک کوئی اہم پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔

انسانی زندگی پر سماجی اور گھریلو ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ بلکہ انسان کی شخصیت کی تعمیر میں صحبت کا اثر ہی غالب رہتا ہے۔ جمیل مظہری بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھے جنھیں دنیائے شعور میں قدم رکھتے ہی اچھی صحبت ملی۔ اول تو یہ کہ ان کے والد مولانا خورشید حسنین جو کہ اردو، فارسی، عربی زبان و ادب اور ماہر عروض تھے کی صحبت نے انھیں فکری اور فنی طور پر توانائی بخشی، جس کی وجہ سے وہ اردو شاعری کا تناور درخت ثابت ہوئے۔ سید کاظم علی متخلص بہ جمیل مظہری نے 1904 میں مغلپورہ، پٹنہ میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم ضلع اسکول موتیہاری اور بعد ازاں مظفر پور سے حاصل کی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں کچھ دنوں زیر تعلیم رہے مگر جلد ہی سینٹ زیویرس اور اسلامیہ کالج کلکتہ کا رخ کیا جہاں سے انھوں نے بی اے کی تعلیم مکمل کی اور ایم اے (فارسی) کی ڈگری 1931 میں کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ یہی وہ خوش نصیبی کا زمانہ تھا جب قیام کلکتہ میں جمیل مظہری کو آزر لکھنوی، حضرت وحشت کلکتوی، آغا حشر کاشمیری، حضرت ناطق اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے شعر و ادب و زبان کے آفتاب و ماہتاب کی صحبت نصیب ہوئی، جس نے سید کاظم علی کو نہ صرف جمیل مظہری بنایا بلکہ علامہ جمیل مظہری کے نام سے شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔

علامہ جمیل مظہری نے اپنے ذریعہ معاشی کا آغاز اخبار و رسائل سے شروع کیا۔ بہار کے محکمہ نشر و اشاعت میں پبلسٹی افسر (اردو) کے عہدے پر تقرر ہوا اور اس کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر پبلسٹی اور فلم سکشن کے انچارج بھی ہوئے، پھر پٹنہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر اور 1960 میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں 1965 میں یو جی سی فیلو ہوئے۔ آخر کار 23 جولائی 1980 کو سرزمین بہار کا گوہر نایاب جو عظیم صلاحیتوں کا مالک تھا جس کی ذہانت بے پناہ تھی وہ دنیائے فانی کو الوداع کہہ گیا۔ ایسے میں علامہ اقبال کے معروف شعر سے دعا کرنی چاہیے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ جمیل مظہری کو جب ہم فکر و فن کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمیں ہر اعتبار سے عظیم نظر آتے ہیں۔ وہ ماہرِ فن، روشن خیال اور پختہ فکر اور دین دار شخصیت کے حامل تھے، جس طرح وہ اپنی بلند فکر اور متنوع خیال اور قوتِ ارادی کے تعلق سے بہت مضبوط اور اپنی فکر کے کج کلاہ انسان تھے، اسی طرح وہ فن شعر و ادب میں یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ عروض میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ فکری اعتبار سے تشکیک سے متاثر تھے کیونکہ ان کا خود کا فرمایا ہوا ہے:

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر میں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبیؐ کا

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں:

ہمارا تو کوئی سہارا نہیں
خدا ہے تو لیکن ہمارا نہیں

اس سے ان کے باطن کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے اور ان کے تشکیکی رویے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی مضطرب روح اور داخلی بے چینی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح ادب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اسی طرح فکر اور نظریے کا بھی کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہاں فکر مذہبی اور نظریہ مذہبی ضرور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ کس کی کیا فکر ہے اور کون کس نظریے کا علم بردار ہے، بلکہ یہ بات اہم ہے کہ کس کا ادب کیا ہے اور اس کا معیار کیا ہے۔ بایں طور اس قیل و قال میں پڑے بغیر کہ علامہ جمیل مظہری کس فکر اور مذہب کے تھے؟ یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ کس درجے کے شاعر اور ادیب تھے، انھوں نے ادب کی ثروت مندی میں کیا اضافہ کیا ہے، علامہ جمیل مظہری کثیر التصانیف تو نہیں تھے، مگر انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ادب کی ثروت مندی میں اہم اضافہ ضرور ہے۔ انھوں نے یوں تو شاعری کی تقریباً تمام اصناف نظم، غزل، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور شہر

جمیل مظہری کا شعری سرمایہ اپنی کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے نہایت وقیع ہے۔ اگر ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک گہری فکری بصیرت، بلند شعور اور مضبوط فنی بنیادوں کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت کی سنجیدگی اور جدید احساس کی تازگی ساتھ ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

آشوب وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے، مگر نظم گوئی کی طرف ان کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک سے ایک معرکۃ الآراء موضوعاتی نظمیں کہی ہیں، جیسے طویل مرثیے، قصیدے اور طویل مثنوی 'آب و سراب' بھی اس پر دال ہے۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 1953 میں ''نقشِ جمیل'' کے نام سے معروف شاعر اور طنز و مزاح نگار رضا نقوی واہی نے مرتب کیا تھا۔ جمیل مظہری کی فکر اور تخیل کا ہم اگر گہرائی سے مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر ہمارے کلاسیکی سرمایے کی زائیدہ ہے۔ ان کا تخیلی محور اساتذہ ادب کے فکری سرمایے سے ہی نمو پاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں اقبال کی طرح ہمہ وقت حرکت و عمل اور جستجو کا پیغام ملتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی شاعری میں ارتقا کے فلسفے کو پیش کیا ہے۔ ان کے مشاہدۂ حیات کا زاویہ بہت عام نہیں ہے بلکہ مختلف ہے۔ جمیل مظہری اپنے فکر و فلسفے کے معاملے میں یکتائے روزگار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے جس طرح فکر انگیز نظریہ فکر کی نظمیں کہی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، جس سے ان کے فکری منطقے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نمونے کے اشعار ملاحظہ کریں:

انہیں حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ آنسو بھی
جو اکثر دھوپ میں محنت کی پیشانی سے ڈھلتے ہیں
ہستی ہے جدائی سے اس کی جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم، مجبور تھے ہم، مجبور ہیں ہم
انسانیت کے سینے میں رستا ہوا اک ناسور ہیں ہم
(مزدور کی بانسری سے)

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
وہی چولھے ہیں، وہی راکھ، وہی آگ جمیل
اور فضا میں جو دھواں تھا، وہ دھواں آج بھی ہے
(تقدیر جہاں)

مندرجہ بالا اشعار سے جمیل مظہری کے شعری وجدان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے فکر و خیال کی بالیدگی، طرزِ نگارش اور ان کا دھیما دھیما زیرین اسلوب نظم کی اثر آفرینی کو دو چند کر دیتا ہے۔ ان کے یہاں لفظ کی شگفتگی، فکر کی سنجیدگی اور کلام کی بالیدگی ایک نئی فضا کو جنم دے کر فکری کینوس پر نئی دنیا خلق کر لیتی ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ کریں جس سے ان کی فکری وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے:

میں جمیل اک مسافر، مرا ہم سفر زمانہ
مرے تجربے کہانی، مری لغزشیں فسانہ
میں سبک سبک خراماں ابھی شہر، ابھی بیاباں
نہ فراز سے تردد نہ نشیب ہے پریشاں
مرا ہر قدم روایت مری ہر نظر غزل خواں

جمیل مظہری کا تخیل کائناتی ہے۔ ان کی فکری صلابت نظم کی روانی، تسلسل اور خیال ارتسام، سبک سری کا کام کرتے ہیں۔ جمیل مظہری کی ندرت خیال اور اسلوب کی دلکشی بے حد خوبصورت ہے۔ اس کے علاوہ صاف ستھری اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں، تشبیہ و استعارہ سے کام لینے کے ساتھ ان کا مفکرانہ اسلوب دفعتاً قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مختلف رنگ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

دریا کا چڑھاؤ دیکھتا ہوں
تنکوں کا بہاؤ دیکھتا ہوں
کون کہتا ہے بڑھا شوق ادھر سے پہلے
کس نے دیکھا تھا کسے ترچھی نظر سے پہلے
کسی کا خون سہی اک نکھار دے تو دیا
خزاں کو تم نے لباسِ بہار دے تو دیا
جس سمت نظر جائے میلا نظر آتا ہے
ہر آدمی اس پر بھی تنہا نظر آتا ہے
تھی ابھی صبح ابھی شام ہوئی جاتی ہے
زندگی گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے
میں صدقے تجھ پہ ادا تیرے مسکرانے کی
تو سمیٹے لیتی ہے رنگینیاں زمانے کی
خلافِ رسم تغزل غزل سرا ہوں میں
ربابِ وقت کی بگڑی ہوئی صدا ہوں میں

جمیل مظہری کے یہاں ہمیں سنجیدگی اور متانت کی پر کیف فضا نظر آتی ہے۔ وہ حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں تو سنجیدگی اور اپنا معیار برقرار رکھتے ہیں۔ وہ سوسائٹی اور سماج کے مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ جب ملک اور سماج کے مسائل کو شعر کی زبان میں پیش کرتے ہیں تو قاری کو طنز کے اظہار کا واضح طور پر احساس ہو جاتا ہے۔ وہ حق گوئی میں مصلحت اندیشی نہیں اختیار کرتے۔ بڑی بیباکی سے اپنی بات رکھتے ہیں۔ انھیں زمانے کا ذرہ برابر بھی خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں ہمیں پر کیف مناظر کی دلکشی اور اس کی رعنائی کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ حسنِ معشوق و محبوب ہو یا مناظرِ قدرت اس کی خوبصورتی اور دلفریبی کا ذکر بھی وہ بڑے خوبصورت انداز، دلکش لہجے اور ندرتِ اظہار کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھیں اپنے کمالِ فن، ندرت اظہار اور فکر انگیزی اور اعلیٰ خیالی پر فخر بھی ہے، جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

بلاؤ اس کو زبان داں جو مظہری کا ہو
مگر ہے شرط کہ اکیسویں صدی کا ہو

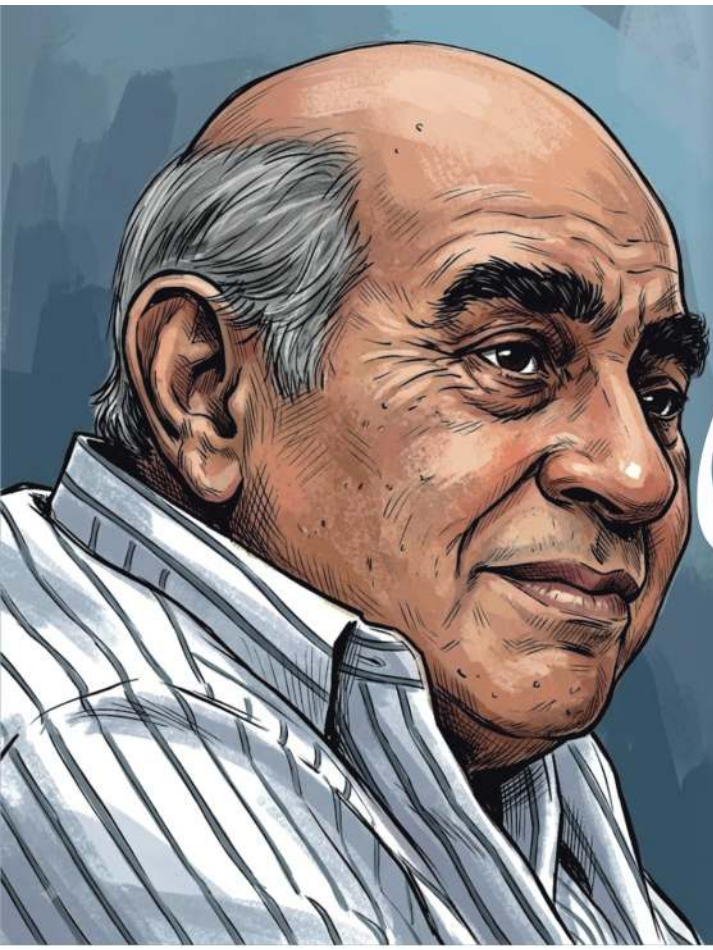
حق یہی ہے کہ اگر ہم علامہ جمیل مظہری کے شعری رویے اور تخلیقی منطقے کا جائزہ لینا چاہیں تو ان کی نظموں کے حوالے سے ہم بہتر طریقے سے ان کی فلسفیانہ سوچ اور ان کے فلسفہ فکر کی تعیین کر سکیں گے ورنہ ناانصافی ہوگی کہ ہم صرف غزلوں کے حوالے سے گفتگو کر کے گزر جائیں۔ کیونکہ جمیل مظہری نے اپنی نظموں میں فکر و خیال کی جو ضوفشانیاں کی ہیں ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بھی زمین و آسمان کو اس کی ظاہری شکل و صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کے باطن میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ وہ کائنات اور اشیائے کائنات کو الگ شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان کا اصل فکری تموج ہمیں نظم ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں تمام تر تخلیقی اور فکری عظمت کی جو خوبیاں جابجا نظر آتی ہیں وہی انھیں ان کے ہم عصر نظم نگاروں میں ممتاز کرتی ہیں۔

مصادر و مراجع

1 قاضی عبدالودود۔ شعرا کے تذکرے۔
2 کوثر مظہری۔ مظہر جمیل (جمیل مظہری پر لکھے گئے اور پڑھے گئے مقالات)
3 پروفیسر کوثر مظہری۔ جمیل مظہری (مونوگراف، اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ)
4 کلیات جمیل مظہری۔ حصہ اول اور حصہ دوم
5 اختر احمد اورینوی۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا
6 مظہر امام۔ جمیل مظہری (مونوگراف، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی)

Dr. Khan Mohd Rizwan
Guest Lecturer, Dept. of urdu
Jamai millia Islamia
New Delhi-110025
Mob: 9810862282
Email: afeefrizwan@gmail.com

تنویر احمد



وارث علوی اور افسانہ کی تنقید

وارث علوی جدید اردو تنقید میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔شاعری اور فکشن دونوں کے حوالے سے ان کے تنقیدی کارنامے موجود ہیں۔لیکن وہ بنیادی طور پر اردو فکشن کے اہم اور منفرد نقاد ہیں۔

وارث علوی نے ادبی فن پاروں اور تخلیقات پر تنقید کرتے ہوئے ادبی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ان کی تنقید کلاسیکی ادب سے لے کر جدید دور تک تمام فنی و جمالیاتی اور نظریاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی واسطے سے ان کی تنقیدی تحریروں میں روایت، رجحانات اور اجتہادات کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے بھی موجود ہیں۔وہ ادب کو ترجمانی اور تشریحی زاویے سے نہیں دیکھتے۔ان کے نزدیک فن اور ادب میں زبان و بیان سے زیادہ انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا تخیلی اظہار اہمیت رکھتا ہے۔حقیقت پسند جارحانہ لہجہ اور جرت مندی ان کی تنقید کے بنیادی اوصاف ہیں۔وہ کبھی کسی کی غلطیوں کی پردہ پوشی نہیں کرتے،انھیں جہاں ادبی یا تنقیدی لحاظ سے کوئی نکتہ کمزور نظر آتا ہے وہ بڑی بیبا کی اور جرت مندی کے ساتھ اس پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ان کی یہ حقیقت پسندانہ جرت تاعمر قائم رہی۔

جدید تنقید میں جہاں شاعری پر عظیم تنقیدی کارنامے سرانجام دیے گئے وہیں اردو فکشن پر بھی خاطر خواہ توجہ کی گئی اور اچھی خاصی معیاری تنقید ہوئی۔جدید ناقدین میں ممتاز شیریں، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، وہاب اشرفی وغیرہ نے فکشن تنقید پر خوب لکھا ہے، وارث علوی ان سب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' وارث علوی کی فکشن تنقید پر پہلی کتاب ہے۔جو 1990 میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔کتاب کل چار مضامین پر مشتمل ہے۔

بظاہر اس کتاب میں چار مختلف ابواب ہیں لیکن ذرا غور کریں تو یہ ابواب مربوط و ہم آہنگ نظر آتے ہیں، جیسے ''اجتہاد روایت کی روشنی میں'' میں موصوف نے جدید رجحانات کو روایت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔''افسانے کے اسلوب'' میں علوی نے جدیدیت میں اسلوب کے بدلتے رویے کو بیان کیا ہے۔وہ جدید افسانے کے اسلوب کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، جدید افسانے میں علامت، تجرید اور ابہام کی بھرمار مناسب نہیں سمجھتے تھے۔وہ افسانے میں اسلوب کو خاصی اہمیت دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جدید افسانے میں علامتی اسلوب کے نام پر جو فیشن ہو چلا ہے وہ فکشن کی شعریات کے منافی ہے۔وہ علامتی اسلوب کو خوبی نہیں بلکہ خامی سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں۔

''ہر جدید افسانہ علامتی ہے اور تنقید میں علامتی اظہار کی اتنی دھوم دھام ہے جتنی مارکس کی تنقید میں اشتراکی حقیقت نگاری کی تھی۔آپ کہیے ایک افسانہ مشکل مبہم یا مہمل ہے تو جواب ملے گا ہوگا کیونکہ علامتی ہے۔آپ کہیے کہ افسانہ بور ہے تو جواب ملے گا میں تو علامتی کہانیاں لکھتا ہوں دلچسپ کہانیاں نانی اماں سے سنیے۔علامت گویا اونچی ایڑی کا وہ جوتا ہے جس سے ہر بدزیب بدصورت بونا اپنا قد اونچا کرنا چاہتا ہو۔''

(جدید افسانہ اور اس کے مسائل۔ص34)

''استعارہ اور نرا لفظ'' میں وہ جدید افسانے میں علامتی اور تجریدی پہلوؤں کو موضوع بحث بناتے ہیں اور ''افسانہ نگار اور قاری'' کے ذیل میں انھوں نے افسانہ نگار اور قاری کے تعلق پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے اس تنقیدی مقدمے میں جدید اردو افسانہ کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔وارث بنیادی طور فکشن میں علامتی اسلوب اور تشبیہات و استعارات کے انکاری نہیں ہیں بلکہ انھوں نے علامتی اسلوب کے صحیح استعمال سے جدید افسانہ نگاروں کی ناواقفیت کو موضوع بحث بنایا ہے۔علاوہ ازیں، یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ جدید افسانہ تکنیک، علامت، استعارہ اور تجرید وغیرہ کی بحث میں

> ہر جدید افسانہ علامتی ہے اور تنقید میں علامتی اظہار کی اتنی دھوم دھام ہے جتنی مارکس کی تنقید میں اشتراکی حقیقت نگاری کی تھی۔ آپ کہیے ایک افسانہ مشکل مبہم یا مہمل ہے تو جواب ملے گا ہوگا کیونکہ علامتی ہے۔ آپ کہیے کہ افسانہ بور ہے تو جواب ملے گا میں تو علامتی کہانیاں لکھتا ہوں دلچسپ کہانیاں نانی اماں سے سنیے۔ علامت گویا اونچی ایڑی کا وہ جوتا ہے جس سے ہر بدزیب بدصورت بونا اپنا قد اونچا کرنا چاہتا ہو۔

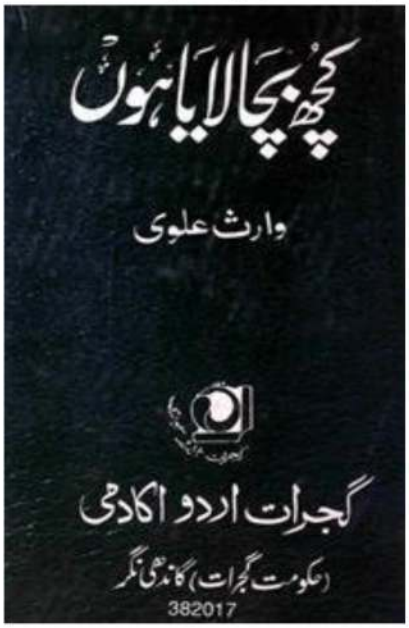
نگاروں کے مخالف نہیں رہے ہیں بلکہ نئے لکھنے والوں میں جس کے یہاں بھی انھیں توازن و ترتیب نظر آئی، انھوں نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا اور سراہا بھی، جیسے اسلوب کی خوبی کی بنیاد پر بلراج مینرا، سریندر پرکاش اور انور سجاد وغیرہ کے افسانوں کو سراہا ہے۔ حالانکہ ان کے خیال میں محض اسلوب کی بنیاد پر اچھے افسانے وجود میں نہیں آتے، اس کے باوجود مذکورہ افسانہ نگاروں کے اسلوب کی غنائیت اور علامتی طرز کے بہترین استعمال کو داد دیتے ہیں، اس سلسلے میں ان کا بیان دیکھیں۔

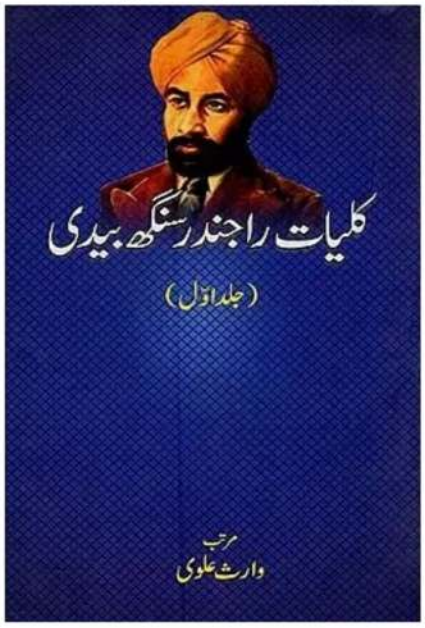
''علامتی طریقہ کار کا سب سے زیادہ اور سب سے کامیاب استعمال سریندر پرکاش نے کیا ہے۔ بلراج مینرا اور انور سجاد نے تجریدیت کو اپنایا اور روایتی افسانہ کے عناصر مثلاً کردار، واقعات، کہانی سے کم سے کم کام لیا، لیکن ان عناصر سے پیدا ہونے والے خلا کو انھوں نے علامتی ٹکسچر یا بافت سے پر کرنے کے بجائے اسلوب کی غنائیت یا زیادہ موزوں الفاظ میں خطابت سے پر کیا ہے''

(جدید افسانہ اور اس کے مسائل۔ ص 48)

وارث علوی حقیقت پسند افسانے کے قائل ہیں ان کا ماننا ہے کہ حقیقت پسند افسانہ ہی انسانی زندگی کے خارجی و داخلی تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا ہے۔ ان کی نظر میں جدیدیت کے رجحان میں افسانہ اپنی اصل اور حقیقت پسندی سے کافی دور ہو گیا تھا، وہ جدیدیت کے رجحان میں فن افسانہ کے تعلق سے پروان چڑھنے والے اکثر تصورات کو غیر ادبی سمجھتے ہیں اور اسی واسطے سے جدیدیت کے حامی ناقدین ادب سے بھی خاصا اختلاف رکھتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں سے علوی کو شکایت ہے کہ وہ تبدیلی اور نئے نئے تجربات کی دھن میں فکشن کی اصلی روح سے دور ہوتے گئے یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو روایتی افسانے میں کوئی سودمند اضافہ کر سکے اور نہ ہی کوئی نیا فارم تشکیل کر پائے۔ جدیدیت کے رجحان میں افسانے میں پلاٹ وغیرہ سے انحراف برتا گیا اور کہانی اور کردار کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگائے گئے، وارث علوی ان تمام تصورات کو سرے سے خارج کرتے ہیں اور فکشن کے لیے کہانی، واقعہ، پلاٹ اور کردار کو ضروری قرار دیتے ہیں، وہ فکشن میں زبان و بیان کے فنی و جمالیاتی استعمال پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مبہم اور غیر واضح بیانیہ جدید افسانے کی بڑی کمزوری ہے۔ ان کے خیال میں جدید افسانہ نگار علامتی اسلوب کو صحیح برتنے سے ناواقف ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسلوب میں علامت کے درست برتاؤ میں ناکام رہا ہے۔

وارث علوی کی کتاب ''فکشن تنقید کا المیہ'' اردو افسانے کی تنقید میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب دراصل فاروقی کی مشہور کتاب ''اردو افسانے کی حمایت میں'' کا جوابی مقدمہ ہے۔ اردو افسانہ کی نظریاتی تنقید کی جانب پہلی بڑی پیش رفت فاروقی نے ہی کی تھی۔ ''اردو افسانے کی حمایت میں'' لکھ کر فاروقی نے اردو افسانے کی نظریاتی تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس میں فکشن بالخصوص افسانے کی شعریات کو موضوع بحث بنایا گیا اور فکشن تنقید کے نظریاتی و عملی دونوں اتنا الجھ گیا ہے کہ فکشن کے ضروری عناصر جیسے پلاٹ کہانی، کردار اور زبان وغیرہ پس پشت چلے گئے ہیں۔ وارث کا یہ خیال بالکل درست ہے جدید افسانے میں ایک وقت ایسا آیا تھا جب افسانہ نگار صرف علامت، استعارہ اور تجرید وغیرہ پر زیادہ توجہ کر رہے تھے اور پلاٹ، کہانی اور کردار کو حاشیہ پر دھکیل دیا تھا، لیکن بہت جلد فنکاروں اور ناقدین ادب کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اردو افسانہ کی شعریات کے اہم عناصر سے پہلو نہیں بچایا جا سکتا۔ وارث علوی اردو فکشن کی شعریات سے مکمل آگاہی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی بھی جدید افسانے میں اسلوب اور فارم کے نام پر ہو رہے نئے نئے تجربات کو تسلیم نہیں کیا اور افسانہ نگاری کی اصل شعریات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وارث سرے سے ہی جدید افسانہ





پہلوؤں پر خاطر خواہ توجہ مرکوز کی گئی۔ وارث علوی کی یہ کتاب ''فکشن تنقید کا المیہ'' بھی افسانے کی نظریاتی تنقید میں ایک بڑے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں علوی نے افسانے کے تعلق سے فاروقی کے تنقیدی نظریات وتصورات کو پوری طرح سے چیلنج کیا ہے اور دلائل کے ساتھ اپنا موقف واضح کیا ہے حالانکہ کئی جگہوں پر موصوف کی جانب سے پیش کی گئی دلیلیں کمزور نظر آتی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ قابل تحسین تنقیدی مقدمہ ہے۔ موصوف نے بڑی محنت ومشقت کے ساتھ فکشن نگاروں کی تخلیقات کا فنی و جمالیاتی مطالعہ کر کے ادبی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں اپنی بات پیش کی ہے۔ کلاسیک سے لے کر جدید دور تک تمام معتبر افسانہ نگاروں کے فکر و فن پر جامع اور مدلل مضامین لکھے ہیں۔ وارث علوی فاروقی کے ان تمام خیالات سے اختلاف کرتے ہیں جن میں فاروقی افسانے کو ایک کم درجے کی صنف قرار دیتے ہیں اور افسانے کے تعلق سے دیگر خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں مثلاً کوئی بڑا فنکار صرف افسانے کی بنیاد پر بڑا نہیں ہے، افسانہ وقت کے چوکھٹے میں قید ہے، اس کا کینوس بہت محدود ہے اور غزل وغیرہ کے سامنے افسانے کی حیثیت بہت معمولی ہے وغیرہ وغیرہ۔ وارث علوی اپنی اس کتاب میں فاروقی کے تمام نکات کو سلسلہ وار خارج کرتے ہیں اور مثالوں کے ساتھ اپنا موقف واضح کرتے ہیں۔

اسی کتاب میں وارث علوی نے فکشن میں تخیل کی کارفرمائی اور تخلیقی نثر کے اوصاف پر مبسوط اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے خیال میں نثر ونظم دونوں میں تخیل یکساں کارفرما ہوتا ہے۔ وہ شاعری کی طرح نثری اصناف میں بھی تخیل کی کارفرمائی کو اہم قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری کی طرح تخلیقی نثر میں بھی تشبیہ، استعارہ، سمبل اور امیج ضروری ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ تمام عناصر شاعری میں استعمال ہوتے ہیں اور اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح تخلیقی نثر میں بھی ان کی خاص اہمیت ہے۔ نظم ونثر میں استعارے کے تعلق سے ایک جگہ اس طرح لکھتے ہیں۔

''استعارہ تو زبان کی اور تخلیقی عمل کی صفت ہے یہ نہ سمجھو کہ استعارہ صرف شاعری کا اجارہ ہے۔ اس کا استعمال تو تخلیقی نثر میں بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا نظم میں۔ نثر میں اس کا حسن الگ ہے اور نظم میں الگ، نظم میں استعارہ ابھرا ہوا ہوتا ہے نثر میں قدرے پھیلا ہوا''

(فکشن کی تنقید کا المیہ۔ ص10)

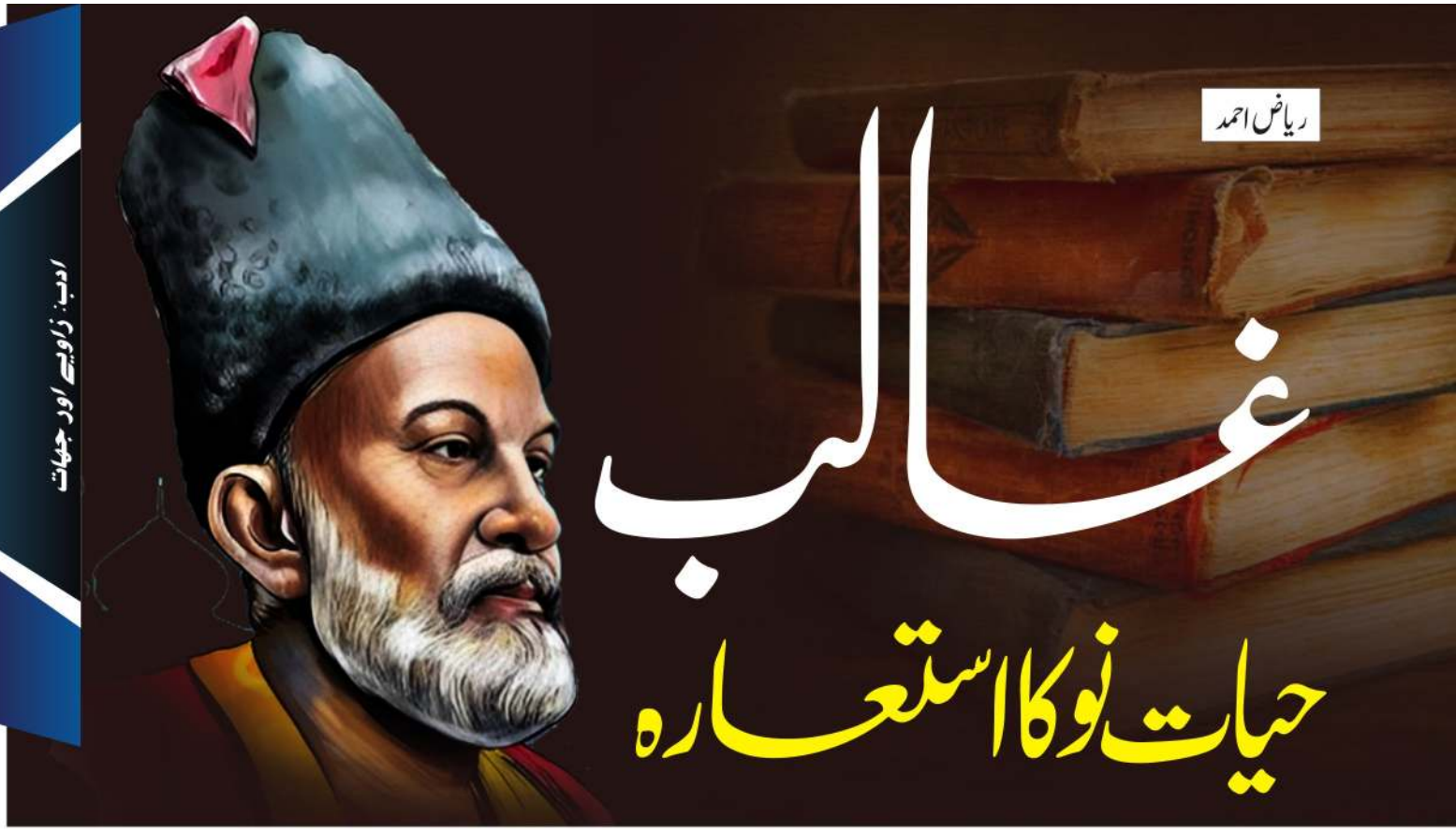
وارث علوی نے منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی فکشن نگاری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور دونوں کی افسانہ نگاری پر بہترین تنقیدی مضامین لکھے ہیں منٹو کے حوالے سے رائج بہت ساری غلط فہمیاں دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور بیدی کے بہت سارے نظر انداز کیے جا چکے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لے کر ادبی دنیا میں ان کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ ان کے نزدیک بیدی کے افسانوں میں شاعری اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج ہے جس کی وجہ بیدی کے افسانوں کی خلاقانہ زبان اور اسطوری وحقیقت پسند تخیل کا توازن ہے۔ موصوف نے اردو افسانے کے بڑے فنکاروں کے ساتھ ساتھ ان افسانہ نگاروں کے فن و ادب کو بھی موضوع بحث بنایا جنھیں خاطر خواہ توجہ نہیں مل رہی تھی بالخصوص اقبال مجید، غیاث احمد گدی، ترنم ریاض، سلام بن رزاق اور خالد جاوید وغیرہ کی افسانہ نگاری پر مضامین لکھ کر ان کی ادبی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کی وارث علوی چونکہ حقیقت پسند افسانوں کے مداح ہیں اس لیے انھوں نے ہر اس افسانہ نگار یا تخلیق پر بات کی ہے جس میں انھیں حقیقت نگاری نظر آئی ہے۔ وارث علوی فکشن یعنی ناول اور افسانے کی ساخت اور ترتیب کی تکنیک پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ فکشن میں واقعات، پلاٹ، کردار، زبان و بیان اور دیگر لوازمات پر مربوط گفتگو کی ہے۔ افسانے کے ساتھ ناول کے فن سے علوی کو خاصی انسیت ہے۔ ان کے خیال میں ناول میں انکشاف کی کیفیت ضروری ہے، صداقت اور حقیقت کے عناصر بھی ناول میں اہمیت رکھتے ہیں۔ علوی کے نزدیک افسانے اور ناول میں انسانی زندگی کو بہتر انداز میں بصیرت افروز اور معنی خیز انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول کے تعلق سے ان کا مضمون بعنوان ''ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے'' خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

وارث علوی کی تنقید کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے روایتی طرز سے ہٹ کر اپنے منفرد لب و لہجے اور اسلوب کے ذریعہ تنقید جیسی خشک صنف ادب کو دلچسپی سے پڑھنے کے قابل بنایا۔ ان کی تنقید میں مدلل مداحی اور بے جا عیب جوئی جیسے غیر ادبی و غیر تنقیدی عناصر بہت کم ہیں۔ موصوف نے بغیر کسی رجحان یا خاص تصور کی پابندی کے خالص ادبی اصول ونظریات کی روشنی میں نظری وعملی دونوں زاویوں سے اردو فکشن کی تنقید میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

وارث علوی اردو تنقید کی روایت میں ایک خاص مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ عصری تنقید میں بالخصوص فکشن کی تنقید کے حوالے سے وارث علوی کو اعتبار حاصل ہے، حالانکہ انھوں نے شاعری کی تنقید بھی لکھی لیکن فکشن کی تنقید ان کا میدان خاص ہے۔ انھوں نے فکشن کے بنیادی مسائل پر مدلل گفتگو کی ہے۔ بالخصوص اردو افسانے پر ان کی تنقیدی تحریریں اردو تنقید کی روایت میں قیمتی سرمایے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وارث علوی کی تنقید کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے روایتی طرز سے ہٹ کر اپنے منفرد لب و لہجے اور اسلوب کے ذریعہ تنقید جیسی خشک صنف ادب کو دلچسپی سے پڑھنے کے قابل بنایا۔ ان کی تنقید میں مدلل مداحی اور بے جا عیب جوئی جیسے غیر ادبی و غیر تنقیدی عناصر بہت کم ہیں۔ موصوف نے بغیر کسی رجحان یا خاص تصور کی پابندی کے خالص ادبی اصول ونظریات کی روشنی میں نظری وعملی دونوں زاویوں سے اردو فکشن کی تنقید میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

■

Dr. Tanveer Ahmed
Fatehpur, Rajouri,
Jammu & Kashmir-185131
Mob. 6006499352
Email: tanvirdu52@gmail.com



غالب

حیات نو کا استعارہ

ریاض احمد

قطرے کے گہر ہونے کا سفر، عناصر میں اعتدال کا نہ ہونا یا رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے یا ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔ یہ تمام زندگی کے مختلف مراحل ہیں جن سے گزر کر انسانی زندگی کی مسافت طے ہوتی ہے۔ انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان حالات و واقعات اور حوادث سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ان سوالات پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری و ساری ہے غالب اس موضوع سے کیسے چشم پوشی کر سکتے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری میں حیات انسانی کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑا ہے۔ بقول عبدالرحمان بجنوری:

''لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یاں حاضر نہیں کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں''[1]

وہ زندگی کے نباض ہیں۔ انھوں نے ہمیں زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا خواہشات کے سہارے زندگیوں کو منور کرنے کی ترغیب دے کر زندگی کی منزل کا تعین خود کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ وہ راہِ زندگی کے رہرو نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں زندگی حادثوں سے تو بھری ہوئی ہوتی ہے مگر پے در پے حادثات کے باوجود بھی انسانی زندگی میں لاکھوں تمنائیں دائم الحبس کی صورت میں دل کے نہاں خانہ میں پوشیدہ ہیں۔ اس لیے دل میں آرزو کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ ایک آرزو پوری ہو جائے تو دوسری آرزو کی منزل روشنی کے مینار کی طرح دور سے دکھائی دے۔ جس کی طرف انسان بڑھتا رہے، کیونکہ دل ہمیشہ تمناؤں کی نئی منزلوں کا خواہاں رہتا ہے، وہ دائمی حرکت چاہتا ہے۔ غالب دریافت کرتے ہیں کہ جب دشت امکان نقش پا کے مثل ہیں تو اب دیکھو تمنا اپنا دوسرا قدم کدھر اٹھاتی ہے کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ نئے نئے مقاصد پیدا کرتا رہے۔ اس طرح وہ انسان کو کشمکش کائنات میں بے بس دیکھنا نہیں چاہتا، بلکہ نت نئے تجربوں سے آشنا کرنے کی کوشش میں ہے۔ تمنا کی آزادی کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی طرف سے پہل کرنے کا موقع فراہم کر دیتی ہے۔ انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ اس کے سفر کی جو منزلیں طے ہو چکیں وہ طے ہو چکیں اب وہ پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب کہ انھیں ماضی سے بے حد لگاؤ تھا۔ ماضی کی شاندار روایات اور اقدار ان کے لہو میں بسی ہوئی ہیں، وہ تہذیب رفتہ کے ماتم گسار بھی ہیں اور ان کو رنگا رنگ بزم آرائیاں اور بادہ شبانہ کی سرمستیاں یاد بھی ہیں۔ لیکن وہ کبھی بھی جذباتی نہیں ہونے پاتے۔ ماضی کی تاریخ سے بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتا کیونکہ ماضی حال کا زینہ ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں انسان نے اپنی ذات سے ماورا ہو کر نئے احوال کی تخلیق کی ہے اگر ایسا نہ ہو تو زندگی قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے پابند ہو جاتی ہے اور انسان عالم تکوین کے مذاق کا تختۂ مشق بن جاتا ہے اور وہ وہاں ہرگز نہ پہنچ سکتا جہاں آج ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے غالب انسان کو ایسے ایسے حیرت انگیز بیابانوں میں لے جانے کے لیے سرگرداں رہتا ہے، جن کے راستوں کو خود تحیر نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے کیونکہ کائنات کا ہر ذرہ تبدیلی اور انقلاب کی حالت میں ہے جو کچھ ہوتا ہے وہ قانون قدرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو ہر وقت اپنے آپ کو زمانے کے مطابق ڈھالنا چاہیے کیونکہ یہاں کسی شے کو ثبات نہیں بقول غالب

خوشی خوشی کو نہ کہہ ' غم کو غم نہ جان اسد
قرار داخل اجزائے کائنات نہیں

قرار داخل اجزائے کائنات یا عمر طبیعی سے بہتر ہی سہی لیکن اس کا کیا اعتبار کہ میں عمر طبیعی کو ضرور پہنچ جاؤں گا غالب زندگی کی آفات و حوادث کو مدنظر رکھتے ہوئے بنی نوع انسان کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا، نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا کے باوجود بھی انسان کو اپنی زندگی میں مقصد کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ:

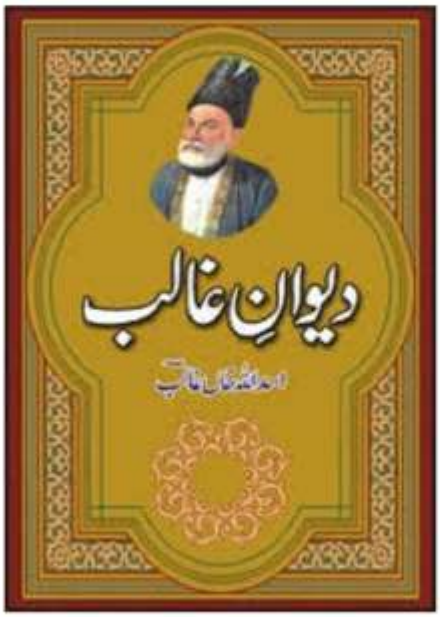
وہ زندگی کے نباض ہیں۔ انھوں نے ہمیں زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا خواہشات کے سہارے زندگیوں کو منور کرنے کی ترغیب دے کر زندگی کی منزل کا تعین خود کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ وہ راہِ زندگی کے رہرو نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں زندگی حادثوں سے تو بھری ہوئی ہوتی ہے مگر پے در پے حادثات کے باوجود بھی انسانی زندگی میں لاکھوں تمنائیں دائم الحبس کی صورت میں دل کے نہاں خانہ میں پوشدہ ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مقام اپنا

غالب اصل میں انسان کی منزل مقصود کی طلب کو بڑھاوا دینے میں خار دار راہوں سے آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ راہ کو پر خار دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کیونکہ زندگی میں مختلف حیرت انگیز بیابانوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن مقاصد کی لگن یا آرزو مندی کی نیرنگِ تمنا ہی ان تمام کیفیتوں کو اپنے حلقہ دام میں لے سکتی ہیں جو زندان میں بھی صحرا نوردی سے باز نہیں رکھتا، لیلا کے اشاروں پر مجنوں کو بیابان نوردی پر آمادہ کرتی ہے۔ میخانے میں ساغر کو گردش میں رکھ رہی ہے۔ دل کے ہر حصے کو تمنا کا گھائل بنا دیتی ہے، جس سے اس کے ریشے ریشے میں حرکت دائمی نظر آتی ہے، کیونکہ اس آفت کے ٹکڑے کو عافیت سے نفرت اور دائمی آوارگی سے محبت ہے۔ وہ زندگی میں طوفانوں سے پنجہ کشی کرنے کا خیر مقدم کرتی ہے۔ بادمخالف کشتی بے لنگر اور ناخدا غفلت کی حالت میں اپنی ذات کے وسائل پر بھروسہ کر کے راستے کا سراغ لگانے پر آمادہ کرتی ہے۔ گردش ساغر کو صد جلوۂ رنگیں میں متبدل کر دیتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر شے کو تمنا کی حوصلہ مندی اور ہمت عالی سے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور خود ان کا کسی قیمت پر سودا کرنے کو تیار نظر نہیں آتے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی تمناؤں سے ہی شور ہستی برپا ہے۔ گویا خود محشر قیامت اس مشت خاک کے اندر پنہاں ہے۔ غالب کے نزدیک انسان کا سینہ تخلیق آرزو اور تخلیق مقاصد کی شعاعوں سے منور ہے۔ کائنات میں انسان کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے۔ اس راز کو کائنات کے قرب و جوار میں آشکار کرنے کے لیے بلند مقاصد اور جرأت و ہمت کی اشد ضرورت ہے تاکہ زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا رہے۔ وہ ذوق طلب اور سوزِ آرزو کو اولیں مقصد گردانتے ہیں۔ دریاؤں کو عبور کرنا کوہِ گراں اور طلسم زمان ومکاں کی حد بندی کے حصاروں کو توڑ کر جہان بے نمود میں بیشمار نئے عالم آشکار کی تلاش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی زندگی کی اصل جستجو اور آرزو میں پوشیدہ ہے وہ اس عالم رنگ و بو کی گہما گہمی، چہل پہل، ترقی کے سارے منازل اور تمام اسباب وعلل کو اسی کے بدولت معرض وجود میں گردانتے ہیں۔ وہ اس سے ہمیں تاروں پر کمند ڈالنا سکھاتے ہیں اور زندگی کو حرکت واضطراب کا ضامن بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں جو سکون وثبات نظر آتا ہے یہ تو دھوکے کے سوائے کچھ نہیں، اس لیے کہ فی الواقع حرکت ہی حقیقی زندگی ہے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اضطراب سے دوچار ہے اور حرکت سے ہی انسانی وجود متحرک رہتا ہے اور مختلف جہتوں سے ہم کنار رہتا ہے۔ اے انسان تو اب بھی زندگی کو ایک ایسا راز تصور کرتا ہے جبکہ زندگی تو بلند پروازی اور عروج وارتقا سے عبارت ہے اس میں پست وبلند بہت آتے ہیں مگر اس سے تو منزل تک رسائی سے زیادہ سفر اور گردش پسند ہے جہاں تک سفر کا تعلق ہے سو وہ زندگی کو متحرک اور برسرعمل رکھنے کا دوسرا نام ہے، اس لیے سفر کو ایک حقیقت بھی تصور کر لینا چاہیے اور مجاز بھی۔ سفر کی دونوں صورتیں زندگی کے لیے بلا شبہ دورخ ہیں۔ ان دونوں رویوں میں زندگی علاج درد میں بھی درد کی لذت کا ساماں مہیا کرتی ہے۔ جس سے زندگی میں پلٹنا جھپٹنا اور بھڑ کنے کا کاروان زندہ وتابندہ رہتا ہے۔ یہ زمانے کے دھارے کو اپنے آپ میں گم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ستم زدہ موجوں کے تھپیڑوں کو سہنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ غالب اسی حرکت وعمل، مسلسل جہدِ عمل سے جہاں بنمود کی تخلیق کا راز جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یم زندگی اور رم زندگی میں اس حقیقت کو پالیتا ہے۔ وہ انسان کو اس عالم رنگ و بو جس کی حدیں ردائے نیلگوں تک نظر آتی ہیں پر قناعت کرنے کے بجائے جہاں اور کی تلاش میں سرگرداں دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ اس فضا میں سینکڑوں کارواں کی طناب کا سراغ مل رہا ہے جو وقتاً فوقتاً ابھرتی اور مٹتی جا رہی تھی۔ اس لیے انسان کو زندگی کے سفر میں کوئی نشیمن میں مستقل طور پر تعمیر نہیں کرنا چاہیے یہاں زندگی روز و شب اور صبح وشام سے تعبیر ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب وروز ماہ و سال کہاں

اس جہاں میں جنبش ازل سے ہی شہب زمانہ کی طرف دوڑتا رہتا ہے۔ جس کا آغاز ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں کی تشکک پسندی میں ہے، جس کی حقیقت خاراشگافی اور سخت کوشی میں چھپا ہوئی ہے۔ جہاں چھالوں میں کانٹے لگے ہوئے ہیں زندگی تگاپوئے دمادم کی دلیل ہے، جو حقیقت زندگی کا راز ہے۔ اس ذوق میں وہ راحت طلبی اپنے لیے مضر رساں تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنت کو بھی عافیت اور دلکشی کے لیے درخور اعتنا نہیں سمجھتے دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو، سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی یا کشاکش ہستی سے کرے



کیا سعی آزادی' ہوئی زنجیریں موج آب کو فرصت روانی کے مصداق ہیں۔ غالب اسی مسلسل کشاکش کو زندگی کا ثمر آور پودا سمجھتے ہیں، جس سے گلستاں میں نئے گل بوٹے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کی حیثیت چمن میں باغبان جیسی ہے جو ہر روز اس گلستان میں رنگ بہ رنگ پھولوں کے جھرمٹ دیکھنے کا خواہاں رہتا ہے یہ خواہش ہر روز ایک نئی آن بان کے ساتھ نظر آتی ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حسرت بھری دنیا میں انسان کی زندگی امتحان گاہ ہے۔ یہاں کسی بھی منزل کا حد آخر نہیں ہوتا ہے۔ ازل سے ابد تک، لحد سے مہد تک وقوع پذیر کا سفر جاری و ساری ہے۔ غالب کشمکش زندگی میں عرش سے کاش کہ ہوتا مکاں اپنا یا لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند کے متقاضی ہیں۔ کیونکہ کائنات کا ہر ذرہ مسلسل تکمیل کی طرف گامزن ہے۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں، یا آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ہی قلزم ہستی کا اصل راز ہے۔ اس حلقہ دام خیال میں انسانی زندگی کی گردش ساقی کوثر کے باغ میں سوئے زن کا حکم رکھتی ہے۔ وہ دوران سفر کسی مقام کو اپنا منزل قرار نہیں دیتے ہر مقام ان کے لیے چاہے وہ مقام کعبہ ہی کیوں نہ ہو، نقش پائے رواں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ پارینہ یا کہن نو کے اس سفر میں وہ بنی آدم کو ہمت، عزم، قوت، صبر، استقلال، یقین محکم اور عمل پیہم کی دعوت دیتا ہے ان کی نگاہیں دونوں تہذیب پر جمی ہوئی تھیں وہ مسلسل کوشش کی طرف اپنے قاری کو متوجہ کرتا ہے کیونکہ دمادم کن فیکوں یا کل یوم ہو فی شان کی صورت نمود پر مشتمل ہے۔ غالب زمانے کے بدلتے ہوئے انداز کو صورتِ شمشیر پر دم نکلنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے غالب ان بکھرے ہوئے حالات میں انسان کو تغیر و تبدیلی سے آشنا ہونے کی تلقین کر رہے ہیں۔ کیونکہ دنیا کی ہر شے انقلاب پذیر ہے ہر چیز' ہر لمحہ' ہر گھڑی تبدیلی ہو رہی ہے جو صورت کل تھی وہ آج نہیں جو آج ہے کل نہ ہوگی کسی چیز کو ثبات نہیں۔ اگر ثبات ہے تو فقط تبدیلی کو۔ وہ آزاد کے بجائے جدوجہد کی پرزور تلقین کرتا ہے۔ تعمیر میں تخریب کا پہلو مضمر ہونا یا عروج و بلندی میں پستی کا پہلو چھپا رہنا قانون قدرت ہے۔ کائنات میں زندگی جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش سے گزر رہے ہیں' غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار کی آزمائش ابر آلود کی طرح سر پر دکھ رہی ہے۔ رنگارنگ بزم آرائیوں میں نقش طاق نسیاں بھی موجود ہیں۔ سینہ پرخوں کا زنداں خانہ بن چکا ہے طوفان حوادث از مکتب کی صورت میں موجود ہیں' کارفرما دو دو چراغ اختیار کر چکا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی نے داغ دل کو سرو چراغاں بنا دیا ہے یہاں تک کہ ایک ذرا چھیڑیے تو دیکھئے کیا ہوتا کا عالم چار سو میں نظر آتا ہے۔ غالب ان تمام حالات میں سفر زندگی کو جینے کا فن سکھاتا ہے۔ ایک طرف دنیا کو تفکر کا سبق سکھانا اور دوسری طرف خندہ پیشانی سے

غالب کائنات کے ہر ذرہ کو آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز سے تعبیر کرتا ہے، جس میں ذوق وشوق چھپا ہوا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی زیست کو مقدس بنانے کی تلاش میں ہے۔جس طرح نیطشے نے اپنی کتاب المیے کی تخلیق میں لکھا ہے کہ فن کا کمال یہ ہے کہ وہ زیست (existance) کا اقرار کرے اس کو بارحمت تصور کرے اور زیست کو مقدس بنائے۔ غالب نے ہمیشہ کلی انسانی موقف (total human situation) کو اپنے پیش نظر رکھا

طوفانِ حوادث کا تماشا دیکھنا ان کی شخصیت کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے شب و روز کے نئے کھیل ان کے لیے بازیچہ اطفال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

انسان غموں کے بوجھ تلے اپنے قیمتی متاع کو نظر فریب کا شکار بننے کا عادی بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرگ ناگہاں کا تصور نکتہ سنج دماغ میں جاناں یار کی صورت میں زانوئے ادب تہہ کر کے ہمت و استقلال کا عامل چھوڑ آتے ہیں۔ جب کہ کارگہہ حیات میں حسین جیسا جذبہ اور حیدر کرار کی ہمت کا ہونا لازمی ہے کیونکہ غم اور خوشی انسانی نفسیات کا جزو لاینفک ہیں اور ان دونوں کا تاثر زندگی میں پانی کے بلبلے کی مانند ہے۔ خوشی کا تاثر انسانی زندگی کو کہیں حد تک کاہل اور جفاکشی سے محروم کرتا ہے جب کہ غم زندگی کے رگ و پے میں رگ جان کے مانند ہے مرد آزاد منش غالب کے نزدیک غم کا تصور انسانی ذہن میں برق کی روشنی سے ایک لمحے بھی زیادہ نہیں ہوتا۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمع ماتم خانہ ہم

غالب کائنات کے ہر ذرہ کو آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز سے تعبیر کرتا ہے، جس میں ذوق وشوق چھپا ہوا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی زیست کو مقدس بنانے کی تلاش میں ہے۔جس طرح نیطشے نے اپنی کتاب المیے کی تخلیق میں لکھا ہے کہ فن کا کمال یہ ہے کہ وہ زیست (existance) کا اقرار کرے اس کو بارحمت تصور کرے اور زیست کو مقدس بنائے۔ غالب نے ہمیشہ کلی انسانی موقف (total human situation) کو اپنے پیش نظر رکھا اس لیے بلندیوں سے پستی اور پستی سے بلندیوں تک سرگرم سفر نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کو دام تمنا میں اسیر کر لینا چاہتا ہے ان کے دام تمنا میں وہ بھی اک صید زبوں کی طرح ہیں کیونکہ زیست کے ہر لمحہ میں موت پنہاں ہے۔اس لیے یہ کائنات انھیں ناقص دکھ رہی ہے جس میں عشق کا کمال ممکن نہیں۔عشق ہی زیست کے بے معنی صحرا میں امید کے چراغ روشن کرتا ہے اور زندگی کی بے معنویت میں معانی کی تخلیق کرتا اور وحشت کدہ عالم میں سکون کا سامان فراہم کرتا ہے۔اس لئے مضمحل ہو گئے قوی غالب کہ عناصر میں اعتدال نہیں ہونے کے باوجود بھی ان کا احتجاج یہ ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حواشی

1 یادگارِ غالب، الطاف حسین حالی
2 محاسن کلام غالب، عبدالرحمان بجنوری
3 بیان غالب، آغا محمد باقر
4 غالب شخص اور شاعر، مجنوں گورکھپوری
5 ماہنامہ نقوش کا غالب نمبر، محمد طفیل یادگار کمیٹی ہند کی پیشکش

Dr. Riyaz Ahmed
Guest Lecturer, Dept. of Urdu
University of Kashmir-190006
Email: drriyazkumar04@gmail.com
Mob: :6006855004



مہر النساء

ویریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر

ویریندر پٹواری کشمیری پس منظر سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کے کردار اور طرزِ زندگی میں اپنے علاقے کی تہذیبی روایتیں، سماجی اقدار اور دیہی زندگی کی سادگی نمایاں طور پر جھلکتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسے ماحول سے تھا جہاں انسانی رشتوں کی مضبوطی، بزرگوں کا احترام، مہمان نوازی اور باہمی تعاون کو زندگی کا اہم حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ویریندر پٹواری کی شخصیت میں سنجیدگی، متانت اور عوامی مزاج کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے علاقے کے عام لوگوں کے مسائل کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان کے دکھ سکھ میں شریک رہنا بھی اپنی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں مقامی لب و لہجے کی مٹھاس اور اپنے خطے کی ثقافت کی خوشبو محسوس ہوتی تھی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ویریندر پٹواری کو اپنے علاقے کے سماجی ڈھانچے اور عوامی زندگی کا گہرا شعور حاصل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ دیہی معاشروں میں لوگوں کے مسائل صرف معاشی نہیں ہوتے بلکہ عزت، روایت اور خاندانی تعلقات بھی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ معاملات کو سمجھداری، تحمل اور انصاف کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں سختی کے بجائے نرمی اور گفتگو میں شائستگی پائی جاتی تھی، جس کی وجہ سے لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک مقامی رہنما جیسی خصوصیات پائی جاتی تھیں جو لوگوں کو قریب لانے اور باہمی اختلافات کو کم کرنے کا ہنر جانتا ہو۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ویریندر پٹواری صرف ایک فرد نہیں بلکہ کشمیری معاشرت، ثقافت اور دیہی شعور کی علامت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں سادگی، انسان دوستی، تہذیبی وابستگی اور عوامی مزاج کی ایسی خوبیاں موجود تھیں جو انھیں اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے قابلِ احترام بناتی ہیں۔ ان کا کردار اس بات کی مثال ہے کہ مقامی تہذیب اور ثقافتی شناخت سے جڑا ہوا انسان نہ صرف اپنی روایتوں کا محافظ ہوتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک مثبت مثال قائم کرتا ہے۔

ویریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر کا درد و کرب اردو افسانے کے ان اہم موضوعات میں شمار ہوتا ہے جن میں جمالیاتی حسن، سماجی حقیقت اور تاریخی المیہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ویریندر پٹواری نے کشمیر کو محض ایک جغرافیائی خطہ، یا سیاحتی مقام کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اسے ایک ایسی زندہ انسانی دنیا کے طور پر پیش کیا ہے جہاں فطرت کی دلکشی کے ساتھ ساتھ زخم خوردہ انسانوں کی آہیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں وادی کی برف پوش پہاڑیاں، جھیلوں کی خاموشی، چناروں کی سرگوشی اور لہلہاتے باغات صرف منظر نامہ نہیں بنتے، بلکہ ان مناظر کے پس منظر میں ایک ایسا اجتماعی دکھ سانس لیتا ہے جو پورے معاشرے کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پٹواری کے افسانوں میں کشمیر کی تصویر ایک دو رخی تاثر پیدا کرتی ہے: اس سلسلہ میں ان کے افسانہ ''مینا بازار'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ''مینا بازار'' ایک ایسا مقام ہے جہاں پہلے رنگا رنگ زندگی، تجارت اور سماجی میل جول کی رونقیں ہوا کرتی تھیں، مگر ہجرت کے بعد یہ ایک ویران اور اجڑا ہوا منظر پیش کرتا ہے۔ مصنف اس کے ذریعے کشمیر کی تہذیبی ہم آہنگی کی تباہی کو اجاگر کرتے ہیں۔ بازار نہ صرف ایک جگہ بلکہ مثال بن جاتا ہے مشترکہ زندگی، بھائی چارے اور معاشی سماجی استحکام کا۔ جو بلاتفریق تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں جس میں افسانہ نگار کا درد و غم کربناک صورت میں منظر عام پر آتا ہے:

''میں آریہ ہوں، منگول ہوں، چینی ہوں، حبشی ہوں، گورا ہوں یا کالا ہوں، یہ یاد نہیں آ رہا ہے لیکن پھر بھی پچھلی صدی کی طرح یہاں اس کھلے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ کس نے لگایا ہے مجھے معلوم نہیں مگر ویسا ہی بازار ہے جیسے پچھلی صدی میں سجا سجایا رہتا تھا فرق صرف اتنا ہے کہ اس صدی میں یا اس سے بھی پہلی صدی میں گاہکوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی اور اس وقت یہاں میرے اردگرد فقط تین گاہک نظر آ رہے ہیں۔''

(افسانہ مینا بازار، مشمولہ لالہ رخ، ویریندر پٹواری، سنہ 2013، ص:17)

پٹواری کی افسانہ نگاری کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ سیاسی پیچیدگیوں کو انسانی تجربے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی صورتِ حال محض نعرہ، احتجاج یا خبروں کی سرخی بن کر نہیں آتی، بلکہ ایک ایسے ماحول کی صورت میں سامنے آتی ہے جس میں معمول کی زندگی غیر معمولی اضطراب میں بدل جاتی ہے۔ اسکول جانے والا بچہ، اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھی ماں، خاموش سڑک پر تنہا چلتا نوجوان، یا یادوں میں گم ایک بوڑھا، یہ سب کردار کشمیر کے المیے کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔

ویریندر پٹواری کی حساسیت اور فنی مہارت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ دکھ کو براہِ راست بیان کرنے کے باوجود اسے سطحی جذباتیت میں تبدیل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے یہاں ایک سادہ سا منظر بھی تہ در تہ معنی پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بند دروازہ صرف گھر کی بندش نہیں، بلکہ خوف، سناٹے اور نامعلوم خطرے کی علامت بن جاتا ہے۔ برف صرف موسم نہیں رہتی، بلکہ جمود، سرد مہری اور انسانی رشتوں کے منجمد ہو جانے کا استعارہ بن جاتی ہے۔ گلیاں صرف راستے نہیں رہتیں، بلکہ ویرانی اور عدم تحفظ کی تصویر بن جاتی ہیں۔ اس علامتی نظام

کے ذریعے پٹواری کشمیر کے کرب کو صرف ایک حادثاتی یا وقتی صورت حال کے طور پر نہیں دکھاتے، بلکہ اسے ایک مسلسل وجودی تجربہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دکھ کی تھیں اس انداز سے کھلتی ہیں کہ قاری ایک طرف اس درد کو محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی وجوہ، اثرات اور انسانی معنویت پر بھی غور کرنے لگتا ہے۔ افسانہ 'لالہ رخ' میں ویریندر پٹواری نے انسانی کرب کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے:

''میں لالہ رخ کی یادوں میں کھو چکا تھا جب کھوجی ہیلی کاپٹروں نے یہ اطلاع دی کہ وہ جزیرہ نظر آچکا ہے جہاں جہاز کا ملبہ نظر آرہا ہے مگر وہاں فوری طور پر پہنچ پانا دشوار نظر آرہا ہے۔ وجہ موسم کی خرابی بتائی گئی۔''

میرے ہم سفر خوش تھے، وہ اس لیے کہ کسی کے زندہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ چونکہ حادثے کے چوتھے دن ملبے کے نیچے لاشیں ہی مل سکتی تھیں اس لیے یہ سوچ کر وہ فوری طور پر مقامی اور عالمی دباؤ ڈال کر عارفہ کی میت کو وادی میں دفن کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ عارفہ کی آواز بلند کرنے کی خاطر، جب کہ میں دعائیں کرتا رہا کہ کوئی ایسا کرشمہ ہو جائے جس کی بدولت وادی کے کونے کونے میں ہماری لالہ رخ کی آواز سن کر ابل رہے سیاسی حالات میں عوام یہ ابال دینے والے ایندھن کو اکھاڑ کر پھینک دیں۔

امید جب پھول رہے سانسوں کو تھام لیتی ہے تو یادیں پھر تعاقب کرنے لگتی ہیں اور واقعات کے گزر جانے کے دوران موسم بدلتے رہتے ہیں، سال گزر جاتے ہیں– صدیاں گزر جاتی ہیں، مگر بیتے دنوں کی یادیں ہوا کے جھونکوں کی طرح چھو کر کبھی گرمی اور کبھی ٹھنڈک کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ میں بھی ایسی کیفیت کا شکار ہو گیا ہوں وہ اس لیے کہ میں حساس ہوں۔

(لالہ رخ: ویریندر پٹواری، 300)

ویریندر پٹواری کی نثر سادہ، شفاف اور رواں ہے، مگر اس سادگی کے اندر ایک گہری شعوری شدت موجود ہوتی ہے۔ وہ پیچیدہ اور بوجھل اسلوب سے گریز کرتے ہیں تاکہ قاری براہِ راست کرداروں کے احساسات، ماحول کی تلخی اور فضا کی اداسی تک پہنچ سکے۔ ان کے جملوں میں تصنع کم اور صداقت زیادہ ہوتی ہے، اور یہی صداقت ان کی تحریر کو زندگی سے قریب تر بناتی ہے۔ وہ داخلی کیفیات کو بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ کردار اکثر اپنے دکھ کو لفظوں میں پوری طرح نہیں کہہ پاتے، اور یہی ناگفتہ بہ کیفیت ان کے افسانوں کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔ خاموشی، توقف، ادھوری باتیں، ٹوٹے ہوئے مکالمے، اور بے نام خوف، یہ سب عناصر مل کر ان کے فکشن کو ایک ایسا صوتی و نفسیاتی ماحول دیتے ہیں جس میں قاری خود بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح افسانہ صرف پڑھا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔

ویریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر سماجی، سیاسی اور تہذیبی تمام سطحوں پر بیک وقت ظاہر ہوتا ہے۔ وار وہ ان سطحوں کو اس ہنرمندی سے یکجا کرتے ہیں کہ ان کے افسانے ایک خاص خطے کی کہانی ہونے کے باوجود آفاقی اثرات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ماحول سازگار نہ ہونے کے باوجود بھی وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں، انھیں وادی میں سکون بحال ہونے کا پورا بھروسہ ہے۔ وہ افسانہ 'برف' میں وہ کشمیر کی جھیل اور چنار کے درخت کی خوبصورتی کو امن و سکون کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری نظریں جھیل کے درمیان واقع جزیرے میں لگے صدیوں پرانے چنار کے درختوں پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ بھی برف کی چادر اوڑھے چپ چاپ یوں کھڑے ہیں جیسے صلیب سے لٹکا ہوا مسیحا یا زنجیروں میں جکڑے ہوئے صوفی سنت۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ دونوں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ان چناروں کے کھوکھلے تنوں میں بیٹھے سورج کی کرنوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ شاید میری ہی طرح یہ سوچ کر کہ برف پگھل جائے گی، جھیل کا منجمد پانی پھر حرکت میں آئے گا، رو پہلی لہریں ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے کناروں تک آجائیں گی اور پھر کمل کے پھول دکھائی دیں گے۔ لیکن دن کی اجلی دھوپ کو کالے بادلوں نے دبوچ ڈالا ہے۔ جھیل کی منجمد سطح بچوں کے تجسس کا مرکز بن چکی ہے۔ چونکہ بچے جھیل کی منجمد سطح پر کرکٹ کھیل رہے ہیں یا سائیکل چلا رہے ہیں۔ پھر کوئی حالات کو سنگین بتائے تو بھی کیسے؟'' (لالہ رخ، ص 56)

ان کے افسانوں میں کردار محض واقعات کے پیکر نہیں بلکہ انسانی وقار کے حامل وجود ہیں۔ وہ اپنے دکھ کے باوجود زندگی سے رشتہ توڑتے نہیں، بلکہ اس رشتے کے ٹوٹنے کا خوف ان کی آنکھوں، باتوں اور خاموشیوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہی انسانی وقار ویریندر پٹواری کو محض المیہ نگار نہیں بلکہ حساس افسانہ نگار بناتا ہے۔ وہ قاری کے سامنے ایسی دنیا پیش کرتے ہیں جہاں ہمدردی، یادداشت اور امید کے دھاگے ابھی مکمل طور پر نہیں ٹوٹے۔ یہ امید ان کے افسانوں میں ایک مدھم مگر مسلسل روشنی کی طرح موجود رہتی ہے، جو دکھ کی تاریکی کو مکمل حاوی نہیں ہونے دیتی۔ اسی پہلو سے ان کی افسانہ نگاری محض نوحہ نہیں بلکہ انسانی بقا کی گواہی بھی بن جاتی ہے۔

ویریندر پٹواری نے اردو افسانے میں کشمیر کے موضوع کو ایک نئی فنی اور فکری وسعت عطا کی ہے۔ ان کے ہاں یہ موضوع محض خارجی حالات کی عکاسی نہیں، بلکہ انسانی باطن کی گہرائیوں میں اترنے کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کسی خطے کے المیے کو سمجھنے کے لیے صرف سیاسی تجزیہ کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے ادب کی وہ بصیرت درکار ہوتی ہے جو دکھ کی نبض پر ہاتھ رکھ سکے۔ پٹواری کے افسانے اسی بصیرت کی مثال ہیں۔ ان میں نہ تو بے جا جذباتیت ہے اور نہ ہی خشک حقیقت نگاری؛ بلکہ ایک متوازن فنی رویہ ہے جو قاری کو سوچنے، محسوس کرنے اور جڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کشمیر کے دکھ کو رومانویت میں گم نہیں ہونے دیتے، اور نہ ہی اسے محض المیاتی منظرنامہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس دکھ کو ایک جیتی جاگتی انسانی سچائی میں بدل دیتے ہیں۔

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ویریندر پٹواری کی افسانہ نگاری کشمیر کے ماحول کی نہایت موثر، سچی اور فنکارانہ ترجمان ہے۔ ان کے افسانے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ادب محض لفظوں کی ترتیب نہیں بلکہ ایک اخلاقی، انسانی اور تہذیبی ذمہ داری بھی ہے۔ کشمیر کے باسیوں کی بے بسی، خوف، جدوجہد، یادیں اور شکستہ امیدیں جب ان کے افسانوں میں ڈھلتی ہیں تو قاری کے اندر ایک نئی بصیرت جنم لیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ درد صرف جھیلنے کی چیز نہیں، بلکہ سمجھنے، بانٹنے اور بیان کرنے کی بھی ایک انسانی ضرورت ہے۔ ویریندر پٹواری نے اسی ضرورت کو اپنے فن کا حصہ بنایا ہے اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی اصل کامیابی ہے۔

Mehrul Nisa
Address: D/O: Abdul Rashid, Bhat, H. No 789
Qadire Manzil, Near Shahi Masjid
Muslim Colony Bahu Fort, Jammu City-180006
Mob. 700643006
Email: mehruln262@gmail.com



اردو میں نسوانی شاعری کی روایت

وجے کمار

نسوانی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو عورت کے وجود، اُس کے سماجی جبر، نفسیاتی دباؤ، جسمانی و جذباتی تجربات، صنفی امتیاز اور مردانہ بالا دستی کو موضوع بناتی ہے۔ یہ شاعری صرف ''عورتوں کی لکھی ہوئی شاعری'' نہیں، بلکہ ایک شعوری، سیاسی اور سماجی موقف ہے جو عورت کو خاموش مظلوم یا رومانوی شئے کے بجائے خود مختار انسان، مزاحمت کرنے والی آواز اور اپنی کہانی خود لکھنے والی تخلیق کار کے طور پر پیش کرتی ہے۔

نسوانی شاعری میں عورت کی عکاسی کا سبق یہ ہے کہ جب تک وہ خود نہ بولے، تب تک اُس کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں طویل عرصے تک عورت صرف موضوع تھی، شاعرہ نہیں تھی۔ وہ یا تو محبوبہ تھی، یا ماں، یا بہن، یا بیٹی، لیکن اپنی آواز سے محروم تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے عورت نے نہ صرف قلم اُٹھایا بلکہ اس قلم سے سماج کی دیواروں پر اپنا درد، اپنی بغاوت اور اپنی شناخت لکھنا شروع کی۔ آج اُردو میں نسوانی شاعری ایک مضبوط، زندہ اور مسلسل پھیلتی ہوئی روایت ہے جو نہ صرف ادب بلکہ معاشرت، سیاست، نفسیات اور ثقافت کو بھی بدل رہی ہے۔

اُردو کی نسوانی شاعری کا سفر لطف النسا امتیاز کے دیوان سے شروع ہوا، ماہ لقا چندا کی آواز سے گلیوں میں اُترا، پروین شاکر کی خوشبو سے گھروں میں داخل ہوا، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے اسے بغاوت بنایا، روپ کنور کماری نے تصوف کی زبان بخشی ترنم ریاض نے کشمیر کی خوبصورت وادیوں سے متعارف کرایا۔ سنیتا رینا نے ہجرت کا کرب، اور اپنے ہی وطن میں اجنبیت کے احساس سے روبرو کرایا۔ شفق فاطمہ شعریٰ نے اکیسویں صدی کی عورت کے مسائل کو بہتر طور پر پیش کیا یہ روایت محض ادب نہیں، ایک مسلسل تحریک ہے آج جب کوئی لڑکی اپنا کلام لکھتی ہے اور شائع کرتی ہے تو اُس کو ادبی حلقوں میں جو پزیرائی ملتی ہے وہ اُسی عظیم سلسلے کی نئی کڑی ہے جو تین صدیوں پہلے لطف النسا امتیاز نے شروع کی تھی۔ اگر ہم اُردو شاعرات کی فہرست دیکھیں تو ایک بڑی تعداد سامنے آتی ہے۔ لطف النساء امتیاز، ماہ لقا ابائی چندا، بیگم مرزا ہادی رسوا، امراؤ بیگم، بیگم حسرت موہانی، بیگم لکھنوی، ادا جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زہدہ زیدی، ترنم ریاض، شفق فاطمہ شعریٰ، نوشی گیلانی، روپا بھوانی، سنیتا رینا، بلقیس ظفر الحسن، ادیب، عنبرین عنبر، کنول، انا دہلوی، انجلی بنگا، انجم رہبر، فوزیہ ارباب، شبینہ فرحانقوی، کوثر رسول، روبینا میر، بشریٰ مسعود، سنتوش شاہ نادان، شمع بھلیسی، شہناز نبی، فوزیہ مغل، جیوتی آزاد کھتری، کومل جوئیہ وغیرہ، جیسے نام اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

ابتدائی دور

دکنی دور میں چند ریختہ گو خواتین کا ذکر ملتا ہے، لیکن اُن کی شاعری محفوظ نہ ہوسکی۔ البتہ لطف النسا امتیاز اور ماہ لقا بائی چندا کا کلام دستیاب ہے۔ یہ دونوں اولین صاحب دیوان شاعرات ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں چند گمنام خواتین غزلیں لکھتی تھیں، مثلاً غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم، جو غزلیں لکھتی تھیں مگر کبھی شائع نہ ہوئیں۔ مرزا ہادی رسوا کی بیگم، جن کی چند غزلیں رسوا نے اپنے رسالے میں چھاپیں۔ لکھنؤ کی تہذیب میں کئی طوائف شاعرات تھیں، لیکن انھیں معاشرے نے شاعرہ تسلیم نہیں کیا۔ یہ سب شاعری عشقیہ تھی اور سماجی مسائل سے براہِ راست متاثر نہ تھی۔

دکن، جو اُردو ادب کی جڑوں کا مرکز رہا ہے، میں ابتدائی شاعرات کا ذکر کم ہی ملتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں مرد شاعروں کا غلبہ تھا۔ تاہم 18ویں صدی کے آخر اور 19ویں صدی کے آغاز میں کئی نمایاں خاتون شاعرات ابھریں جنھوں نے دکنی اُردو شاعری کو تقویت بخشی۔ یہ شاعرات قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفیہ سلطنتوں کے دور سے وابستہ تھیں۔

لطف النساء بیگم امتیاز: 1761 تعلق اورنگ آباد مہاراشٹر، دکن سے تھا، جو آصفیہ سلطنت کا حصہ تھی۔ وہ شاعر اسد علی خان تمنا کی بیگم تھیں۔ 1797 میں اُن کا دیوان مرتب ہوا۔ اُن کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ سمجھی جاتی ہیں۔ اُن کا کلام ''دیوانِ امتیاز'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں غزلیں، قصائد، مسدسات، رباعیات اور مثنویاں شامل ہیں۔ اُن کی شاعری دکنی لہجے کی مہک لیے ہوئے ہے اور

عشقیہ وصوفیانہ موضوعات پر مشتمل ہے۔نمونہ کلام:

جنوں کے شاہ نے جب سے لیا ہے قلعہ دل کو
یہ ملک عقل ویراں ہوگیا کس کس خرابی سے
پند سے ناصح کے دوزخ کا مجھے کچھ خوف نہیں
مغفرت بے شک ہوئی جس کا علی والی ہوا
عشق کے گھاٹ پر سنبھل کر چڑھ
کیوں کہ اوس کا چڑھاؤ مشکل ہے
ہے دل عشاق تیرے جام و مینا بن خراب
رحم کر اس وقت پر ساقی پیالہ دے شتاب

ماہ لقاء بائی چندا: 1824-1768 تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا کی ہمعصر تھیں۔اصل نام چندا بی بی تھا۔اُن کا دیوان گلزارِ ماہ لقا1324ھ مطابق 1906 میں نظام المطابع ،حیدر آباد، دکن سے شائع ہوا۔شفقت رضوی نے بھی ''دیوانِ مہ لقا بائی چندا'' مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا ہے۔ ماہ لقا چندا بائی اُردو کی دوسری صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔وہ مشاعروں میں شرکت کرنے والی پہلی خاتون شاعرہ بھی سمجھی جاتی ہیں۔ان کی غزلیں گل، بلبل، ساقی جیسے روایتی موضوعات پر ہیں، جو دکنی اُردو کی فارسی سے متاثر تبدیلی کی عکاسی کرتی ہیں۔ابتدا میں انھیں پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ سمجھا جاتا تھا،مگر دیوانِ امتیاز کی دریافت کے بعد امتیاز کو ترجیح دی گئی۔وہ سلطنت آصفیہ سے وابستہ ایک مشہور طوائف تھیں۔اپنے کلام کی اصلاح استاد شیر محمد خان ایمان سے لیتی تھیں۔اُن کی فرمائش پر ہی دکن کی ایک تاریخ ''تاریخ دِل افراز'' مرتب ہوئی تھی۔ ارسطو جاہ کے حکم سے ان کا دیوان مرتب ہوا تھا۔ذیل میں اُن کا نمونہ کلام ملاحظہ ہے:

گر مرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم
کھول دے بند ہتھیلی کو دکھا ہاتھوں کو
تیر و تلوار سے بڑھ کر ہے تری ترچھی نگہ
سیکڑوں عاشقوں کا خون کیے بیٹھی ہے
بجز حق کے نہیں ہے غیر سے ہرگز توقع کچھ
مگر دنیا کے لوگوں میں مجھے ہے پیار سے مطلب

اُردو کے نامور محقق اور دکنیات کے ماہر نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اُردو'' میں جن دکنی شاعرات کا ذکر کیا ہے اُن کے نام ہیں۔ ماہ لقاء بائی چندا،شرف النساء بیگم،صغرا بیگم ہمایو مرزا،رحمت بیگم اسی انیسہ بیگم شیروانی،صغرا بیگم حیا، رابعہ بیگم رابعہ، سارہ بیگم سارہ ،بشیر النساء بیگم بشیر، منظور فاطمہ بیگم، قیصری بیگم، احمد النساء بیگم،نوشابہ خاتون،لطیف النساء بیگم،صفیہ بیگم قمر،وحیدہ نسیم ،سعیدہ مظہر، شیل بالا صاحب، مسز برکت رائے نذیر ناہید، رفعت راحت، تہنت النساء بیگم النساء بیگم روحی ، بانو طاہرہ اور نازنین بیگم ناز۔ یہ وہ نام ہیں جن کی وجہ سے اُردو میں نسوانی شاعری کا سلسلہ چل پڑا۔ اِن شاعرات نے اُردو میں ایک نئی روایت شروع کی۔ جہاں عورت کو موضوع بنایا جاتا تھا وہیں اِن شاعرات نے اپنی آواز میں شاعری کی اور حقیقی آواز میں عورت کے جذبات، احساسات اور نفسیات کو عوامی سطح پر پیش کرنے کا کام کیا۔

جب ہم ترقی پسند تحریک کے دور پر نظر دوڑاتے ہیں تو اِس دوران بہت کم خواتین شاعرات کا تذکرہ ملتا ہے۔حجاب امداد حسین، صفیہ اختر اور رشیدہ اختر وغیرہ اِس دور سے وابستہ ہیں۔ یہ شاعرات بھی زیادہ تر رومانی اور ترقی پسند نعروں تک ہی محدود رہیں۔

ریختی یا بارہ ماسہ کے ذریعے بھی اگرچہ مرد شعرا نے عورت کے جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر اُس کا دائرہ موضوع محدود تھا۔حالی نے ایک نظم ''بیوہ'' لکھ کر بیوہ عورتوں کے دُکھ درد، احساسات و جذبات اور سماج میں جن مسائل سے وہ دوچار ہوتی ہیں اُس کی بہترین عکاسی کی۔جب ہم ترقی پسند تحریک کے دور پر نظر دوڑاتے ہیں تو اِس دوران بہت کم خواتین شاعرات کا تذکرہ ملتا ہے۔حجاب امداد حسین، صفیہ اختر اور رشیدہ اختر وغیرہ اِس دور سے وابستہ ہیں۔ یہ شاعرات بھی زیادہ تر رومانی اور ترقی پسند نعروں تک ہی محدود رہیں۔

تقسیم کے بعد

1947 کی تقسیم نے لاکھوں خواتین کو گھر، خاندان اور عزت سے محروم کیا۔اس درد نے انھیں لکھنے پر مجبور کیا۔ بہت سی شاعرات ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان اور کچھ دُنیا کے دیگر ممالک میں بس گئیں مگر جڑوں سے کٹنے کے بعد بھی اُنھوں نے اپنے کلام کے ذریعے یادِ ماضی کو کسی نہ کسی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِس ضمن میں چند شاعرات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔جن میں ادا جعفری، زہرہ نگاہ، داراب بانو وفا، بیگم ممتاز مرزا، حمیرہ رحمان، ساجدہ زیدی، سارہ شگفتہ، عادلہ زار، کشور ناہید، فہمیدہ یاض، پروین شاکر اور نصرت جبیں جیسے نام اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

ادا جعفری 2015-1924: جدید شعر و ادب کے معماروں میں ادا جعفری ایک امتیازی مقام کی مالک ہیں۔بعض ناقدین نے اُن کو اُردو شاعری کی خاتون اوّل بھی کہا ہے کیونکہ اُن کی شاعری نے بیسویں صدی کی وسطی دہائیوں میں بہ اعتبار رہنمائی اور اثر پذیری سے اُردو کی خاتون شعرا کے حق میں وہی کردار ادا کیا جو اٹھارہویں صدی میں ولی دکنی نے عام شعرا کے حق میں ادا کیا تھا۔اُنھوں نے اپنے بعد آنے والی شاعرات کشور ناہید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کے لیے شاعری کا وہ راستہ ہموار کیا جس پر چل کر اُن لوگوں نے اُردو میں خواتین کی شاعری کو عالمی معیارات تک پہنچایا۔

ادا جعفری کا اصل نام عزیز جہاں تھا، شادی کے بعد انھوں نے ادا جعفری کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ وہ 1924 میں بدایوں کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئیں۔اُن کی ابتدائی غزلیں اور نظمیں 1940 کے آس پاس اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' کے علاوہ اُس وقت کے معیاری ادبی رسالوں ''شاہکار'' اور ''ادب لطیف'' وغیرہ میں شائع ہونے لگیں اور ادبی دنیا اُن کے نام سے متعارف ہوگئی۔ اُس وقت بھی اُن کی شاعری میں عام نسائی شاعری سے انحراف موجود تھا۔اُن سے پہلے کی شاعرات نے فکری یا ہیئتی اجتہاد کا حوصلہ نہیں دکھایا تھا۔وہ محض ایک جدید یا نسوانی لہجہ کی شاعرہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے تخلیقی عمل میں اپنے ماحول اور گردو پیش سے غافل نہیں رہیں ان کی نظمیں ان کے سیاسی اور معاشرتی شعور کی عکاس ہیں۔ان نظموں میں دردمندی اور حب الوطنی نمایاں ہے۔جبکہ غزلوں میں تازگی، شعور کی پختگی اور فن پر مضبوط گرفت نمایاں ہے۔ وہ ذاتی اور نجی مسائل کو مجموعی انسانی مسائل کے ایک پرتو کے طور پر دیکھتی ہیں۔ان کی شاعری شخصی سے زیادہ سماجی ہے۔ اُن کی آواز میں رنج و الم، خواب و حقیقت، نشاط و

مسرت، کی ایک اپنی دنیا بھی ہے وہ ہر پیرایہ اظہار میں سرتاسر شاعرہ رہی ہیں زندگی کے اثبات کا احساس اور خوابوں کو حقائق کے آئینہ میں سنوارنے کا طور ادا جعفری کا طور ہے اور اُن کا فن نئی اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اُن کے شعری مجموعے ''غزالاں تم تو واقف ہو، شہر درد، حرف شناسائی، سازِ سخن، غزل نما وغیرہ اہم ہیں۔ اُن کی خودنوشت'' جو رہی سو بے خبری رہی'' نے بھی ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی حاصل کی۔

نمونہ کلام

بڑے تاباں بڑے روشن ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
سحر کی راہ تکنا تا سحر آساں نہیں ہوتا
میں آندھیوں کے پاس تلاش صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا
ہمارے شہر کے لوگوں کا اب احوال اتنا ہے
کبھی اخبار پڑھ لینا کبھی اخبار ہو جانا

سنہری دور: نسوانی شاعری کا سب سے بہترین دور ستر اور اسّی کی دہائیاں ہیں۔ اس دوران خواتین شاعرات کی کثیر تعداد اُبھر کر سامنے آتی ہے جنھوں نے پرجوش اور بے باک انداز میں نسوانی معاملات، جذبات، احساسات، افکار و نظریات کو اپنے کلام کے ذریعے پیش کیا۔ اس عہد میں جو اہم شاعرات اُبھر کر سامنے آئیں اُن میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، زاہدہ زیدی، ترنم ریاض، شفق فاطمہ شعریٰ، بلقیس ظفر الحسن وغیرہ اہم ہیں۔

جموں و کشمیر میں اُردو نسوانی شاعری:

اگر ہم جموں و کشمیر کی بات کریں تو یہاں لل دید اور حبہ خاتون جیسی عظیم شاعرات نے جس نسوانی شاعری کی بنیاد ڈالی تھی اُردو میں اُس روایت کو آگے لے جانے میں روپ کنور کماری، روپا بھوانی، ترنم ریاض، سنیتا رینا، سنتوش شاہ نادان، فوزیہ مغل، شمع بھلیسی، رخسانہ جبین وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔ آج بھی کچھ نئی لڑکیاں لکھ رہی ہیں جو اپنی شعوری کاوشوں سے نہ صرف دبستانِ جموں و کشمیر کو رونق بخش رہی ہیں بلکہ اُردو شاعری کی روایت میں بھی اپنا حق ادا کر رہی ہیں۔ بعض شاعرات مشاعروں کی رونق بننے کے ساتھ ساتھ شعر فہمی، شعر شناسی اور شعر گوئی میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ جموں و کشمیر کی شاعرات میں سب سے نمایاں مقام ترنم ریاض کو حاصل ہوا۔

جموں و کشمیر کی ادبی تاریخ میں نسوانی شاعری کی روایت نہ صرف صوفیانہ جذبے اور رومانی لہجے کی عکاس ہے بلکہ وادی کی درد بھری جدوجہد، ہجرت، تنہائی اور عورت کی نفسیاتی گہرائیوں کی بھی گواہی دیتی ہے۔ یہاں کی شاعرات نے اُردو، کشمیری اور ہندی کے امتزاج میں کلام کہا، جو پہاڑوں کی خاموشی، چناروں کی نوسٹلجیا اور خون آلود نہروں کی داستان کو شاعرانہ لہجے میں بیان کرتا ہے۔ روپ کنور کماری جیسی قدیم آوازیں مذہبی عقیدت کی علامت ہیں، ترنم ریاض جیسی جدید شاعرہ سماجی مسائل کی بے باک ترجمان، جبکہ سنیتا رینا جیسی معاصر شاعرہ ہجرت اور وادی کی جدائی کو دلچسپ غزل کی صورت میں پیش کرتی ہیں اور شمع بھلیسی نے اپنی غزلوں کے ذریعے عورت کی عظمت اور تقدس کو پیش کیا ہے۔

روپ کنور کماری ایک کشمیری پنڈت خاتون تھیں۔ جو بچپن سے ہی رسولؐ و آل رسولؐ کی محبت و عقیدت میں سرشار تھیں۔ عصر حاضر کے محقق تقی عابدی کے مطابق روپ کماری نے سولہ سال کی عمر میں شاعری کرنا شروع کی۔ اُن کے کلام کی اصلاح کرنے والے دو عظیم شعرا تھے۔ فضل رسول فضل اور نجم آفندی۔ انھوں نے روپ کماری کو ''کنیز فاطمہ زہراؑ'' کا خطاب دیا۔ روپ کنور کماری نے مرثیہ، نعت، منقبت اور سلام لکھے ہیں۔ جو کہ اعلیٰ پائے کے ہیں۔ روپ کماری کے مرثیوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، فضائل و مصائب اور بین سب کچھ ہے۔ اُن کے ہر مرثیہ میں فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ روپ کماری نے ایک سو باون بند کا مرثیہ حضرت عباسؓ کے حال میں کہا ہے۔ مرثیہ کے آغاز میں عشق مجازی کا ذکر کر کے حضرت عباس کی محبت اور وفا کا تذکرہ کیا ہے اور بعد میں اُن کی شہادت پُرسوز انداز میں بیان کی ہے۔ ایک بند مذکور مرثیہ سے بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے:

لکھ رہی ہوں میں حقیقت میں مجازی کا جو حال
یہ بلا جانِ حزیں کے لیے ہردم ہے وبال
اختلاجِ دلِ مضطر ہے محبت کا مآل
ہوں بیانِ عشق حقیقی کا ہے دشوار و محال
سچ تو یہ ہے راہِ تسلیم و رضا مشکل ہے
سہل ہے عشق بشر عشق خدا مشکل ہے

تقی عابدی نے روپ کماری کا کلام جمع کیا اور 2006 میں اس کتاب کو چھپوایا۔ جس کا نام اُنھوں نے ''روپ کنور کماری: شخصیت فن اور مجموعہ کلام'' رکھا۔ تقی عابدی نے بطورِ سند کئی سلام و مراثی بخطِ روپ کنور کماری پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مکتوب فضل رسول فضل، اور قلمی نسخہ مع اصلاح بھی شامل کیا ہے۔

رخسانہ جبیں یکم مئی 1955 سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار آزادی کے بعد اُبھرنے والی اہم شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور منفرد لب و لہجے کی شاعرہ ہیں۔ کشمیر کا سیاسی منظر نامہ، پاکستانی حملے اور جموں کشمیر کے آدھے سے زیادہ حصہ قبضہ کرنے کے بعد کے نتائج اور برصغیر کی سیاست کے مختلف رنگ اُن کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ کشمیر کی سیاسی کشمکش اور مادر وطن سے ہمدردی اُن کے کلام میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ نمونہ کلام:

یہ ہماری زمیں وہ تمہاری زمیں
سرحدیں کھا گئی ہیں یہ ساری زمیں
تیری خاطر ہی کٹوائے سر بے شمار
قیمت ایسی چکادی ہے بھاری زمیں
غیر کوئی قدم رکھ نہ پائے یہاں
ندیاں خوں کی کردیں جاری زمیں

یا ان کے یہ دو شعر بطورِ خاص جن میں عورت کا تقدس اور ماں کی عظمت فن کارانہ طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ رخسانہ جبیں کے یہ دونوں شعر آفاقیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

میں پھوٹی اُس کی پسلی سے تو ٹیڑھی
وہ سیدھا تیر جیسا میں کماں ہوں
یہ دُنیا دار بچے جانتے ہیں
مرے قدموں میں جنت ہے کہ ماں ہوں

ترنم ریاض 1960-2021 اصل نام فریدہ ترنم۔ 19 اگست 1960 کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ پروفیسر ریاض پنجابی سے شادی کرنے کے بعد ''ترنم ریاض'' کا تخلص اختیار کیا۔ وہ افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں کشمیری معاشرے کی عکاسی، عورت کی مظلومیت، جنگ کے زخم اور نفسیاتی بصیرت جھلکتی ہے۔ ان کے شعری مجموعے جیسے ''پرانی کتابوں کی خوشبو، بھادوں کے چاند تلے اور ''زیر سبزہ محوخواب'' میں نسائی مسائل اور انسانی کرب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کی شاعری متصوفانہ رنگ اور سماجی احتجاج سے بھی بھری ہے۔ 20 مئی 2021 میں اُن کی وفات ہوئی۔ وہ کشمیر کی جدید نسوانی ادب کی ایک روشن ستارہ مانی جاتی ہیں۔ اُن کی شعری کائنات مناظر فطرت سے لے کر انسانی مسائل اور انسانی رشتوں کی گوناگوں کیفیات کی

فنکارانہ تجسیم سے وابستہ ہے۔لیکن اس عمل میں نہ تو وہ موضوعات کی میزان سازی کرتی ہیں اور نہ ہی کوئی اشتہاری اعلان نامہ تیار کرتی ہیں اُن کی نظمیں اور غزلیں اپنے متنوع دائرۂ کار میں انسانی ردِعمل کی انتہائی نرم ونازک مثال ہیں۔نمونہ کلام:

وہ پتھر دِل مجھے محفل میں ہنستے دیکھ حیراں تھا
میں دانستہ ہی رکھ آئی تھی اُس دِن اپنے گھر آنسو
ہوا تھی ایسی عنصیلی کہ بادل لے اُڑی سارے
یہ غم سہنے میں سوکھے ہیں زمیں کے کِس قدر آنسو
شب تنہائی میں نظر آتا ہے تجھ میں عکس یہ کس کا
مری آنکھوں میں رہتا ہے تو میری فکر کر آنسو

سنیتا رینا: جموں وکشمیر کی نسوانی شاعری کی معاصر آواز ہیں، جو ہجرت، وادی کی جدائی اور کشمیر کی خوبصورتی کو غزل اور نظم میں سمیٹتی ہیں۔اُن کا تعلق کشمیری پنڈت خاندان سے ہے، اور وہ اُردو، کشمیری دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔اُن کا شعری مجموعہ ''آنسوؤں کے چناب'' 2017 میں چھپ کر ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اُن کی شاعری میں ماضی کا کرب اور درد کی آمیزش ہے جو 90-1989 کشمیری ہندوؤں کی ہجرت کے زخموں کو زندہ کرتی ہے۔اُن کی غزلیں مشاعروں میں ہی نہیں ادبی حلقوں میں بھی مقبول ہیں اس لیے کہ وہ کشمیر کی مشترکہ تہذیب کی آخری جھلکیوں کو بیان کرتی ہیں۔اُن کا کلام سادگی اور گہرائی کا امتزاج ہے، جو پروین شاکر کی یاد دلاتی ہے۔اُن کی شاعری میں غمِ ذات غالب ہے البتہ کہیں کہیں یہ غمِ جہاں میں ڈھل جاتا ہے۔وہ گھریلو، سماجی اور سیاسی حالات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔جائے پیدائش سے بچھڑنے کا غم، دوست واحباب سے جدائی، زندگی کی پراگندگی، انجان نگروں میں اجنبی چہروں سے محاسبہ، احساس بے گھری، جلاوطنی، شہروں کی بھیڑ میں جان لیوا اکیلا پن اور رشتوں کی شکست وریخت جیسے موضوعات سنیتا رینا کی شاعری میں آہ وفغاں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔نمونہ کلام:

سلسلہ یادوں کا اکثر توڑ جاتی ہے ہوا
میرے دروازے پہ دستک چھوڑ جاتی ہے ہوا
تیرے سانسوں کی مہک تیرے تبسم کی بہار
کتنے رشتے غم سے میرے جوڑ جاتی ہے ہوا
آنکھوں کو اشک دِل کو وہی درد دے گیا
دِل جس کی دوستی کا بڑا طلب گار تھا

اُردو کی نسوانی شاعری محض ادبی روایت نہیں، ایک زندہ تحریک ہے۔ اس نے عورت کو موضوع سے شاعر بنایا، خاموشی سے آواز بنایا، اور درد سے طاقت بنایا۔ جب تک معاشرے میں عورت ہے یہ شاعری جاری رہے گی۔

سورن ریکھا کوتوال المعروف شمع بھلیسی 1972 میں جموں کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کے ایک زرخیز علاقے بھلیسہ میں پیدا ہوئی اُن کے شعری مجموعے ریشمی، الفاظِ غزل، ہواؤں کا آنچل اور مہکتی وادیکا شائع ہو چکے ہیں۔اُن کا ایک مجموعہ ''دوستی'' ابھی زیر تالیف ہے۔ اُن کا کلام عصر حاضر کی شاعرات میں منفرد درجہ رکھتا ہے۔وہ سنجیدہ شاعری کرتی ہیں۔اُن کا لب ولہجہ اور اسلوب جدید تقاضوں کے عین موافق ہے۔وہ اپنے اظہار خیالات کے لیے اُردو ہندی دونوں رسم الخط کو استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اُردو سے زیادہ ہندی کے ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔حالانکہ اُن کی زبان ششتہ اُردو ہوتی ہے۔اُن کے موضوعات معاملات عشق کے علاوہ عورت کا تقدس، سیاسی وسماجی مسائل اور آپسی بھائی چارہ کی اپیل زیادہ تر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ذیل میں اُن کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں:

سپارہ پاک ہوں اک میں خدا کی پاک آیت ہوں
بلا کی خوبصورت ہوں میں عورت ہوں میں عورت ہوں
میں تتلی کی شرارت ہوں گلوں کی میں نظارت ہوں
خدا کی بخشی نعمت ہوں زمیں کی ایک جنت ہوں
بہو ہوں میں کہیں پر ماں، کہیں پر ہوں بہن بیٹی
میں شفقت ایک گھر، دوسرے کی کرتی خدمت ہوں

اُردو کی شاعرات نے جس انداز سے روایت، جدت اور عصریت کے گوناگوں پہلوؤں کو اپنے کلام کے ذریعے پیش کیا وہ واقعی قابل تعریف ہے۔اِن میں سے بعض نے بدلتی ہوئی دنیا اور اس کے سماجی وجذباتی تقاضوں کو اپنی روایت کے مثبت اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔بعض ایسی شاعرات بھی ہیں جنھوں نے تہذیب کی شائستگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ شائستگی، دلآویزی اور صدا آفرینی کی مرکب خصوصیت ان کے شعری اور تخلیقی جوہر کو منفرد بناتی ہے۔ یہ شاعرات شعور وکیفیت کے اک نئے سلسلہ کو پیش کرتی ہیں۔احتجاج کی راہوں میں بڑھتے ہوئے بھی وہ ہوا کی ان خوشبوؤں کی اسیر رہی ہیں جن میں موسم بہار کے پھولوں کی مہک باقی ہے۔ اِن شاعرات نے انسان کی بعض ایسی نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی نقاب کشائی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہیں تھا۔ اس کے ساتھ انھوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانوں کے مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔یہ شاعرات معیاراتِ فکر سے زیادہ نجی تجربے سے حاصل کیے گئے شعور پر بھروسہ کرتی ہیں۔شخصیت کی کلیت اور سالمیت کے ساتھ ساتھ احساس کی نزاکت اور اس میں دکھ کی دھیمی دھیمی آنچ نسوانی شاعری کی انفرادیت ہے۔

اُردو کی نسوانی شاعری محض ادبی روایت نہیں، ایک زندہ تحریک ہے۔اس نے عورت کو موضوع سے شاعر بنایا، خاموشی سے آواز بنایا، اور درد سے طاقت بنایا۔ جب تک معاشرے میں عورت ہے۔یہ شاعری جاری رہے گی، کیونکہ اب قلم عورت کے ہاتھ میں ہے اور وہ جان چکی ہے کہ۔''میں خاموش نہیں، میری خاموشی بھی ایک شور ہے''۔

یہ روایت نہ صرف اُردو ادب کی سب سے خوبصورت اور طاقتور روایت ہے بلکہ برصغیر اور خاص کر ہندستانی معاشرے میں تبدیلی کی سب سے بڑی امید بھی ہے۔

ابھی روشن ہوا جاتا ہے رستہ
وہ دیکھو ایک عورت آرہی ہے

مآخذ ومصادر

نصیرالدین ہاشمی: دکن میں اُردو
ڈاکٹر سلیم اختر: اردو شاعری میں عورت کی آواز
فاطمہ حسن: پاکستانی خواتین شاعرات: ایک جائزہ
ڈاکٹر عارفہ سیدہ: اردو نسوانی شاعری: تاریخ وتنقید
تنزیلہ خان: نئی نسوانی شاعری اور سوشل میڈیا: تحقیقی مقالہ
سنبل نگار: اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ

Vijay Kumar
Research Scholar
Deptt. of Urdu
University of Jammu, Jammu - 180006
Mob. 7889315716
Email: dharvijay1994@gmail.com



صدام حسین



مرزا محمد رفیع سودا

کا قصیدہ ''تضحیکِ روزگار''

ایک مطالعہ

اردو ادب میں ہجو گوئی کو محض دشنام طرازی یا ذاتیات پر حملے کے بجائے ایک فن پارہ اور سماجی احتجاج کی صورت دینے کا سہرا مرزا محمد رفیع سودا کے سر ہے۔ سودا ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جب مغلیہ سلطنت اپنی تابناک تاریخ کے آخری اور تاریک ترین مراحل سے گزر رہی تھی۔ دہلی کا تخت و تاج مرکزیت کھو چکا تھا اور ہر طرف انتشار، بے یقینی اور زوال کی دھول اڑ رہی تھی۔ ایسے میں سودا نے اپنے قلم کو ایک نشتر کے طور پر استعمال کیا اور سماج کے ان ناسوروں کو بے نقاب کیا جو سلطنت کو اندر سے چاٹ رہے تھے۔ ان کا قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' جسے ''قصیدہ در ہجوِ اسپ'' بھی کہا جاتا ہے، اردو کی ہجو یہ شاعری کا وہ ہمالہ ہے جس کی بلندی تک پہنچنا پھر کسی دوسرے شاعر کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ یہ قصیدہ بظاہر ایک لاغر گھوڑے کی ہجو ہے، لیکن حقیقت میں یہ اس دور کے مغل نظام، عسکری ڈھانچے اور معاشرتی انحطاط کا ایک بھرپور رزمیہ ہے۔

اس مقالے کے مطالعے کے لیے سب سے پہلے اس عہد کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا شکار تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کی کمر توڑ دی تھی، جب کہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی شورش نے مغل نظم و ضبط کو مفلوج کر دیا تھا۔ سودا نے اس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ گہرا طنز ملتا ہے جو صرف تفریح کے لیے نہیں بلکہ ایک تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ قصیدے کا عنوان ہی ''تضحیکِ روزگار'' (زمانے کا مذاق) اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کا ہدف صرف ایک جانور نہیں بلکہ وہ پورا عہد ہے جو تماشہ بن چکا تھا۔

قصیدے کا آغاز ایک کائناتی تغیر کے استعارے سے ہوتا ہے۔ سودا زمانے کو ایک ایسے سوار کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کے ہاتھ میں لگام نہیں رہی۔

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بہ یک قرار

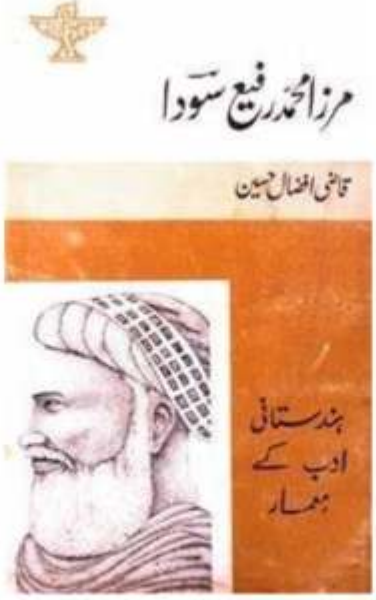
یہاں ''ابلق'' (سیاہ و سفید) کے ذریعے زمانے کی بے ثباتی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سودا کا یہ کہنا کہ ''دستِ عناں'' (لگام والا ہاتھ) ایک جگہ قائم نہیں ہے، دراصل اس مرکزیت کے خاتمے کا اعلان ہے جو مغلوں کا طرہ امتیاز رہی تھی۔ جب مرکز کمزور ہوتا ہے تو پورا انظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سودا اس سیاسی انتشار کو معاشی زوال سے جوڑتے ہیں۔ وہ ماضی کے ان سنہرے ایام کو یاد کرتے ہیں جب امرا کے طویلے بہترین عربی اور عراقی گھوڑوں سے بھرے ہوتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مغلوں کی عسکری قوت گھوڑوں کی کثرت اور معیار سے پہچانی جاتی تھی۔

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

لیکن حالات نے ایسی پلٹی کھائی کہ وہ امرا جو کبھی سخاوت کے دریا بہاتے تھے، اب مفلسی کی اس منزل پر منزل چکے ہیں کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی ترستے ہیں۔ سودا نے اس طبقاتی زوال کو جس شدت سے بیان کیا ہے، وہ پڑھنے والے کو اس دور کی سنگینی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہی لوگ جن کی سواریاں زمین پر نہیں ٹھہرتی تھیں، اب موچی سے جوتا گٹھانے کے لیے بھی ادھار کے طالب ہیں۔

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

یہاں شاعر نے صرف غربت کو نہیں دکھایا بلکہ اس ''خست'' (کنجوسی و تنگدستی) کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس نے انسانی اخلاق اور غیرت کو ملیا میٹ کر دیا



تھا۔ جب انسان معاشی طور پر ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اپنی عزتِ نفس (ننگ و عار) کو بھی کھو دیتا ہے۔ سودا کہتے ہیں کہ یہ خرابی محض ایک فرد تک محدود نہیں بلکہ پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ وہ اپنے ایک 'مہربان' کا ذکر کرتے ہیں جو بظاہر تو منصب دار ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ سو روپے کی معمولی تنخواہ کے لیے اپنی خودداری بیچ چکے ہیں۔ یہ اس عہد کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کے معاشی زوال کا وہ نوحہ ہے جسے سودا نے طنز کے لبادے میں پیش کیا ہے۔

قصیدے کا اصل علامتی سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب سودا مغلوں کی فوجی طاقت کی علامت یعنی ''گھوڑے'' کا تعارف کرواتے ہیں۔ یہ گھوڑا اس عہد کی مغل فوج کا کامل استعارہ ہے۔ جس طرح مغل فوج بظاہر موجود تھی مگر اس میں لڑنے کی سکت ختم ہو چکی تھی، اسی طرح یہ گھوڑا بھی صرف نام کا گھوڑا تھا۔ اس کی بدحالی کا نقشہ سودا نے جس مبالغہ آمیز فنکاری سے کھینچا ہے، وہ اردو شاعری میں بے مثال ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس گھوڑے کے پاس نہ دانہ ہے، نہ گھاس اور نہ ہی اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی سئیس موجود ہے۔

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیار و نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ایک حقیقی گھوڑے کو ''اسپ گلی'' (مٹی کے کھلونے والا گھوڑا) قرار دینا اس عہد کی عسکری طاقت کے کھوکھلے پن کی بہترین علامت ہے۔ جس طرح بچہ مٹی کے گھوڑے سے کھیلتا ہے مگر وہ دوڑ نہیں سکتا، اسی طرح مغل شاہزادوں اور منصب داروں کے گھوڑے اب صرف نمائشی رہ گئے تھے۔ ان کی جسمانی لاغری اور فاقہ کشی کا یہ عالم ہے کہ شاعر ان کے فاقوں کو شمار کرنے سے قاصر ہے۔ مبالغہ آرائی جب انتہا کو پہنچتی ہے تو سودا اسے ''نقشِ نعل'' سے تشبیہ دیتے ہیں، یعنی وہ گھوڑا جو زمین پر لگے کھر کے نشان کی طرح جم چکا ہے اور جس میں اٹھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی۔

اس قصیدے کا فنی عروج سودا کی وہ 'تخیلی پرواز' ہے جہاں وہ مبالغہ آرائی کو ایک نئی منطق عطا کرتے ہیں۔ سودا کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک انتہائی کریہہ اور بدحال منظر کو بھی لفظی شوکت اور نادر تشبیہات کے ذریعے ایک شاہکار بنا دیتے ہیں۔ جب وہ گھوڑے کی بھوک اور ناتوانی کا ذکر کرتے ہیں، تو بات زمین سے اٹھ کر آسمان تک جا پہنچتی ہے۔ بھوک کی شدت میں حواس کا مختل ہو جانا ایک انسانی صفت ہے، مگر سودا نے اسے گھوڑے پر اس طرح منطبق کیا ہے کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا رات کے وقت آسمان کے ستاروں کو دانہ سمجھ کر بے قرار ہوتا ہے اور دن کے وقت سورج کی کرنوں کو گھاس کا گچھا جان کر زمین پر خود کو پٹکتا ہے۔

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دن زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

> سودا کا ذاتی تجربہ اس قصیدے میں اس وقت شامل ہوتا ہے جب وہ کسی کام سے جانے کے لیے اسی 'نابکار اسپ' کو ادھار مانگتے ہیں۔ یہاں سے قصیدہ ایک 'داستانی رنگ' اختیار کر لیتا ہے۔ گھوڑے کا مالک بظاہر تو بڑی لفاظی اور سخاوت سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار''، لیکن فوراً ہی اس کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے کہ یہ سواری کے قابل نہیں ہے۔ یہ تضاد دراصل مغلوں کی اس 'کھوکھلی تہذیب' کا آئینہ دار ہے جہاں زبان پر لفاظی اور خوشامد کا غلبہ تھا مگر عمل کے میدان میں ہاتھ خالی تھے۔

یہ اشعار صرف مبالغہ نہیں ہیں بلکہ اس 'خلا' (Vacuum) کی نشاندہی کرتے ہیں جو مغل معاشرت میں پیدا ہو چکا تھا۔ جب زمین پر وسائل ختم ہو جائیں تو نظریں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں، مگر وہاں بھی صرف 'خلا' ہی ملتا ہے۔ سودا نے گھوڑے کی بیماری اور نحوست کو بیان کرنے کے لیے 'اگن باذ' اور 'بادِ سموم' جیسی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ گھوڑا جس طرف سے گزر جائے، وہاں کی نسیم (خوشگوار ہوا) بھی زہریلی ہو جاتی ہے۔ یہ دراصل اس سیاسی نحوست کا بیان ہے جس نے دہلی کے چمن کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

قصیدے کا ایک اور دلچسپ اور فکر انگیز پہلو وہ ہے جہاں یہ گھوڑا اپنی 'حیواناتی شناخت' بھی کھو دیتا ہے۔ سودا نے دکھایا ہے کہ جب زوال اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو اشیا کے نام اور ان کی حقیقت میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ بازار کے عام لوگ، جو کبھی شاہی سواریوں کو رشک سے دیکھتے تھے، اب اس گھوڑے کو دیکھ کر دعائیں مانگتے ہیں کہ اسے کسی 'موذی' کے چنگل سے نجات ملے۔ یہاں طنز کا رخ ان حکمرانوں کی طرف ہے جنھوں نے فوج کو اس حال تک پہنچایا۔

سودا نے اس مضحکہ خیز صورتحال کو مزید گہرا کرنے کے لیے مختلف جانوروں سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ کہیں اسے 'بزکوہی' (پہاڑی بکری) کہا گیا، کہیں 'ولایت کا حمار' (غیر ملکی گدھا) اور کہیں اس کی گردن کے بالوں کی وجہ سے اسے 'خرس' (ریچھ) سے تشبیہ دی گئی۔

صورت کا جس کی دیکھنا ہے گورخر کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ہے سگِ خشم گیں کو عار

یہاں سودا نے اخلاقی زوال کو جسمانی بدصورتی سے جوڑا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس کی سیرت ایسی ہے کہ کتا بھی اس سے نفرت کرے اور صورت ایسی کہ گدھا بھی شرما جائے۔ یہ محض گالی نہیں بلکہ اس عہد کے منصب داروں کی اس 'بے عملی' پر ضرب ہے جس نے انھیں معاشرے کی نظر میں بے وقعت کر دیا تھا۔ بچوں کا اسے ریچھ سمجھ کر 'نوچندا اتوار' کی رسم کے لیے پیسہ دینا، طنز کی ایک ایسی کاٹ ہے جو دل کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔ ایک جنگی گھوڑا، جو میدانِ کارزار کا شہسوار ہونا چاہیے تھا، اب گلی کوچوں میں بچوں کا کھلونا اور توہم پرستی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

سودا کا ذاتی تجربہ اس قصیدے میں اس وقت شامل ہوتا ہے جب وہ کسی کام سے جانے کے لیے اسی 'نابکار اسپ' کو ادھار مانگتے ہیں۔ یہاں سے قصیدہ ایک 'داستانی رنگ' اختیار کر لیتا ہے۔ گھوڑے کا مالک بظاہر تو بڑی لفاظی اور سخاوت سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار''، لیکن فوراً ہی اس کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے کہ یہ سواری کے قابل نہیں ہے۔ یہ تضاد دراصل مغلوں کی اس 'کھوکھلی تہذیب' کا آئینہ دار ہے جہاں زبان پر لفاظی اور خوشامد کا غلبہ تھا مگر عمل کے میدان میں ہاتھ خالی تھے۔

گھوڑے کی سستی اور کاہلی کا حال یہ ہے کہ برات میں سوار ہونے والا دولہا جب دلہن کے گھر پہنچتا ہے تو وہ جوان سے بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ زمانی مبالغہ (Temporal Hyperbole) اس جمود کو ظاہر کرتا ہے جس نے مغل سلطنت کی ترقی کی رفتار کو روک دیا تھا۔ سودا نے دکھایا ہے کہ جب پورا نظام سست روی کا شکار ہو جائے تو منزل تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ گھوڑا ''مانندِ اسپِ خانۂ شطرنج'' ہے جو دوسروں کے ہاتھ لگائے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ شطرنج کے مہرے کی یہ تشبیہ اس سیاسی بے بسی کی بہترین مثال ہے جہاں دہلی کے حکمران محض مہرے بن کر رہ گئے تھے اور اصل طاقت کی ڈور کہیں اور سے ہلائی جا رہی تھی۔

قصیدے کا تیسرا اور سب سے اہم موڑ وہ ہے جہاں سودا اس گھوڑے کو میدانِ جنگ میں لے جاتے ہیں۔ یہ حصہ محض مزاح نہیں بلکہ ایک المناک تاریخی حقیقت کا بیان ہے، جس میں مغل عسکری طاقت کے جنازے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سودا اس عہد کا ذکر کرتے ہیں جب مرہٹوں کی یلغار دہلی کی دیواروں تک آن پہنچی تھی اور نقیب نے آ کر پکارا تھا کہ اب گھروں میں بیٹھنے کا وقت نہیں بلکہ 'کارزار' کا وقت ہے۔ یہاں شاعر کی ذاتی بے بسی اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب وہ اس 'نابکار' گھوڑے پر زین کستا ہے۔

دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آ کر ہے وقتِ کار

مرہٹوں کا ذکر یہاں محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک گہرا سیاسی اشارہ ہے۔ مرہٹے اس دور میں مغلوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن کر ابھرے تھے اور مغل فوج کی نااہلی کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس نہ تو لڑنے کا جذبہ باقی تھا اور نہ ہی وہ وسائل جو ایک جنگی مہم کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ سودا نے اس جنگی تیاری کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے وہ اس دور کی فوجی بدحالی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک سپاہی کا دونوں ہاتھوں میں چابک پکڑنا، لگام کو دانتوں میں تھامنا اور ایڑیاں مار مار کر اپنے ہی پاؤں زخمی کر لینا، اس جہدِ مسلسل کی علامت ہے جو ایک بے جان اور مردہ نظام میں جان ڈالنے کے لیے کی جا رہی تھی، مگر جس کا نتیجہ صفر تھا۔

گھوڑے کی سستی اور کاہلی جب انتہا کو پہنچتی ہے تو سودا اسے 'کوہسار' (پہاڑ) سے تشبیہ دیتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ یہاں سودا کا طنز اس وقت کمال کو پہنچتا ہے جب وہ عوامی مشوروں کو شامل کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے پاؤں میں پہیے لگا دو، کوئی کہتا ہے کہ اس پر بادبان باندھ دو تا کہ یہ ہوا کے سہارے چل سکے۔ یہ مضحکہ خیز مشورے دراصل اس بات کا اعتراف ہیں کہ یہ نظام اپنی فطری قوت کھو چکا ہے اور اب صرف غیر فطری سہاروں پر زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جنگ کے دوران شاعر کی دعا اس قصیدے کا سب سے کربناک اور طنزیہ پہلو ہے۔ ایک سپاہی عام طور پر فتح کی دعا مانگتا ہے، مگر سودا کی دعا یہ ہے کہ پہلی ہی گولی اس گھوڑے کو لگ جائے تا کہ اسے اس عذاب سے نجات ملے۔

پہلی ہی گولی چھوٹتے اس گھوڑے کو لگے
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن کے پار

یہ دعا دراصل اس 'موت کی تمنا' کا اظہار ہے جو ایک شکست خوردہ معاشرے کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے، جہاں زندگی کی اذیت موت کے خوف سے بڑی ہو جاتی ہے۔ جب دشمن سے سامنا ہوتا ہے، تو مغل سپاہی کی بہادری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی جوتیاں ہاتھ میں لیتا ہے اور گھوڑے کو بغل میں دبا کر بھاگ نکلتا ہے۔ یہ فرار محض ایک فرد کا فرار نہیں، بلکہ اس پوری فوجی اشرافیہ کا فرار ہے جو شاہی القابات اور منصبوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی مگر عملی میدان میں ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔

مقالے کے اختتام پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''تضحیکِ روزگار'' اردو کی ہجو یہ شاعری کا وہ سنگِ میل ہے جس نے ہجو کو صرف گالی گلوچ سے نکال کر ایک ''سیاسی دستاویز'' بنا دیا۔ سودا نے ایک لاغر گھوڑے کے ذریعے مغلوں کی عسکری، معاشی اور اخلاقی پستی کا جو مرقع پیش کیا ہے، وہ تاریخ کی سینکڑوں کتابوں پر بھاری ہے۔ اس قصیدے میں مبالغہ آرائی محض فن دکھانے کے لیے نہیں بلکہ 'زوال کی شدت' کو محسوس کرانے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ سودا نے ہمیں دکھایا کہ جب کسی سلطنت کا مرکزہ (Core) تباہ ہو جاتا ہے، تو اس کے تمام اجزا چاہے وہ سپاہی ہو، بیوروکریسی ہو یا سواری کا گھوڑا سب کے سب تماشہ بن جاتے ہیں۔

سودا کا یہ فن پارہ آج بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ وہ قومیں جو اپنی بنیادی طاقت اور نظم و ضبط کو کھو دیتی ہیں، وہ زمانے کی نظر میں اسی طرح مضحکہ خیز قرار پاتی ہیں جس طرح سودا کا وہ گھوڑا جسے کتے بھی اجنبی سمجھ کر بھونکتے تھے۔ یہ قصیدہ اپنے اسلوب کی شوکت، بیان کی روانی اور طنز کی گہرائی کے باعث اردو ادب کا لازوال شاہکار ہے اور مرزا محمد رفیع سودا کی عظمتِ فن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

سودا کا یہ فن پارہ آج بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ وہ قومیں جو اپنی بنیادی طاقت اور نظم وضبط کو کھو دیتی ہیں، وہ زمانے کی نظر میں اسی طرح مضحکہ خیز قرار پاتی ہیں جس طرح سودا کا وہ گھوڑا جسے کتے بھی اجنبی سمجھ کر بھونکتے تھے۔ یہ قصیدہ اپنے اسلوب کی شوکت، بیان کی روانی اور طنز کی گہرائی کے باعث اردو ادب کا لازوال شاہکار ہے اور مرزا محمد رفیع سودا کی عظمتِ فن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

Saddam Husain
Research Scholar, Department of Urdu
Faculty of Arts
Banaras Hindu University, Varanasi-221005
Mob. 8808792793
Email: saddamnzg538@gmail.com



سید سجاد حسین

تمل ناڈو کا ایک باکمال شاعر

گنڈو عبدالقادر شاکر

محمد عبدالقادر شاکر 1865 کو شہر وانمباڑی کے ایک متمول لبابین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وانمباڑی موجودہ ریاست تمل ناڈو کے ضلع ترپاتور کا ایک تجارتی شہر ہے جو چمڑے کی دباغت کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ شہر مدراس سے تقریباً 185 کلومیٹر کے فاصلے پر مدراس بنگلور شاہراہ پر واقع ہے۔ اردو زبان وادب کے لحاظ سے یہ نہایت زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں زبان وادب کی روایت تقریباً ڈیڑھ صدی پرانی ہے۔

لبابین دراصل مسلمانوں کی وہ نسل ہے جو ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں عرب تاجروں اور مقامی باشندوں کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی۔ روایت ہے کہ جب یہ عرب اپنی اولاد کو پکارتے تھے تو وہ جواباً لبیک کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ خود اس نسلی وحدت کے لیے استعمال ہونے لگا اور عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ زبان زد خاص وعام ہوگیا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ جنوبی ہند مؤلف محمود خان بنگلوری)

لبابین میں یہ عام رواج ہے کہ گھرانوں کے نام آبائی پیشہ یا آبائی وطن پر رکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ شاکر کے جد امجد میسور کے سلاطین کی فوج کے لیے بارود کی گولیاں (تمل مترادف گنڈو) بناتے تھے اور اس طرح ان کے گھرانے کا نام گنڈو کار یا گنڈو پڑ گیا۔ (بحوالہ مثنوی گلزار شاکر) لبابین گھرانے کے کم وبیش تمام افراد تجارت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ وہ دینی علوم ومسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے لیکن شعر وادب میں نسبتاً کم معروف تھے۔ ایسے ماحول میں شاکر نے آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں حاصل کی اور پھر اپنے آبائی پیشہ یعنی چمڑے کی تجارت کے سلسلے میں دور دراز مقامات جیسے ممبئی، دہلی، کانپور، کلکتہ وغیرہ جانے لگے۔ شاعری کا شوق تھا لہٰذا وہاں کی ادبی محفلوں اور شعر پرور فضاؤں نے سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔

شاعری شاکر کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس پر خداداد صلاحیت اور طبیعت کی موزونیت سونے پہ سہاگہ ثابت ہوئی۔ اس دور کی شاید ہی کوئی ایسی صنف سخن ہو جس میں شاکر نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ مثنوی ہو یا غزل، رباعی ہو یا قصیدہ ہر صنف میں شاکر نے لکھا اور خوب لکھا۔

ایک کامیاب تاجر ہونے کے علاوہ وہ ایک باکمال صوفی بھی تھے اور سلسلہ تصوف میں مولانا عبدالوہاب قدس سرہ بانی باقیات الصالحات ویلور کے خلیفہ تھے۔ شاکر نے وانمباڑی میں پالار ندی کے کنارے ایک خانقاہ ''خانقاہ قادریہ'' تعمیر کرائی جہاں وہ دینی تعلیم کے ساتھ اپنے عقیدت مندوں کو تصوف کی اصطلاحات اور اسرار ورموز سے واقف کراتے تھے۔ یہ خانقاہ آج بھی بوسیدہ حالت میں موجود ہے۔

یہ وہ دور تھا جب ملک بھر میں نہ صرف شعر و شاعری کے چرچے تھے بلکہ آئے دن شعری معرکے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان معرکوں میں اساتذہ کرام اور کہنہ مشق شعرا سے لے کر نو واردان بساط ادب تک حصہ لیتے تھے۔ مشاعروں میں بھی اور طرحی غزلوں پر مشتمل ماہناموں میں بھی جو ملک کے مختلف مراکز سے شائع ہوا کرتے تھے شاکر کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ بسلسلہ تجارت جہاں جہاں وہ پہنچتے وہاں کے مشاعروں میں بڑی سرگرمی سے شریک ہوتے تھے۔ اساتذہ اور اہل زبان ان کے کلام کو توجہ سے سنتے تھے۔

شاکر کی ادبی زندگی کا سب سے مشہور واقعہ وہ ہے جو امرتسر میں پیش آیا تھا جہاں قدر بلگرامی نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا اور یہ اعلان کیا کہ جو کوئی بھی ان کے اس شعر:

رخ جاناں پہ یوں خال رخ جاناں کا قبضہ ہے
محافظ جس طرح فلفل بنے کافور کی بوکا

سے بہتر اشعار نظم کرے گا اسے مبلغ 25 روپے کا انعام دیا جائے گا۔ شاکر نے وہاں اپنی 3 غزلیں (تقریباً 52 اشعار) سنائیں اور حاضرین نے بیک زبان نعرہ بلند کیا کہ شاکر اس انعام کا مستحق ہے لیکن قدر بلگرامی مکر گئے اور محفل مشاعرہ سے کافور کی بو بن کر اڑ گئے (گلزار شاکر)

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ شاکر نے سلطان دکن آصف جاہ سادس میر محبوب علی خان کے دربار میں حاضر ہو کر مثنوی گلزار شاکر اور دوسری تصانیف نذر کی تھیں۔ آصف جاہ دکن بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ کیا انعام مانگتے ہو۔ تاجر پیشہ شاکر نے عرض کیا ''دکن بھر میں چمڑے کی تجارت کا اختیار مجھے دے دیا جائے'' سلطان نے جواب دیا کہ یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ میں رعایا سے ان کے حقوق نہیں چھین سکتا''۔ اس کے بعد شاکر نے کوئی اور انعام لینے سے مودبانہ انکار کر دیا۔

''دیوان شاکر'' میں کل 121 غزلیں ہیں اور حروف تہجی کے اعتبار سے تمام ردیفوں پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ شاکر کے ہم وطن وہم عصر شاعر بادشاہ جن سے اکثر ان کی ادبی چشمکیں ہوا کرتی تھیں کا قطعہ تاریخ شامل کتاب ہے۔ تاریخی مصرع ہے:

''دیوان شاکر دلچسپ ہے خوب''

1314ھ

''گلدستہ شاکر'' دوسرا دیوان ہے جس میں 65 غزلیں ہیں اور 4 رباعیاں، جو سلطان دکن کی مدح میں ہیں۔

تحفہ شاکر تیسرا مجموعہ ہے جس میں 36 ایسی غزلیں شامل ہیں جو بڑے بڑے ادبی معرکوں میں سنائی گئیں۔ ہر غزل کے نیچے ایک نوٹ دیا گیا ہے جس میں مقام مشاعرہ، سامعین اور تاثرات شعرا کا اجمالی طور پر ذکر ہے۔ اہم شعرا جن کے آگے شاکر نے اپنی غزلیں پڑھیں ان میں داغ دہلوی اور امیر مینائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ شوکت میرٹھی، مرزا ارشد دہلوی، کیف ٹونکی، ثاقب بدایونی، جلال لکھنوی اور ظہیر دہلوی نے بھی شاکر کے کلام کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ ان کی پذیرائی بھی کی۔

''حدیقہ شاکر'' میں بچوں کے لیے پند و نصائح منظوم کیے گئے ہیں۔ کتاب کے اختتام پر استاد شاکر مولانا یعقوب خان مدہوش (ساکن دہرادون) کی تقریظ شامل ہے۔ کہتے ہیں:

''حق یہ ہے کہ زبان اردو میں یہ کتاب بلحاظ جامعیت مضامین و عموم نفع آپ اپنی نظیر ہے۔ آپ مدراس کے رہنے والے عمدۃ التجار، فخر روزگار ہیں۔ آپ کے فضل و کمال کی شاہد حال تو خود کتاب ہی ہے۔ آپ اردو زبان کے بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ فصاحت زبان اور شگفتگی بیان میں اہل مدراس میں آپ فی الواقع یکتا ہیں...''

اس کتاب میں عشق حقیقی و عشق مجازی کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ تقریظ میں مولانا مدہوش فرماتے ہیں:

''میں نے اہل مدراس میں ایسی فصیح اردو لکھتے کسی کو نہیں دیکھا خصوصاً مثنوی میں تو قلم توڑ دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ واقعات کو شعر کے پیرائے میں اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ جس کی داد دینے والا بھی خود مستحق داد ہے''۔

مثنوی کے بعد 17 غزلیں اور ایک رباعی درج ہے۔ اس کے بعد مصنف کا یہ بیان ہے کہ اس مثنوی میں عشق سے مراد قدرت ہے اور معشوق سے مراد معشوق حقیقی اور دیگر امور جو کتاب مذکورہ میں مندرج ہیں فضول ہیں۔

مثنوی چندر بدن مہیار المعروف بہ ''گلزار شاکر'' شاعر کا ایک حسین و جمیل شاہکار ہے۔ مقیمی اور باقر آگاہ کی بیان کردہ داستان کو شاکر نے ایک نیا روپ رنگ بخشا ہے۔ بیجاپور کے شاہ میر شرف الدین سہروردی کا ایک نہایت خوبرو لائق و فائق لڑکا تھا مہیار نامی۔ جس نے سندر پٹن کے راجہ رنگ راپتی کی لڑکی چندر بدن کے حسن کی شہرت سنی اور نادیدہ عاشق بن گیا۔ قصے کا خلاصہ ساقی نامہ میں خود شاکر کی زبانی سنیے:

جانا عاشق کا سوئے سندر پٹن
دیکھ لینا صورت چندر بدن
بیٹھنا مندر میں جا کر سال بھر
حسن کی دیوی کا پھر آنا ادھر
اس کے شمع رخ پہ پروانے کی طرح
گر کے بڑھنا اس پہ دیوانے کی طرح
کہہ کے یہ جھنجھلا کے جانا یار کا
''اے موئے چل کیا تو دیوانہ ہوا''
جانا جنگل کی طرف صحرا نورد
بولتا مصرع وہی با آہ سرد
حاکم ایجا نگر کا دشت سے
لے کر آنا گھر میں ساتھ اپنے اسے
جان کر سودائی چندر بدن
نامہ لکھنا جانب سندر پٹن
ہو کے پھر محروم حرف مدعا
چھوڑ دینا اس کو پھر نواب کا
دشت میں جانا کہیں پھر ماہیار
ڈھونڈتے آنا اسے چندر نگار
دے کے خوب اپنے ثبوت اقرار کا
مارنا عاشق کو جاں سے یار کا
پھر جنازہ جانا خود اڑ کر وہاں
در پہ اس چندر بدن کے بے گماں
کلمہ پڑھنا دل ربا کا شوق سے
جاں بحق تسلیم کرنا ذوق سے
دونوں کا ایک قبر میں ہونا نہاں
اس طرح ہے اختتام داستاں
ساقیا تیری نوازش ہو اگر
فیض پائیں اس سے سب اہل نظر
قصۂ چندر بدن اور ماہیار
شاہد معنی کا ہے آئینہ دار
صنع سے ہے رنگ صانع کی نمود
ہے وہی نور قدم نور شہود

قصے کے ایک ایک موڑ پر نبیوں اور ولیوں کی حکایتیں بھی متوازی طور پر بیان کی گئی ہیں، جن سے شاعر کا مقصد واضح ہوتا جاتا ہے۔ اصل داستان کے بعد ایک عبرت ناک قصہ بھی ظریفانہ انداز میں سنایا گیا ہے جو ابتذال کی سرحدوں کو چھو جاتا ہے۔ آخر میں جلال لکھنوی کا یہ مصرع تاریخ قابل توجہ ہے:

''مثنوی ایک چھپ گئی کیا خوب''

1326ھ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آندھرا پردیش کے ضلع انت پور کے قصبہ کدری میں آج بھی چندر بدن اور مہیار کا مشترکہ مزار مرجع خاص و عام ہے۔ مثنوی کے بعد ایک قصیدہ سرور کائنات کی مدح میں ہے اور پھر ایک جواب نامہ کسی دوست کے خط کا ہے جس میں شاکر کہتے ہیں:

''اردو دراصل ہمارے ہی ملک سے ایجاد ہوئی اور ہم منہ ہی دیکھتے رہ گئے اور اہل دہلی و لکھنو اس میں کمال پیدا کر گئے۔ پھر اردو کے اہل کمال میں سے اختلاف زمانہ کے لحاظ سے کیسے کیسے مختلف المذاہب ہوئے ہیں۔ ایک طبقے میں ایک محاورہ فصیح تھا دوسرے طبقہ والوں نے اس کو مکروہ سمجھا۔۔۔ اس پر خیالات کی چستی، بندش کی درستی اور طرز ادا کی سادگی کی طرف الگ نظر کی گئی اور ہر مضمون کا اچھوتا پن اور تشبیہات کی جدت الگ مدنظر ہے۔ ان سب باتوں کا آن واحد میں لحاظ رکھنا شاعری ہے۔ خواہ کسی زبان میں ہو''۔

اس کتاب میں وہ معرکہ بھی درج ہے جو شاکر اور قدر بلگرامی میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں 17 رباعیاں بھی شامل ہیں۔

شاکر کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حسن و عشق کی قرنہا قرن کی کشمکش شاعر کا محبوب موضوع ہے۔ اس کا ہر شعر اس کی ہر تخلیق اسی محور پر گھومتی ہے۔ 'مثنوی نالہ شاکر' میں واردات قلبی کے جو مرقعے شاعر نے کھینچے ہیں، وہ خود اس کے دل پر گزر چکے ہیں۔ وانمباڑی میں اب بھی کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو اس داستان کو حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن جس ہستی کو شاعر سے قریبی تعلق رہا ہے اس نے بار بار استفسار پر اس حقیقت کی نقاب کشائی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''مرحوم کی زندگی کو بے پردہ کرنا مناسب نہیں''۔

ایثار، قربانی اور معشوق پر مر مٹنے کا وہ جذبہ جو ہر مقام

اور ہر دور میں مستحسن نظروں سے دیکھا گیا ہے شاکر کے یہاں حصول مدعا کا واحد ذریعہ ہے۔ نالہ شاکر کا ہیرو اسی راستے سے شہر نگار حقیقی میں داخل ہوتا ہے۔ چندر بدن اور مہیار اسی سفینے کے سہارے بحر محبت کے پار اترتے ہیں۔

جہاں شاکر کے کلام میں ایسے اشعار جا بجا بکھرے پڑے ہیں جن میں ہجر و فراق، محرومی و بیچارگی، بے رخی و بے اعتنائی اور جور و تغافل کا برملا اظہار ہے وہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں محبوب کی قربت، لذت، ہم کناری اور معراج عشق کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ یہیں شاکر کی شخصیت کا وہ پہلو نمایاں ہوتا ہے جس کی بدولت وہ ایک سالک راہ نہیں بلکہ ایک عارف منزل رسیدہ نظر آتے ہیں۔ عشق مجازی کی راہ طے کرتے کرتے شاعر عشق حقیقی کی سرحد میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہاں کے انوار بے اندازہ سے منور ہو کر نمودار ہوتا ہے۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ جیسی فرسودہ روایات، فراق و وصال کی وہی پرانی واردات، رند و شیخ کے وہی پامال موضوعات جو صدیوں سے غزل میں غالب رہے ہیں، شاکر کے یہاں بھی اپنی پوری رعنائیوں اور رسوائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں، لیکن انہی جانی پہچانی تصویروں کے پس پردہ ایسے نقوش بھی ہیں جو لازوال ہیں اور دل و دماغ پر دیر پا تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ حکمت و معرفت کے دریائے اسرار کی شناوری اور فکر و نظر پر مبنی مشاہدے شاکر کو حسن مطلق کی تجلیوں اور معشوق حقیقی کے جلال و جمال کی نیرنگیوں میں گم کر دیتے ہیں اور اس عالم محویت میں گوناگوں حقیقتیں ان کے نوک قلم پر منکشف ہونے لگتی ہیں۔

زبان کی صحت و صفائی، کلام کی فصاحت و بلاغت، بندش کی چستی، تشبیہوں اور استعاروں کی موزونیت شاکر کی شاعری کی پہچان ہیں۔ ان کے علاوہ یہ خصوصیت بھی ہے کہ شاعر کو سنگلاخ زمینیں بہت بھاتی ہیں۔ شاید یہ طبیعت کی افتاد ہے کہ جس طرح حسن و عشق کی ظاہری رنگینیوں کو چھوڑ کر انھوں نے حسن حقیقی تک پہنچنے کی دشوار گزار راہوں کو اختیار کیا۔ اسی طرح غزل میں بھی انھیں پیچیدہ راہیں پسند آئیں۔ چنانچہ شاکر کے بہترین اشعار وہی ہیں جو ان زمینوں میں کہے گئے ہیں۔ درج ذیل اشعار دیکھیں:

رخ روشن سے تم اپنے نقاب الٹو نہ گلشن میں
بھڑک اٹھے گی سوز رشک سے گلزار میں آتش

سوجھتی ہی نہیں انساں کو کبھی قدر وطن
جب تک آنکھوں پہ نہ رہ جائے سفر کی عینک

ذیل میں شاکر کے کلام سے دو رباعیاں اور چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کے کمال سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

موتی نے صفا سے آبرو پائی ہے
پھولوں نے شگفتگی سے بو پائی ہے
انساں ہے وہی عزیز ہر دل شاکر
جس شخص نے دل پسند خو پائی ہے

بلبل ہے اسیر خوشنوائی کے سبب
برباد ہیں پھول خود نمائی کے سبب
ہے عجز و فروتنی سے عزت شاکر
انسان ہے ذلیل کبریائی کے سبب

ہم جام محبت پی لیتے ہیں شاکر
یہ زہر کے ہیں گھونٹ کہ شربت نہیں معلوم
گیا نہ چھوڑ کے دل کو مرے کبھی خالی
خیال زلف رسا مدظلہ العالی

نکالیں گے کوئی صورت تمہارے در تک آنے کی
کسی دن خواب بن کر جائیں گے چشم نگہباں میں
کیوں تیز بہت کرنے لگی آتش گل

شاکر کو اپنی عمر کے آخری دور میں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے داغ، امیر، جلال لکھنوی جیسے اساتذہ فن سے داد سخن پائی اور اپنی زندگی ہی میں کلام کے متعدد مجموعے اور دیگر تصانیف شائع کیں۔ تمل ناڈو کے ایک چھوٹے سے قصبے وانمباڑی کا پروردہ یہ شاعر آسمان سخن کا ایک ایسا روشن ستارہ بن کر چمکا جس کی ضیا پاشی سے بعد کی آنے والی نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں۔ تمل ناڈو کا یہ باکمال شاعر بالآخر 58 سال کی عمر میں 23 جولائی 1923 کو ظلمت عدم میں روپوش ہو گیا۔

اے باد صبا وہ ترے داماں میں لگی آگ
حال دل پورا نہ لکھا تھا کہ غش طاری ہوا
ضعف سے چھوٹا قلم تحریر آدھی رہ گئی
حال بیماروں کا پوچھیں تو یہ کہنا قاصد
مرنے والے تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں
بعد مدت کے جو احوال سفر پوچھا ہے
آج کیا تم کو عزیزان وطن یاد آیا
شاکر اس فن میں مرا نام رہے گا پس مرگ
یاد رکھیں گے مجھے اہل سخن میرے بعد

شاکر کے کلام کو پڑھنے اور پرکھنے کے بعد یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ بلاشبہ تمل ناڈو کا ایک باکمال فنکار ہے جس کے کلام میں کوئی فلسفہ اور ٹھوس پیغام نہ ہونے کے باوجود فنی اعتبار سے جو گہرائی و گیرائی ہے، دل کو موہ لینے والی جو کیفیت ہے نیز ایک ایسی بے پناہ اور پرخلوص کشش ہے وہ قاری کی توجہ خاص کر اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے۔ یہی شاکر کی انفرادیت اور پہچان ہے۔

شاکر کو اپنی عمر کے آخری دور میں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے داغ، امیر، جلال لکھنوی جیسے اساتذہ فن سے داد سخن پائی اور اپنی زندگی ہی میں کلام کے متعدد مجموعے اور دیگر تصانیف شائع کیں۔ تمل ناڈو کے ایک چھوٹے سے قصبے وانمباڑی کا پروردہ یہ شاعر آسمان سخن کا ایک ایسا روشن ستارہ بن کر چمکا جس کی ضیا پاشی سے بعد کی آنے والی نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں۔ تمل ناڈو کا یہ باکمال شاعر بالآخر 58 سال کی عمر میں 23 جولائی 1923 کو ظلمت عدم میں روپوش ہو گیا۔ اپنی حیات میں شاکر نے جو کتابیں یادگار چھوڑیں وہ حسب ذیل ہیں:

1 دیوان شاکر، مطبع بخشی پریس کلکتہ، 1896
2 مثنوی نالہ شاکر، مطبع گلزار حسینی بمبئی، 1897
3 چمنستان شاکر، مطبع مفید عام آگرہ، 1900
4 گلزار شاکر، مطبع گلزار حسینی بمبئی، 1908
5 گلدستہ شاکر، مطبع گلزار حسینی بمبئی، 1908
6 تحفہ شاکر، مطبع گلزار حسینی بمبئی، 1909
7 حدیقہ شاکر، مطبع گلزار حسینی بمبئی، 1909
8 صحیفہ ذکر اللہ، مطبع شاہ الحمید یہ مدراس، 1921

Dr. Syed Sajjad Hussain
19/43 Begam Saheb 3rd lane
Royapettah, Chennai - 600014
Mob. 9841254068
Email: profsshusain@gmail.com



عارف این

اردو ادب میں ویکّم محمد بشیر تراجم کا ایک جائزہ

ترجمہ نگاری محض ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کی منتقلی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ دو مختلف تہذیبوں، جغرافیائی خطوں اور انسانی تجربات کے درمیان ایک فکری پل تعمیر کرنے کا عمل ہے۔ یہ عمل انسانوں کو لسانی اور جغرافیائی بندشوں سے آزاد کر کے ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اردو ادب کی نشو ونما میں فارسی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کے تراجم کا بھی کلیدی کردار رہا۔ یہ مضمون ملیالم ادب کے نامور ادیب ویکّم محمد بشیر کی فکشن نگاری اور اردو زبان میں ان کے تراجم کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔

ملیالم ادب میں ویکّم محمد بشیر کا نام اہم ہے ان کی شناخت صرف ایک ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ وہ ایک مجاہد آزادی، فلسفی اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان تھے۔ ملیالم ادب میں انھیں محبت سے 'پیپو رسلطان' کہا جاتا ہے۔ بشیر نے اپنی کہانیوں میں کوئی بھاری بھرکم فلسفہ نہیں پیش کیا بلکہ انھوں نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں، عام انسانوں کی محبتوں، دکھوں اور حماقتوں کو اتنی سادگی اور مزاح سے بیان کیا کہ وہ سیدھی دل میں اتر گئیں۔

بشیر کی زندگی ان کی کہانیوں سے بھی زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ وہ 1908 میں کیرلا کے ضلع کوٹیم میں وکیم کے قریب 'تلا یولا پرمبو' گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بشیر بچپن سے ہی باغیانہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ پڑھائی چھوڑ کر ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے اور گاندھی جی کے 'نمک ستیہ گرہ' میں حصہ لیا۔ اس کی وجہ سے انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد انھوں نے پورے ہندوستان کا سفر کیا اور افغانستان، عرب اور افریقہ کے کچھ حصوں تک بھی پہنچے۔ اس سفر میں انھوں نے زندگی کو اس کے ہر رنگ میں دیکھا۔

وہ ہر طرح کے لوگوں سے ملے۔ فقیر، چور، جیب کترے، امیر، غریب اور سنت۔ ان تمام تجربات نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے اور انھیں انسانی فطرت کی گہری سمجھ عطا کی۔ یہی تجربات بعد میں ان کی کہانیوں کا انمول خزانہ بنے۔

بشیر کا اسلوب منفرد ہے:

انھوں نے اپنی تحریروں میں کتابی اور مشکل زبان کے بجائے عام لوگوں کی زبان استعمال کی۔ وہ جس طرح بات کرتے تھے، اسی طرح لکھتے تھے۔ ان کی زبان اتنی سادہ اور رواں ہے کہ ایک عام آدمی بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

وہ زندگی کے سب سے سنگین اور دردناک واقعات کو بھی ہلکے پھلکے مزاح کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا مزاح کسی کا دل دکھانے والا نہیں، بلکہ ایک گہری ہمدردی سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اکثر خود اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔

ان کی کہانیوں میں مذہب، ذات اور سماجی اونچ نیچ کی کوئی جگہ نہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا مذہب انسانیت سے محبت ہے۔

ان کے بہت سے افسانے ان کی اپنی زندگی کے واقعات پر مبنی ہیں، لیکن وہ ان میں تخیل کا ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ حقیقت اور افسانے کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔

بشیر نے زندگی کے ہر پہلو پر لکھا۔ ان کے خاص موضوعات محبت اور اس کی پیچیدگیاں تھیں۔ اس لیے بشیر کو محبت کا افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے محبت کو اس کی تمام سچائیوں اور تکلیفوں کے ساتھ پیش کیا۔ ان کا شاہکار ناول 'بالیہ کالا سکھی' اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ مجید اور سہرا کی محبت کی ایک دردناک کہانی ہے۔

ان کی کہانیوں میں بھوک اور غربت کا ذکر بار بار آتا ہے۔ لیکن وہ غربت کا رونا نہیں روتے، بلکہ اسے بھی ایک مزاحیہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی کہانی 'شبد نگل' ایک ایسے غریب فوجی کی کہانی ہے جو بھوک اور تنہائی کا شکار ہے۔

ان کا مشہور ناول 'پاتومّیڈے آڈ' ہے۔ اس میں ان کے گھر کے تمام افراد کے ساتھ ساتھ بکریاں، مرغیاں، بلّیاں اور دوسرے جانور بھی اہم کردار ہیں۔ یہ ناول ان کے گھر میں مچی رہنے والی افراتفری اور محبت کی ایک مزاحیہ تصویر ہے۔

بشیر نے سماج میں پھیلی ہوئی جھوٹی شان و شوکت اور مذہبی منافقت پر گہرا طنز کیا۔ ان کا ناول 'اینٹوپو پاکو رانینطارنو' (Ntuppuppakoranendarnnu) اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی لڑکی کنجو پاتومّا کی ہے جس کا خاندان ہر وقت اس بات پر فخر کرتا ہے کہ ان کے دادا کے پاس کبھی ایک ہاتھی ہوا کرتا تھا۔ یہ ناول جھوٹی شان کے بت کو توڑتا ہے اور علم اور سچائی کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

بشیر کی تقریباً تمام تحریریں ہی شاہکار ہیں، لیکن چند کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے۔ 'بالیہ کالا سکھی' ایک لازوال محبت کی کہانی۔ 'پاتومّیڈے آڈ' ان کی خاندانی زندگی پر مبنی ایک مزاحیہ ناول۔ 'متھیلوکل' (Mathilukal)

جیل میں گزاری گئی زندگی پر مبنی ایک انوکھی محبت کی کہانی، جہاں بشیر کو جیل کی دیوار کے دوسری طرف قید ایک عورت سے آواز کے ذریعے محبت ہو جاتی ہے۔ 'اینٹوپّو پاّکور اینٹارّو' سماجی طنز پر مبنی ایک بہترین ناول ہے۔

ویکّم محمد بشیر کے ناولوں کے اردو تراجم:

بشیر ملیالم ادب کے ان چند قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسانی فطرت کی سادہ مگر عمیق تہوں کو نہایت فنکاری سے منکشف کیا ہے۔ بشیر کے ناولوں کی ایک خاص بات حقیقت اور فکشن کا وہ امتزاج ہے جہاں وہ اپنی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو کہانی کا روپ دیتے ہیں۔ انھوں نے ثابت کیا کہ لافانی شاہکار تخلیق کرنے کے لیے ضخیم جلدوں کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ انسانی جذبوں کی سچی عکاسی ہی اصل جوہر ہے۔ انھوں نے ملیالم زبان میں 'ماپیلا' لب و لہجے کو استعمال کر کے تخلیق کی اور ثابت کیا کہ اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے لیے ثقیل الفاظ نہیں بلکہ گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس مقالہ میں ویکم محمد بشیر کے فکشن کے اردو تراجم پر مشتمل تین مجموعوں کا تعارف پیش ہے:

1 فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی، مترجم: اطہر پرویز
2 ویکم محمد بشیر، منتخب کہانیاں، مرتب و مترجم: مسعود الحق
3 ملیالم افسانے۔ مترجم: جیلانی بانو

بشیر کے دو شہرہ آفاق ناول ''بالیہ کالا سکھی'' اور ''پاتّو میڈے آڈ'' ملیالم ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا اردو ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے اپنے مخصوص ''ہندوستانی کتابوں کے سلسلے'' کے تحت شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے مترجم اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور مترجم اطہر پرویز ہیں۔ جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیے ہیں۔ انھوں نے ملیالم زبان کے مخصوص تہذیبی رچاؤ کو اردو قالب میں نہایت مہارت سے ڈھالا ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف بشیر کے فن کا تعارف کرواتا ہے بلکہ جنوبی ہند کے سماجی اور معاشی مسائل کی ایک جیتی جاگتی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔

کتاب کے ''پیش لفظ'' میں نیشنل بک ٹرسٹ نے اس ترجمہ اسکیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تہذیبی یکجہتی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور اس پر افسوس بھی کیا ہے کہ ہم اپنے دیس کی زبانوں کے ادب کے مقابلے میں یورپی زبانوں کے ادب سے زیادہ واقف ہیں۔

''ہندستان ایک عظیم ملک ہے جو اگرچہ تہذیبی حیثیت سے متحد ہے مگر پھر بھی ان رشتوں کو اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایک طاقتور اور ترقی پسند قوم بن سکے۔''[1]

اسی مقصد کے تحت یہ اسکیم بنائی گئی تاکہ مختلف علاقوں کے شہری ایک دوسرے کے ادبی شاہکاروں سے آشنا ہوں اور ان کے فکر و نظر، رہن سہن اور ثقافتی جذبوں سے متعارف ہو سکیں۔

کتاب میں شامل ایم۔ مکندن کا تحریر کردہ ''تعارف'' ملیالم ناول کے ارتقائی سفر اور اس میں بشیر کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ اس تعارف کے مطابق ملیالم ناول کی دنیا میں تین ناموں یعنی تکشی شیوشنکر، کیشو دیو اور واکیم محمد بشیر کو ''تین مورتی'' کی بلند پایہ حیثیت حاصل ہے۔ بشیر صاحب کے فن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ محض ایک عہد کے علمبردار نہیں بلکہ اپنے وجود کی باطنی آگ کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنانے والے فنکار ہیں۔ تعارف میں بشیر کی شخصیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

''بشیر ایک انقلابی سے زیادہ صداقت کے جویا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ان کے معاصرین حقیقت نگاری کی بنیاد پر تخلیقی اظہار میں مصروف تھے، اس وقت بشیر 'لیٹّو کالی مّونیوں' 'آنوارِ رامن نائر' کے مزاحیہ قصوں میں لگے ہوئے تھے۔ آج کل 'استھلتے پردھان دونیار' آنوریوں پون کوری شم، مچھیرو کلکارنٹے مکل' وغیرہ ناول اعلیٰ درجے کے مزاحیہ قصے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ پھر بھی بشیر ایک مزاح نگار نہیں ہیں۔ پاتمایوٹے آڈو (فاطمہ کی بکری) کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ 'یہ ایک مزاحیہ داستان ہے لیکن جب میں اسے لکھ رہا تھا اس وقت میرے اندر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے'۔ بشیر کے لیے آگ میں جھلسنے کا ذریعہ تخلیقِ ادب ہے۔''[2]

بشیر کی زندگی کے تجربات، قید و بند کی صعوبتیں اور دیوانگی کے ادوار ان کے ناولوں میں ایک خاص قسم کی معنویت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں جو انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز بھی کرتے ہیں۔

ناول ''فاطمہ کی بکری'' مزاح اور طنز کے پردے میں سماجی تلخیوں کو بیان کرتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ان کی بہن فاطمہ کی ایک بکری ہے جو پورے گھر کے نظم و ضبط کو درہم برہم کیے رکھتی ہے۔ اس بکری کے ذریعے بشیر نے اپنے ہی خاندان کے افراد، ان کی غربت، چھوٹے موٹے جھگڑوں اور ان کے درمیان موجود گہری محبت کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ محض ایک جانور کی کہانی نہیں بلکہ اس معاشرے کی عکاسی ہے جہاں انسان اور حیوان ایک ہی چھت تلے زندگی کی تگ و دو میں شریک ہیں۔

ناول ''بچپن کا ساتھی'' (Balyakalasakhi) ملیالم ادب کا ایک ایسا المیہ ہے جسے اس کی سادگی اور دلکشی کی بنا پر لوک گیتوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ مجید اور زہرہ کی معصوم بچپن کی محبت سے شروع ہو کر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور ناکامیوں تک محیط ایک دردناک قصہ ہے۔ یہ ناول محض ایک کہانی نہیں بلکہ انسان کے مقدر اور اس کی عملی زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں کا آئینہ دار ہے۔ ایم۔ مکندن لکھتے ہیں:

''دنیا کے بھیدوں کو ڈھونڈ نکالنے والے بشیر کے ناول لوک گیتوں کی طرح سادہ اور دلکش ہیں۔ ان کے جملوں میں بانسری کی مدھرتا ن کی مٹھاس ہے۔''[3]

یہ ناول قاری کو انسانی جذبوں کی اس انتہا پر لے جاتا ہے جہاں محبت اور دکھ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ بشیر کے ان ناولوں کے تراجم سے اردو ادب کے میدان میں کیرالا کی تہذیب، وہاں کے بسنے والوں کے روزمرہ کے مسائل اور ان کے جذبوں کو سمجھنے کا ایک بہترین علمی و ادبی ذریعہ ہیں۔

ویکّم محمد بشیر کے افسانوں کے اردو تراجم:

بشیر کے افسانے انسانی نفسیات، سادگی اور مزاح کا مجموعہ ہیں۔ ان کے افسانوں کی بڑی خوبی ان کا سادہ اور عام فہم اسلوب ہے۔ جس میں وہ زندگی کی سنگین ترین حقیقتوں کو بھی نہایت شگفتہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ بشیر نے اپنے افسانوں میں روایتی ادبی زبان کے بجائے کیرلا کی عام بول چال کو ترجیح دی، جس کی وجہ سے ان کی تحریریں براہِ راست قاری کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ ان کے کردار اکثر سماج کے دبے ہوئے طبقے ہوتے ہیں، جنھیں وہ بڑی ہمدردی اور انسانیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بشیر کے افسانوں میں خودنوشت رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان کی جلاوطنی کے ایام، قید و بند کی صعوبتیں اور مختلف مذاہب و تہذیبوں کا مشاہدہ ان کے افسانوی مواد کی بنیاد بنتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز، یہاں تک کہ جانوروں اور پودوں کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے

ہیں، جو ان کے وسیع مشرب اور 'واحدتِ الوجود' کے فلسفے کی نشاندہی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ بشیر کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ زندگی کی معنویت تلاش کرنے کا ایک صوفیانہ سفر بھی ہیں۔ ان کے کئی افسانے اردو زبان میں ترجمہ کیے ہیں۔ چند تراجم کا ذیل میں دیے ہیں۔

مجموعہ ''منتخب کہانیاں'' وائکم محمد بشیر کے افسانوی فن کا ایک بھرپور مرقع ہے، جس میں ان کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرنے والے 17 شاہکار افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین اردو کے ممتاز محقق اور مترجم مسعود الحق نے نہایت عرق ریزی سے کی ہے۔ جنھوں نے نہ صرف کہانیوں کا انتخاب کیا بلکہ اردو قارئین کے لیے بشیر کے فن پر ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ مجموعہ کراچی کے ''سٹی پریس'' اور ''آج کی کتابیں'' کے اشتراک سے 2005 میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔

کتاب کے ''تعارف'' میں مسعود الحق نے بشیر کے افسانوی اسلوب اور ان کی زندگی کے تجربات کے باہمی ربط پر بڑی جامع بحث کی ہے۔ تعارف میں انھوں ثابت کیا ہے کہ بشیر کے افسانے محض تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ان کی زندگی کے سچے مشاہدات کا نچوڑ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''بشیر کے افسانے ان کی اپنی زندگی کے مختلف ادوار کی یادداشتیں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ معمولی واقعات سے غیر معمولی معانی پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔''4

یہ اقتباس بشیر کے فن کی اس خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے کہ وہ کس طرح روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کائناتی سچائیاں کشید کر لیتے ہیں۔ ان کے ادبی فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ:

''ان کے نزدیک ادب کا مقصد زندگی کو اس کی اصل صورت میں دکھانا ہے، چاہے وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔''5

یہی وہ بے باکی اور سچائی ہے جو بشیر کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے اور ان کی کہانیوں کو عالمگیر معنویت عطا کرتی ہے۔

بشیر کے افسانے ان کی اپنی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ذیل میں مجموعہ میں شامل اہم افسانوں کے تراجم درج ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل 17 افسانے براہِ راست ملیالم زبان سے اردو میں منتقل نہیں کیے گئے۔ یہ تمام افسانے پہلے ملیالم سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہوئے اور پھر مسعود الحق نے ان انگریزی تراجم کو بنیاد بنا کر انھیں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں شامل کہانیاں موضوعات کے تنوع کی مثال ہیں۔ ان تراجم میں ملیالم کہانی 'آنا پوڈا' (Aanappuda) کا ترجمہ 'ہاتھی کی پونچھ' اور 'تھنگا موتھیرم' (Thangamothiram) کا ترجمہ 'سونے کی انگوٹھی' کے نام سے ملتا ہے۔ بشیر کی دیگر اہم تخلیقات میں ان کی شاہکار کہانی 'بالیا کالا سکھی' (Balyakalasakhi) شامل ہے جسے اردو میں 'بچپن کا ساتھی' کے نام سے کیا ہے۔ اسی طرح ان کا مشہور افسانہ 'پاتھومایوڈے آڈو' (Pathummayude Aadu) اردو میں 'فاطمہ کی بکری' کے عنوان سے ترجمہ ہوا ہے۔ بشیر کی فنکارانہ عظمت ان کی کہانی 'میتھلکل' (Mathilukal) میں بھی نظر آتی ہے جسے اردو میں 'دیواریں' کے نام سے کیا ہے۔ ان کی رومانی تحریر 'پریم لیکھنم' (Premalekhanam) کا اردو ترجمہ ''محبت نامہ'' کے نام سے موجود ہے۔ تراجم کے اس سلسلے میں بشیر کی کہانی 'منترا چیرڈ' (manthtra Cherad) 'تعویذ' کے نام سے، افسانہ 'ٹائیگر' (Tiger) اصل نام 'ٹائیگر' سے ترجمہ ہوا ہے۔ جنگ کے پس منظر میں ان کی لکھی ہوئی کہانی 'شبدنگل' (Shabdangal) اردو میں 'آوازیں' کے نام سے شامل ہے۔ مشہور افسانہ 'موچیٹی کالیکارنٹے مکل' (Mucheettu kalikkarante Makal) کا اردو ترجمہ 'پتے بازی کی بیٹی' کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ 'پڑایا اورو کوچو پریم کتھا' (Pazhaya Oru Kochu Prema Katha) ایک چھوٹی سی پرانی پریم کہانی، کے نام سے، افسانہ 'پامبوم کناڈیوم' (Paambum Kannadiyum) 'سانپ اور آئینہ' کے نام سے، افسانہ 'نیلا ویلیچم' (Neela Velicham) 'نیلی روشنی' کے نام سے، افسانہ 'پوون پژم' (Poovan Pazham) 'پوون بنانا' کے نام سے، افسانہ 'ایڈیئن پنیکر' (Idiyan Panicker) 'غنڈا پانیکر' کے نام سے، 'افسانہ 'امّا' (Amma) 'ماں' کے نام سے، افسانہ 'ایٹوکلی ممونجی' (Ettukali Mammoonju) 'ایٹوکلی ممونہو' کے نام سے ترجمہ کیے ہیں۔

مجموعہ ''ملیالم افسانے'' نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے سلسلے ' کتھا بھارتی' کا حصہ ہے۔ اس مجموعے کو اوم چیری این این پلے نے مرتب کیا ہے، جب کہ اس کا اردو ترجمہ مشہور و معروف اردو ادیبہ اور افسانہ نگار جیلانی بانو نے کیا ہے۔ یہ کتاب ملیالم ادب کے بہترین شاہکاروں کو اردو ادب تک پہنچانے کی ایک منظم کوشش ہے۔ اس مجموعے میں کیرلا کے صفِ اول کے ادیبوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ جن میں بشیر کا افسانہ 'سیکنڈ اینڈ' اسی ہی نام ترجمہ ہوا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ویکّم محمد بشیر ملیالم کے اہم ادیب ہیں جن کی اہمیت لسانی اور جغرافیائی سرحدوں سے ماورا ہے۔ اس مضمون میں بشیر کے فن اور ان کے اردو تراجم کے جن مجموعوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ محض ان کی وسعتِ فن کی چند مثالیں ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ادبی سرمایہ کا ایک بڑا حصہ اب بھی مزید علمی توجہ اور ترجمہ نگاری کا متقاضی ہے۔ بشیر کی تحریریں اپنی سادگی، گہری انسانیت اور صوفیانہ بصیرت کی بنا پر آج بھی قارئین کے لیے اتنی ہی پُرکشش اور اطمینان بخش ہیں جتنی اپنے عہد میں تھیں۔ ان کے تراجم نے نہ صرف اردو کو کیرلا کی تہذیبی بوقلمونی سے روشناس کرایا بلکہ دو مختلف زبانوں کے درمیان ایک مضبوط فکری پل بھی تعمیر کیا ہے۔

حواشی

1 فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی، اطہر پرویز، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، 1973، ص:5

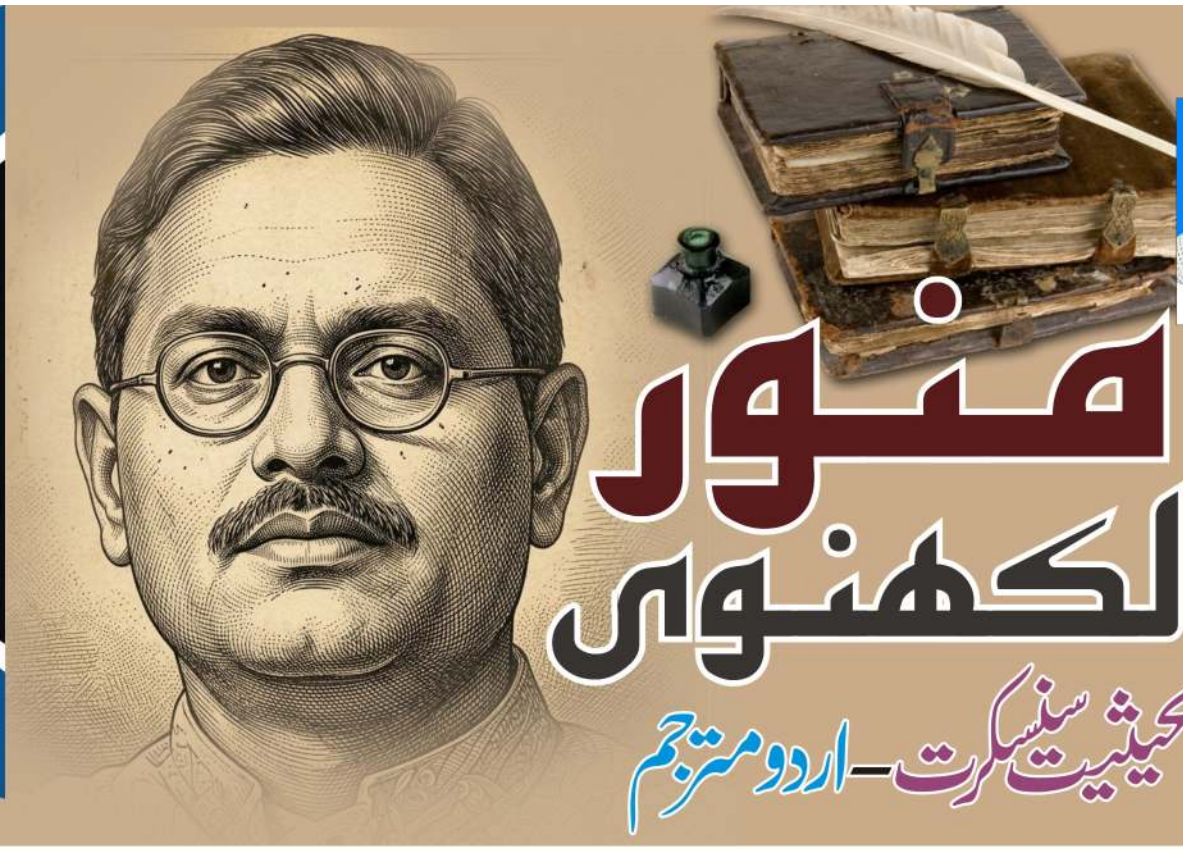
2 فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی، اطہر پرویز، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، 1973، ص:12

3 فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی، اطہر پرویز، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، 1973، ص:13

4 وکیم محمد بشیر: منتخب کہانیاں، مسعود الحق، سٹی پریس، کراچی، 2005ء، ص:10

5 وکیم محمد بشیر: منتخب کہانیاں، مسعود الحق، سٹی پریس، کراچی، 2005ء، ص:11

Arif N
HST Urdu, GHSS Puthuparamba &
Research Scholar, Dept. of Urdu
Sree Sankaracharya University of Sanskrit
RC Koyilandi-673305
Mob: 8089810461
Email: arifn651@gmail.com





محمد اسجد

منور لکھنوی

بحیثیت سنسکرت — اردو مترجم

بیسویں صدی میں ترجمے کی دنیا کا ایک اہم اورنمایاں نام بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا ہے۔انھوں نے ایک طرف شاعری کی شکل میں بیش قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے تو دوسری طرف ان کی ایک اہم پہچان ان کے ذریعے مختلف زبانوں سے کیے گئے اردو ترجمے ہیں۔ ان کو کئی زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی، جن میں اردو، ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی زبانیں شامل ہیں۔منور لکھنوی نے منظوم ومنثور دونوں طرح کے ترجمے کیے ہیں۔ ترجمے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ ان کے بیان کے مطابق انھوں نے تیرہ سال کی عمر میں انگریزی کی ایک کتاب ''snow drop'' کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔انھوں نے ترجمے کی شکل میں اردو ادب کو جو سرمایہ دیا ہے،اردو دنیا اسے کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی۔ یہاں ان کے سبھی تراجم کے متعلق گفتگو نہ کرکے صرف سنسکرت زبان سے کیے گئے اردو تراجم پر بحث کی جائے گی۔منور لکھنوی نے سنسکرت زبان میں تحریر کی گئی ادبی اور مذہبی کتابوں کا ترجمہ کرکے سنسکرت زبان سے ناواقف لوگوں کے لیے اہم کارنامہ انجام دیا ہے تاکہ اس زبان سے ناواقف لوگ بھی ہندو مذہب کو سمجھ سکیں اور سنسکرت ادب کی اہم تصانیف سے مستفید ہوسکیں۔ سنسکرت سرزمین ہند کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ زبان ہزاروں سالوں سے ارتقا کی منزلیں طے کرتی چلی آرہی ہے۔ سنسکرت زبان اپنے اندر قدیم ہندوستانی تہذیب وتمدن کا بہت بڑا ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے اور ویدک دور سے دور حاضر تک اس زبان میں ادبی تخلیقات کا سلسلہ جاری ہے، گرچہ دور حاضر میں اس زبان کے قارئین کم ہیں مگر اس زبان کا ادب ترجمے کی شکل میں دیگر زبانوں کے قارئین تک بآسانی پہنچ رہا ہے۔ان مترجمین کی صف میں ایک اہم نام منور لکھنوی کا بھی ہے جنھوں نے سنسکرت سے اردو ترجمہ کرکے اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔منور لکھنوی نے سنسکرت زبان کی مذہبی اور ادبی تصانیف ملاکر کل 18 کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہاں موصوف کی ترجمہ کردہ کچھ اہم کتابوں پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

بھگوت گیتا موسومہ نسیم عرفاں: بھگوت گیتا کا شمار ان صحیفوں میں ہوتا ہے،جن کا ترجمہ کم وبیش دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔اردو زبان میں بھی بھگوت گیتا کے منظوم ومنثور کئی ترجمے ہو چکے ہیں،جن میں سب سے قدیم ترجمہ منشی کنہیالال عرف الکھ دھاری کا ہے۔ منور لکھنوی نے بھی گیتا کی افادیت اور اس کے عالم امن کے پیغام کو سمجھا اور اس سے متاثر ہوکر اس صحیفے کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کتاب کا نام منور لکھنوی نے ''نسیم عرفاں'' رکھا۔ یہ ترجمہ منظوم صورت میں پہلی بار 1936 میں منظر عام پر آیا۔ گیتا کے اب تک جتنے ترجمے ہوئے ہیں ،ان میں اس ترجمے یعنی نسیم عرفاں کا ایک اہم مقام ہے۔ یہ ترجمہ اصل موضوع سے قریب تر ہے۔ منور لکھنوی نے مشکل پسندی سے اجتناب کرتے ہوئے گیتا کے پیغام کو بہت سادہ اور سلیس انداز میں اردو قارئین تک پہنچایا ہے۔شارب ردولوی نے منور لکھنوی کے اس ترجمے کو پڑھنے کے بعد اس کے متعلق جو فرمایا ہے اسے یہاں درج کردینا بے جا نہ ہوگا:

''یہ ترجمہ اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ مترجم نے ترجمہ کرتے وقت فصاحت و بلاغت کی ان اعلی قدروں کو نگاہ میں رکھا ہے جو کسی فنی وشعری تخلیق کو تاریخ ادب میں بلند مقام دیتی ہے۔''[1]

رامائن بالمیکی: یہ مہرشی بالمیک کی لافانی سنسکرت تخلیق ہے، جسے ہندو مذہب میں ایک مقدس کتاب کا درجہ حاصل ہے۔منور لکھنوی نے اس کتاب کا منثور ترجمہ کیا ہے، جسے سردار سنگھ سچدیو اینڈ سنز لاہور ناشران کتب نے 1931 میں شائع کیا۔اس ترجمے کی ابتدا سے پہلے منور لکھنوی نے مہرشی بالمیک کو ایک نظم کی صورت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے دیباچے میں رامائن اور اس کے مصنف کے متعلق منور نے ضروری اطلاعات فراہم کی ہیں، جن سے قاری کو پس منظر سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے۔ یہ ترجمہ منور کے تمام مطبوعہ تراجم میں پہلا نثری ترجمہ ہے۔منور لکھنوی نے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ترجمہ آسان، سادہ، سلیس اور روزمرہ کی زبان میں کیا

گیا ہے لیکن جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دعویٰ پوری طرح سے درست نہیں ثابت ہوتا ہے البتہ ترجمے کی زبان بامحاورہ ہے۔اس ترجمے کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ترجمے کے درمیان میں جگہ جگہ اشعار کا استعمال بھی کیا ہے بلکہ ہر نئے باب کا آغاز منور نے خود کے کسی شعر یا دیگر شعرا کے شعر سے کیا ہے، جن میں غالب کا نام قابل ذکر ہے۔ مجموعی طور پر ''رامائن بالمیکی'' کا یہ ترجمہ اردو ادب کے قارئین کی پسند اور دل چسپی کو برقرار رکھتا ہے۔اس ترجمے کے ذریعے ہی سنسکرت زبان سے ناواقف اردو داں طبقہ ہندو مذہب کی اس اہم تخلیق سے واقف ہو سکا ہے۔

ترجمے کی فہرست میں منور لکھنوی کا کالی داس کے مشہور زمانہ ڈرامے ''ابھگیان شکنتلا'' کا ترجمہ بہت اہم ہے۔ یہ ترجمہ اصل متن سے بہت قریب ہے۔ ''ابھگیان شکنتلا'' کے اب تک جتنے تراجم ہوئے ہیں، ان سب سے یہ ترجمہ ذرا مختلف ہے۔ اس ترجمے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اصل متن کے مطابق جو حصہ منظوم شکل میں ہے، اس کا ترجمہ منظوم کیا گیا ہے اور جو حصہ منثور ہے وہ منثور رکھا گیا ہے۔اس ترجمے کا آغاز منور لکھنوی نے 2 مئی 1962 کو دہلی میں کیا اور 18 جون 1963 کو بنارس میں یہ ترجمہ مکمل ہوا۔ اس کی اشاعت 1963 میں کوہ نور پریس، دہلی سے ہوئی ہے۔ مذکورہ ڈرامے کا یہ اردو ترجمہ اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی نظروں سے بھی گزرا اور اس پر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ خط کے ذریعے ترجمے پر کیے گئے ان کے اظہار خیال کا ایک اقتباس یہاں پیش کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس چھوٹے سے اقتباس ہی سے ہمیں سنسکرت ادب کے اردو تراجم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ''ابھگیان شکنتلا'' کے اردو تراجم کی اہمیت وافادیت کا بھی علم ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

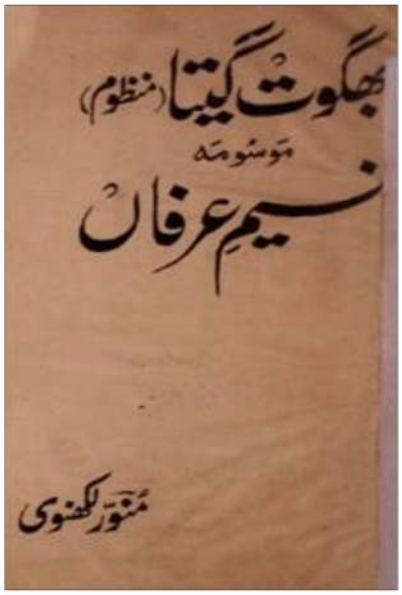
''سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اپنے تراجم سے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور صرف ادبی خدمت نہیں کی ہے بلکہ ایک قابل قدر قومی خدمت بھی۔ افکار عالیہ اور جذبات لطیفہ کا جو خزانہ سنسکرت میں ہونے کی وجہ سے اردو پڑھنے والوں کی دسترس سے باہر ہے، اسے آپ نے ان تک پہنچا دیا۔ اور کس خوبی سے پہنچایا ہے۔ سب ترجمے میں نے پڑھے جن میں ابھگیان شکنتلا بھی ہے اور کہیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ ایک با کمال اردو شاعر کا کلام نہیں ہے۔ سنسکرت جانتا نہیں ہوں اس لیے مقابلہ تو نہیں کر سکا مگر ترجموں کی روانی کہتی ہے کہ اصل کا دامن ہاتھ سے چھوٹا نہیں ہے۔''[2]

ذاکر حسین کی اس گراں قدر آرا سے منور لکھنوی کے اس ترجمے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، ساتھ ہی اس ترجمے کو ادبی دنیا میں خوب سراہا بھی گیا۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران قاری بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ بہت روانی کے ساتھ پڑھتا اور کہانی کے ساتھ جڑتا چلا جاتا ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ ترجمے کا اصل قصے سے قریب تر ہونا اور لفظوں کا انتخاب ہے، جس میں منور لکھنوی کو بہت مہارت حاصل تھی۔

مدرا راکشس موسومہ سیاسی داؤ پیچ: یہ وشاکھا دت کا ڈراما ہے، جس کا اردو ترجمہ منور لکھنوی نے کیا ہے۔ اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس کا شمار تاریخی ڈرامے میں ہوتا ہے جو کہ تاریخی حقائق و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے۔ منور لکھنوی اس ترجمے کو اصل متن سے قریب رکھنے میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ ڈرامے کی ابتدا سے پہلے منور نے اس ڈرامے کا پس منظر درج کر دیا ہے تاکہ قارئین اس ڈرامے سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ دوران ترجمہ منور لکھنوی نے اصل متن کے علاوہ اس ڈرامے کے ہندی اور انگریزی تراجم سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بعض تراجم کی طرح اس میں بھی نثری حصے کا منثور ترجمہ اور شعری حصے کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے کا منظوم حصہ زیادہ تر مقفیٰ ہے۔ اس ترجمے کے ذریعے منور لکھنوی کے ساتھ ساتھ اس ڈرامے کے اصل مصنف وشاکھا دت کو بھی شہرت نصیب ہوئی اور اردو دنیا ان سے واقف ہو سکی۔

کمار سمبھو: یہ کالی داس کی ایک طویل نظم ہے۔ منور لکھنوی نے اس کا ترجمہ بڑی دلجمعی سے کیا ہے، جو 1952 میں شائع ہوا۔ اس کا تعارف 'بام عرش' سے کے عنوان سے عرش ملسیانی نے لکھا ہے۔ اس کا مقدمہ 'فسانۂ آزاد' کے نام سے جگن ناتھ آزاد نے تحریر کیا ہے۔ کمار سمبھو کے اصل متن میں کل 18 باب ہیں مگر منور لکھنوی کا یہ ترجمہ صرف سات ابواب پر مشتمل ہے یعنی شیو جی اور پاروتی کی شادی کے قصے تک کا بیان ملتا ہے۔ کالی داس کے اس شاہکار کا اردو ترجمہ کرنے والے





> مجموعی طور پر ''رامائن بالمیکی'' کا یہ ترجمہ اردو ادب کے قارئین کی پسند اور دل چسپی کو برقرار رکھتا ہے۔اس ترجمے کے ذریعے ہی سنسکرت زبان سے ناواقف اردو داں طبقہ ہندو مذہب کی اس اہم تخلیق سے واقف ہو سکا ہے۔

منورلکھنوی پہلے مترجم ہیں، جنھوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ منور اس سے متعلق رقمطراز ہیں:

''شاید قدرت ہی کو منظور تھا کہ سنسکرت زبان کے زندہ جاوید شاعر کالی داس کے شاہکار کمار سمبھو کا منظوم ترجمہ اردو میں میرے ذریعے پیش ہو۔ مگر سالہا سال سے میری خود بھی یہ خواہش تھی کہ فردوس شاعری کے اس باغبان لافانی کی گلکاریوں کا مترنم عکس ادب اردو کے شیشے میں اتاروں یہ خواہش پوری ہو کر رہی اور ستمبر 1939 میں دوسری عالمگیر جنگ کے ساتھ کمار سمبھو کا یہ ترجمہ شروع ہو کر اسی جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ساتھ 1945 میں پورا ہو گیا۔''[3]

یہ ترجمہ شائع ہونے سے قبل ہی اردو دنیا میں کافی شہرت پا چکا تھا۔ اشاعت سے پہلے ہی اس کا کچھ حصہ الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ 'مانسرووَر' میں شائع ہو چکا تھا۔ دیانارائن نگم منور کے خاص رفیقوں میں تھے اور اس ترجمے کے شیدائی بھی تھے۔ انھوں نے اس ترجمے کا کچھ حصہ اپنے زیرنگرانی شائع ہونے والے رسالہ 'زمانہ' میں بھی شائع کیا تھا۔ منورلکھنوی نے یہ ترجمہ کرتے وقت اصل خیال کو بکھرنے نہیں دیا ہے۔ یہ ترجمہ اتنی احتیاط اور چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ کہیں بھی قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ فراق گورکھپوری اس ترجمے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت منور کی قوت نظم کا سب کو قائل ہونا پڑے گا۔ یہ ترجمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنسکرت شاعری کی روح، اس کی فضا، اس کا نظریہ، اس کی وجدانیت اور رنگارنگ خوبیاں اس منظوم ترجمے میں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے صبح کے آئینہ خانے میں شبنمستاں جلوہ گر ہو۔''[4]

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منورلکھنوی نے فن ترجمہ نگاری میں مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کے قارئین کے لیے اس شاہکار کو اور بھی دلکش بنا کر پیش کر دیا ہے۔

مالویکا گن متر: یہ کالی داس کا پہلا ڈراما ہے۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ کرنے کا شرف منورلکھنوی کو حاصل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت 1973 میں ہوئی۔ اس ترجمے کو اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ اس ڈرامے میں رومانی فضا غالب ہے۔ پلاٹ بھی سیدھا اور سپاٹ ہے۔ منورلکھنوی نے نثری مکالمے کا ترجمہ نثر میں اور سنسکرت اشلوکوں کا ترجمہ پابند یا آزاد نظم کی شکل میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر ترجمہ لائق تحسین ہے۔

اودھوت کا ترانہ یعنی نغمہ قلندری: یہ شری شنکر اچاریہ کی سنسکرت تصنیف 'چرپٹ پنجریکا' کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب جون 1958 میں منظر عام پر آئی۔ اس کی حیثیت ایک مذہبی صحیفے کی ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے اور اس کی ہیئت ترجیع بند ہے۔ اس میں کل 81 بند ہیں۔ یہ

حضرت منور کی قوت نظم کا سب کو قائل ہونا پڑے گا۔ یہ ترجمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنسکرت شاعری کی روح، اس کی فضا، اس کا نظریہ، اس کی وجدانیت اور رنگارنگ خوبیاں اس منظوم ترجمے میں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے صبح کے آئینہ خانے میں شبنمستاں جلوہ گر ہو۔

ایک ایسی نظم ہے جو اس دنیاوی سفر کو ایک مایا جال قرار دیتی ہے۔ منورلکھنوی کے اس ترجمے سے اردو کے قارئین بالخصوص وہ قارئین زیادہ محظوظ ہوں گے جن کو روحانیت میں دلچسپی ہے۔

درگاسپت شتی موسومہ درگا پاٹھ: یہ سنسکرت اشلوکوں پر مشتمل ایک طویل منظوم منقبت ہے۔ اس ترجمے کی ابتدا منورلکھنوی نے 1946 میں کی تھی۔ اس کتاب میں اصل موضوع سے پہلے انھوں نے ایک دعائیہ نظم 'وندنا' کے عنوان سے شامل کی ہے۔ یہ ترجمہ کیوں کہ مذہبی حیثیت رکھتا ہے اس لیے روح پرور اور پراثر ہے۔ یہ نظم کل 13 ابواب پر مشتمل ہے۔ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس زبان میں ہے۔ بحر کا انتخاب بھی موزوں اور مترنم ہے۔ اس ترجمے کی بدولت سنسکرت ادب کے اردو تراجم میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔

آریہ ابھِ ونے یا پرماتما کے دربار میں: یہ آریہ سماج کے بانی مہرشی سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف ہے۔ اس منظوم ترجمے کی اشاعت 1968 میں ہوئی۔ اس ترجمے کو ہم خالص اردو ترجمہ نہیں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ بعض جگہ منورلکھنوی نے اپنی بات بہتر ڈھنگ سے قارئین تک پہنچانے کے لیے یا اوزان و بحور کی پابندی کی وجہ سے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کیا ہے، جن سے ترجمے کے حسن میں کمی آنے کے بجائے ترجمہ اور دلکش اور پراثر ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ مقفیٰ ہے اور بہترین شاعری کی بہت سی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ منورلکھنوی نے سنسکرت زبان کی متعدد کتابوں کو اردو کے قالب میں بہترین ڈھنگ سے ڈھالا ہے، جن میں ونے پترکا، روحانی مکالمہ، گیتا رموکش، رمبھا شک سمواد، وکرم اروشنم، مالتی مادھو، کند مالا یا سیتا بن باس، مفلس کا عشق یا چارودت وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا سبھی تصانیف جن کے تراجم منورلکھنوی نے اردو میں کیے ہیں، سنسکرت ادب کا قیمتی سرمایہ تو ہیں ہی ساتھ ہی اردو زبان میں جو تراجم ہوئے ہیں، وہ بھی اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان تراجم کی بدولت ہی اردو ادب کے وہ قارئین جو سنسکرت زبان سے ناواقف ہیں یا واقفیت رکھتے بھی ہیں تو اس حد تک نہیں کہ وہ سنسکرت ادب کو براہ راست پڑھ کر محظوظ و مستفیض ہو سکیں۔ ان کے لیے یہ تراجم کسی نعمت سے کم نہیں ہیں کیوں کہ وہ ان تراجم کی بدولت ہی سنسکرت زبان کے کلاسیکی متون اور ہندو مذہب کے مقدس صحیفوں سے آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔

حوالے:

1- راز، راج نرائن، منورلکھنوی شخصیت اور شاعری، 1970، ص 219
2- منورلکھنوی، ابھگیان شکنتلا، کوہ نور پریس، دہلی، 1963، ص 4-3
3- منورلکھنوی، کمار سمبھو، ناشر انجمن ترقی اردو بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، 1952، ص 20
4- ایضاً، ص 7

Muhmmad Asajad
Research Scholar
Centre for Indian Langaueges
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
Mob. 7897666694
Email: ma6364635@gmail.com



مجید بیدار

ہندوستان میں فلم کا آغاز اور اس کی ترقی کے مراحل

انگریزی زبان میں عام طور پر استعمال ہونے والی اصطلاح فلم کے لیے ایک اور لفظ سنیما کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر کسی پردہ پر جب تصویریں متحرک حیثیت سے کام کرنے لگیں اور ان تصویروں کے ساتھ آوازوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو ایسی متحرک تصویریں بولتی اور چلتی پھرتی زندگی کی موثر نمائندگی کرنے لگتی ہیں، جسے فلم یا سنیما کہا جاتا ہے۔ عام زبان میں بولتی اور چلتی پھرتی تصویروں کو فلم کہنے کا طریقہ رائج ہے۔ کیمرے کی ایجاد نے انسان کی تصویر اتارنے کے فن کو آسان کردیا۔ دنیا میں موجودات کی ہر حرکت اور ہر منظر کو تصویر کے ذریعے نمایاں کرنا، کیمرہ کی وجہ سے بہت آسان ہوگیا ہے جسے بلاشبہ کیمرے کی کارستانی قرار دیا جائے گا۔ دنیا میں ایجاد ہونے والے کیمرے آنِ واحد میں ادا ہونے والی حرکت کو تصویر میں قید کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں چلنے پھرنے کے عمل کو کیمرے کے ذریعہ دکھانا سخت دشوار تھا۔ جب فلمی کیمرہ کی ایجاد ہوئی تو ہر قسم کی چلتی پھرتی تصویر کو کیمرے میں قید کرلینا اور اسے دوبارہ دکھانا آسان ہوگیا۔ دنیا کی تہذیب اور ثقافت میں اہم تبدیلی اس وقت محسوس کی گئی جب کہ فلمی کیمرے کے ذریعے ڈاکیومینٹری فلم بنائی گئی۔ 28 ڈسمبر 1885 کو پیرس کے مقام پر گرانڈ کیفے کی نچلی منزل میں لومیری برادران نے انتہائی عجیب وغریب فوٹو گرافی کا تجربہ کیا۔ جس میں ساکن تصویروں کو متحرک بتایا گیا تھا۔

اسی دور سے یورپی دنیا میں متحرک تصویروں یعنی فلم کا آغاز ہوا۔ ان فلموں میں صرف تصویریں متحرک ہوتی تھیں، لیکن تصویروں کے ساتھ آواز یا گفتگو کو پیش کرنا ممکن نہ تھا۔ اس قسم کی فلموں کو خاموش فلم Silent Picture کا نام دیا گیا۔ اس زمانے میں لفظ پکچر کا استعمال بھی تصویروں کے لیے ہوتا تھا۔ یورپی ممالک جیسے جرمنی، پیرس، انگلینڈ اور امریکہ میں سب سے پہلے خاموش فلموں کا رواج ہوا۔ یہ فلمیں چونکہ یورپی زبانوں میں بنائی جاتی تھیں، اس لیے انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہونا ہندوستانیوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں یورپی فلمیں دکھائی جاتی تھیں، جنھیں انگریز قوم بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ ہندوستانی قومیں چونکہ یورپی زبانوں سے نابلد تھیں۔ اس لیے ان کے دل میں یہ جذبہ فروغ پانے لگا کہ کیوں نہ خاموش فلموں کو ہندوستانی زبانوں میں پیش کرنے کا تجربہ کیا جائے۔ ہندوستان جیسے وسیع اور عریض ملک میں کئی اہم شہر موجود تھے جہاں تجارت، ادب، صحافت، تہذیب اور مذہب کے فروغ کے کام انجام دیے جارہے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب کہ سارے ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور کوئی بھی شہر کسی بھی ریاست کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے سے ہی ممبئی شہر کو تجارتی مرکز اور ایک اچھی سمندری بندرگاہ کا مقام حاصل تھا۔ جو انگریزوں کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے ممبئی پروینس کے نام سے مشہور تھا۔ اسی شہر ممبئی سے تعلق رکھنے والے شخص دادا صاحب پھالکے نے جرمنی سے فلم کی تکنیک سیکھی اور ہندوستان لوٹنے کے بعد انھوں نے ناسک کے مقام پر فلم اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں کولہاپور کے دو بھائی بابوراؤ پینٹر اور آنندراؤ پینٹر نے انگریزی خاموش فلموں سے تحریک حاصل کر کے ایک مووی (متحرک) کیمرہ بنانے میں کامیابی حاصل کی اور اس کیمرے سے انھوں نے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی ایک ڈاکیومینٹری تیار کی' جسے انھوں نے اپنے قوم کے نام منسوب کردیا۔ ان دونوں بھائیوں نے ذاتی خرچہ سے یورپی فلم خریدی اور اسے ڈاکیومینٹری میں تبدیل کردیا۔ یہ کارنامہ سب سے پہلے بمبئی جیسے علاقے میں پیش آیا۔ جس کے سارے علاقہ پر انگریزوں کا تصرف اور تسلط تھا۔ جہاں سب سے پہلے انگریزی ایجادات کا استعمال ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد اس سارے علاقے کو ریاست مہاراشٹرا قرار دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں سب سے پہلے فلم ریل اور اس کے استعمال سے ڈاکیومینٹری کی تیاری اور بعد میں خاموش فلمیں بنانے کا آغاز مہاراشٹرا کے علاقے سے ہوا۔ اسی مہاراشٹرا میں سب سے پہلے 1912 تک غیر ملکی خاموش فلموں کی نمائش ہوتی رہی۔ فلم بنانے اور اس کو ہندوستانی انداز سے پیش کرنے کا سب سے پہلا تجربہ سنسکرت کے مشہور عالم دادا صاحب پھالکے نے انجام دیا۔ انھیں فلم بنانے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ مصوری، موسیقی اور اداکاری سے بھی کافی دلچسپی تھی۔

چنانچہ انھوں نے 1912 میں 21اشرفیوں کو فروخت کر کے ایک فلمی کیمرہ خریدا اور فلم بنانے کے لیے فائی نانسر سے رابطہ قائم کیا۔ جب یہ تمام چیزیں انھیں حاصل ہوگئیں تو انھوں نے ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنانے کا اعلان کیا۔ جس کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر خود دادا صاحب پھالکے تھے اور اس فلم کے مرکزی کردار کی حیثیت سے ڈی ڈی دابکے اور فلم کی واحد خاتون اداکارہ منداکنی تھی جو دادا صاحب پھالکے کی بیٹی تھی۔ یہ فلم 3700 فٹ لمبی تھی اور اس کی نمائش کا آغاز بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں 1913 میں ہوا۔ اس طرح دادا صاحب پھالکے ہندوستان کے پہلے خاموش فلم کے موجد قرار پائے، جنھوں نے 1913 میں پہلی ہندوستانی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' پیش کر کے ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں خاموش فلم کی بنیاد رکھی۔ بمبئی کو فلمی شہر کا مقام حاصل ہوگیا اور 1913 سے لے کر 20 برسوں تک اس ملک میں خاموش فلمیں بنتی رہیں۔ ان ابتدائی 20 سالوں کے درمیان تقریباً 200 خاموش فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ اس دور میں فلموں کی سچویشن کے مطابق سازندے الگ الگ موسیقی دیا کرتے تھے اور ہر منظر کے لیے ایک شخص کھڑا ہو کر فلم کی کہانی سنایا کرتا تھا۔ دادا صاحب پھالکے کی زیادہ تر بنائی ہوئی فلمیں دھارمک انداز کی تھیں، جو مکمل طور پر خاموش فلموں میں شمار کی جاتی تھیں، کیونکہ ان کے ساتھ آواز اور مکالمے پیش کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

فلم کے شائقین 1930 تک خاموش فلمیں دیکھتے دیکھتے اکتاہٹ کا شکار ہوگئے کیونکہ ہر وقت دھارمک فلم میں موجود یکسانیت انھیں تکلیف دہ محسوس ہونے لگی۔ اس یکسانیت کا خاتمہ اس انداز سے ہوا کہ 1931 میں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' پیش کی گئی جس میں تصاویر کے ساتھ آواز بھی شامل تھی۔ اس فلم کے مرکزی کردار کی حیثیت سے ماسٹر وٹھل اور مس رانی زبیدہ نے کردار نبھایا تھا۔ فلم کے پروڈیوسر آردیسر ایرانی نے اس فلم میں گیتوں کو بھی شامل کیا تھا۔ گیتوں میں مردانی آواز ڈبلیو ایم خان اور زنانی آواز رانی زبیدہ نے دی تھی۔ ہندوستان میں پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' 14 مارچ 1931 کو ریلیز ہوئی، جس میں سنگیت شامل تھے۔ اس زمانے میں فلم کی تکمیل پر 40000 روپے کا خرچہ آیا تھا اور یہ فلم 10500 فٹ طویل تھی۔ ''عالم آرا'' کی پیش کش کے دوران اسی سال یعنی 1931 میں دادا صاحب پھالکے کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فلم سازوں نے 22 متکلم فلمیں نمائش کے لیے پیش کیں۔ 1933 کا سال ختم ہونے تک بولتی فلموں کی تعداد 75 تک پہنچ گئی۔ اس طرح بولتی فلمیں بنانے کی رفتار میں تیزی آنے لگی۔ 1939 تک 171 متکلم فلمیں نمائش کے لیے منظر عام پر آگئیں۔ غرض 1931 کی تاریخ کو ہندوستانی سنیما میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اسی سال سے آہستہ آہستہ خاموش فلموں کا دور ختم ہوا اور متکلم فلموں کے دور کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی فلموں میں آردیسر ایرانی کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ وہ پہلے فلم ساز ہیں جنھوں نے گونگے کرداروں کو زبان عطا کی۔ اس طرح سنیما کو عوامی رابطے کا موقف حاصل ہوگیا۔ اب فلمیں متحرک تصویروں کے ساتھ ساتھ آواز یعنی گفتگو کو بھی پیش کرنے کا ذریعہ بن گئیں۔ اس طرح ہندوستانی فلموں پر خاموشی کے سائے ختم ہوئے اور بولتی فلموں کا ایک ایسا طویل سلسلہ شروع ہوا کہ جس سے عوام کی دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اس دور تک فلمیں بنانے کے لیے ایک ہی رنگ اختیار کیا جاتا تھا جسے ''بلیک اینڈ وائٹ فلم'' کا درجہ حاصل تھا۔ اس دور میں رنگین تصویروں کے ذریعے متحرک فلم بنانا ہر حال میں دن میں خواب دیکھنے کے مترادف تھا۔ اس دور تک یورپی دنیا میں بھی بلیک اینڈ وائٹ فلم رائج تھے اور رنگین فلم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ساری دنیا میں موجود انسان شوق کی تکمیل کے لیے فلم کی نمائش کے دوران صرف اور صرف بلیک اینڈ وائٹ تصاویر کے ذریعے لطف اندوز ہوتے تھے۔ سب سے پہلے بلیک اینڈ وائٹ فلم کے بجائے ٹیکنی کلر فلم کی بنیاد پڑی۔ اس سے قبل جو فلمیں ایک ہی رنگ میں دکھائی جانے لگی تھیں، انھیں گیوا کلر کا نام دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں پہلی گیوا کلر کی فلم ''شاہجہاں'' کے نام سے بنائی گئی۔ جس کے بعد ملک کی پہلی ٹیکنی کلر فلم ''آن'' بنائی گئی، جسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی فلم جس کا پریمیر شو غیر ممالک میں ہوا اور ساری دنیا میں اس کی نمائش ہوئی۔ اس فلم کا نام ''لائٹ آف ایشیا'' تھا۔ جسے ہانشو رائے نے بنایا تھا۔ ہندوستانی فلموں میں سب سے پہلے کسی ایک کردار کے ڈبل رول کی پیش کشی کو ساہوموروک نے اپنی فلم ''آوارہ شہزادہ'' میں پیش کیا۔ گرودت نے سب سے پہلے سنیما اسکوپ فلم ''کاغذ کے پھول'' تیار کی۔ ''آوارہ شہزادہ'' 1933 میں تیار کی گئی۔ 1934 میں پہلی بار موسیقار آر سی یورانی نے فلم ''چندی داس'' تیار کی، جس میں پہلی مرتبہ بیک گراؤنڈ موسیقی دی گئی تھی۔ اسی سال یعنی 1934 میں پلے بیک گلوکاری کا چلن عام ہوا۔ جس کی نمائندگی فلم ''دھوپ چھاؤں'' سے ہوتی ہے۔ اس طرح جب پہلی بولتی فلم 1931 میں شروع ہوئی اور صرف 4 سال کے دوران فلمی دنیا میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جس کی وجہ سے فلم کی تکنیک میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ اس دور میں فلم دیکھنے والوں کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی بولتی فلموں کے ساتھ ساتھ کئی قسم کے رنگوں کی نمائندگی کرنے والی فلموں کا آغاز ہو چکا تھا۔

فلم بنانے اور اس کو ہندوستانی انداز سے پیش کرنے کا سب سے پہلا تجربہ سنسکرت کے مشہور عالم دادا صاحب پھالکے نے انجام دیا۔ انھیں فلم بنانے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ مصوری، موسیقی اور اداکاری سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے 1912 میں 21اشرفیوں کو فروخت کرکے ایک فلمی کیمرہ خریدا اور فلم بنانے کے لیے فائی نانسر سے رابطہ قائم کیا۔ جب یہ تمام چیزیں انھیں حاصل ہوگئیں تو انھوں نے ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنانے کا اعلان کیا۔ جس کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر خود دادا صاحب پھالکے تھے اور اس فلم کے مرکزی کردار کی حیثیت سے ڈی ڈی دابکے اور فلم کی واحد خاتون اداکارہ منداکنی تھی جو دادا صاحب پھالکے کی بیٹی تھی۔ یہ فلم 3700فٹ لمبی تھی اور اس کی نمائش کا آغاز بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں 1913 میں ہوا۔



فلم کی دنیا کے فروغ میں دو اہم وسیلوں کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے فلم کی تیاری کے لیے اسٹوڈیو کو بنیادی ضرورت کا درجہ حاصل ہے۔ اداکاروں، موسیقی اور مناظر کے علاوہ ہدایت کاری سے مالا مال فلم کو جب تک شائقین کے روبرو پیش نہ کیا جائے، فلم کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح فلم دیکھنے کے لیے تھیٹر یا سنیما گھر بھی ضروری ہے۔ ہندوستانی فلموں کی تیاری کے لیے ممبئی کو مرکزی مقام کا درجہ حاصل ہو گیا۔ جہاں کئی فلم سازوں کے اسٹوڈیو قائم ہو گئے۔ ممبئی کے بعد مدراس اور کولکاتہ کے علاوہ حیدر آباد میں بھی اسٹوڈیو قائم کرنے کا سلسلہ چل پڑا۔ غرض ہندوستان میں پیش ہونے والی بیشتر فلموں کا تعلق اسٹوڈیو شوٹنگ سے تھا۔ یعنی تمام تر فلمیں اسٹوڈیو کے اندر ہی فلمائی جاتی تھیں۔ اسٹوڈیو کے باہر کے مناظر کی شوٹنگ کو ہندوستان کی ابتدائی فلموں میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ فلمی دنیا میں آوٹ ڈور شوٹنگ کا رواج عام ہونے لگا۔ خوبصورت مناظر اور قدرت کی فیاضی کو فلموں میں دکھانے کے لیے ابتدائی طور پر ملک کے اہم مقامات پر فلم کی شوٹنگ کے یونٹ قائم ہونے لگے۔ فلم سازوں کی ابتدائی نظر کشمیر کی وادیوں اور اس کے نظاروں کی جانب مرکوز ہوئی۔ جس کے بعد اوٹی، شملہ اور ملک کے دوسرے اہم مقامات کے تاریخی آثار سے استفادہ کرتے ہوئے ان مقامات پر فلموں کی شوٹنگ کو رواج دیا جانے لگا۔ اس طرح اسٹوڈیو کے باہر بھی فلمی شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جسے آوٹ ڈور شوٹنگ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں ابتدائی طور پر اپنے ملک کے مناظر کو ہی آوٹ ڈور شوٹنگ میں شامل کیا گیا۔ لیکن بڑھتی ہوئی ترقی اور شائقین کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے فلم سازوں نے بیرونی ممالک کے اہم مقامات پر فلمی شوٹنگ کی طرف خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ پیرس، لندن، سنگاپور، ٹوکیو، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے کئی اہم عالمی اعتبار سے تفریحی مقامات پر فلم یونٹ لے جا کر فلم سازوں نے آوٹ ڈور شوٹنگ کے بین الاقوامی تصور کو عام کیا۔ ملک کے اندرونی مناظر کی شوٹنگ کی نمائندگی کرنے والی فلموں میں ''کشمیر کی کلی'' اور ''ایک مسافر، ایک حسینہ'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیرونی ممالک کی شوٹنگ کو نمائندگی دینے والی فلموں میں ''لوان ٹوکیو'' اور ''ان ایوننگ ان پیرس'' شامل ہیں جن میں شامل مناظر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح فلموں میں انڈور شوٹنگ یعنی اسٹوڈیو کے اندر کے مناظر کے علاوہ آوٹ ڈور شوٹنگ یعنی ہندوستان کے بیرونی مقامات کے مناظر اور اس کے علاوہ دنیا کے مشہور مقامات کے مناظر کو بھی فلمی دنیا میں اہم مقام حاصل ہو گیا۔ غرض فلم سازوں نے فلم بنانے کے لیے اسٹوڈیو کی مختصر دنیا کے حدود سے اپنے آپ کو نکال کر عالمی سطح پر موجود مشہور مقامات پر شوٹنگ کے مناظر فلما کر فلمی دنیا کی وسعت کو نمایاں کیا۔ اس طرح ہندوستانی فلمیں اسٹوڈیو کی تاریکی سے باہر نکل کر آوٹ ڈور شوٹنگ کی وسعتوں کو قابو میں کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جس سے شائقین کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوا۔

فلم کی دنیا کے فروغ میں دو اہم وسیلوں کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے فلم کی تیاری کے لیے اسٹوڈیو کو بنیادی ضرورت کا درجہ حاصل ہے۔ اداکاروں، موسیقی اور مناظر کے علاوہ ہدایت کاری سے مالا مال فلم کو جب تک شائقین کے روبرو پیش نہ کیا جائے، فلم کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح فلم دیکھنے کے لیے تھیٹر یا سنیما گھر بھی ضروری ہے۔

ہندوستان میں بنائی جانے والی ابتدائی فلموں کی مجبوری یہ تھی کہ 1931 کے بعد تک بھی فلمی دنیا پر ''دھارمک فلموں'' کا غلبہ رہا۔ فلم کی کہانی میں دیوؤں اور دیوتاؤں کے کردار اور انہونے واقعات کے ذریعے خدا اور خدائی عظمت کو ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اور اسے کہانی کے روپ میں فلموں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اسے دھارمک فلم کا نام دیا گیا۔ ہندوستانی سماج میں ترقیات سے قبل داستانوی دور کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جن میں جادو ٹونے کے علاوہ جن، پری اور راکشس کے ذریعہ کہانی میں ندرت پیدا کی جاتی تھی۔ اسی کا اثر ابتدائی فلموں پر غالب رہا۔ ہندو مذہب کے تحت سادھوؤں، رشیوں اور ان کے اعتقادات کی روشنی میں جو فلمیں بنائی گئیں وہی، دھارمک فلم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ہندوستانی فلموں پر اپنے ابتدائی 10 سال تک دھارمک فلموں کا غلبہ رہا۔ ایسی فلمیں دیکھ کر شائقین اکتاہٹ کا شکار ہونے لگے۔ فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کی اکتاہٹ کو ختم کرنے کے لیے ہندوستانی فلم سازوں نے ''نیم تاریخی فلموں'' کی طرف توجہ دی۔ ایسی فلمیں جن میں فلم ساز تاریخ سے کسی واقعے کو منتخب کر کے اس میں خیالی قصے کہانی کی بنیادوں کو کام میں لایا جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے کسی تاریخی واقعہ کی صداقت افسانوی قصے میں گم ہو جاتی تھی اور اس کا تعلق تاریخ سے باقی نہیں رہتا تھا بلکہ خیالی کہانی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ ایسی فلمیں جب بنائی جانے لگیں تو ان میں کسی حد تک تاریخ کے جزو کو شامل رکھا جاتا تھا۔ تاہم سارا قصہ خیالی طور پر من گڑھت انداز کی نمائندگی تھا۔ اس لیے ایسی فلموں کو ''نیم تاریخی فلموں'' کا نام دیا گیا۔ ہندوستانی فلموں میں ''جہانگیر'' اور ''شاہجہاں'' جیسی فلموں کے ذریعے نیم تاریخی

فلموں کا آغاز ہوا، جس کا سلسلہ فلم ''انارکلی'' اور ''مغلِ آعظم'' سے ہوتے ہوئے ''نور جہاں'' تک دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کی بے شمار فلمیں ہندوستان کے پردۂ اسکرین پر دکھائی گئیں، جنھیں شائقین نے حد درجہ پسند کیا۔ اس طرح ہندوستانی فلمی دنیا پر پہلے ''دھارمک فلمیں'' اور پھر اس کے بعد ''نیم تاریخی فلموں'' کا تسلط قائم رہا۔ ہندوستانی فلم کی صنعت میں فلم سازوں نے ایسی فلمیں بنا کر شائقین کے دل موہ لینے کا کارنامہ انجام دیا۔

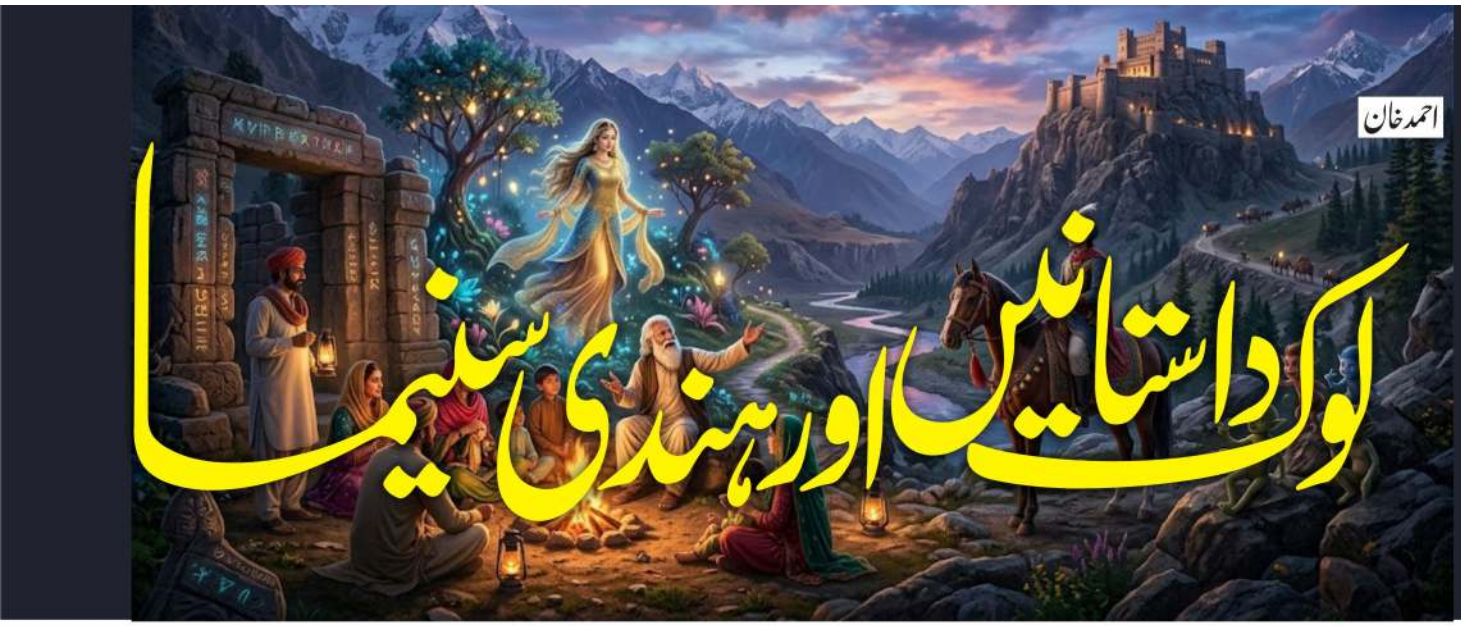
فلم کے موضوعات میں وقت کے لحاظ سے تبدیلیاں بھی آتی گئیں۔ فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں نے ایک ہی قسم کے موضوعات پر فلم بنانے سے گریز برتتے ہوئے نئے نئے موضوعات پر فلمیں بنانے کی طرف توجہ دی۔ ابھی تک فلمی دنیا میں دھارمک اور نیم تاریخی موضوعات پر فلم بنانے کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن فلم سازوں نے محسوس کیا کہ حب الوطنی اور گھر گھرہستی کے مسائل کی طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ جس کی وجہ سے ''سن آف انڈیا'' کے علاوہ ''مدر انڈیا'' جیسی فلمیں وجود میں آئیں۔ ''میں سہاگن ہوں''، ''دادی ماں''، ''پھاگن'' اور ''خاندان'' جیسی فلموں میں بھی گھر گھرہستی کے مسائل کی بھرپور نمائندگی موجود ہے۔ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک ہندوستانی فلموں میں چار موضوعات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جن میں دھارمک فلم، نیم تاریخی فلم، پیٹریاٹک فلم اور گھر گھرہستی کے موضوعات سے وابستہ فلموں کو عروج حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں فلمی دنیا کے ذریعہ ایک نئے انداز کا آغاز ہوا جسے ''مار دھاڑ'' کی فلم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''استادوں کے استاد'' اور ''ہم سب استاد ہیں'' سے لے کر فلم ''راکا'' کے شائقین نے یہ بھی دیکھا کہ مار دھاڑ کی فلموں کو ایک اہم موضوع کی حیثیت سے فلمی دنیا میں مقام حاصل ہونے لگا۔ ہندوستان کے فلم سازوں نے تفریحی فلموں کی بنیاد بھی رکھی۔ فلم سازوں نے ہندوستان کی کئی زبانوں میں فلمیں بنائیں۔ ان تمام فلموں میں عورت اور مرد کی محبت کے قصے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ مرد و عورت کے مثالی عشق کو فلموں میں شامل کیا جانے لگا۔ ایسی فلمیں ہندوستان کی ''رومانی فلموں'' کی حیثیت سے مقبول ہونے لگیں۔ ایسی فلموں میں ''شیریں فرہاد'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' سے لے کر فلم ''دو بدن'' تک بیشتر پیش ہونے والی ہندوستانی فلموں میں رومانیت کا اثر غالب رہا۔ اس طرح ہندوستانی فلموں میں رومانی فلم کو بھی ایک اہم موضوع کا درجہ حاصل ہے۔ جرائم اور جاسوسی کو بنیاد بنا کر کئی فلمیں تیار کی گئیں۔ ''جیول تھیف'' اور ''وکٹوریہ نمبر 300'' اور ''لومیریج'' جیسی فلموں کا شمار جرائم اور جاسوسی کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے فلم سازوں نے فلم بینوں کی دلچسپی کے لیے صرف فلمی موضوعات پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ فلمی دنیا میں ناچ گانے، موسیقی، مکالمے اور مناظر کی ہمہ جہتی کو نمایاں کر کے فلم کی شان میں اضافہ کیا۔ فلمی گیتوں کی موسیقی کے علاوہ بیک گراؤنڈ موسیقی کے ذریعے عمدہ تاثرات کی موثر نمائندگی پر توجہ دی گئی۔ اس طرح ہندوستانی فلمی دنیا کو اہم موضوعات سے وابستہ کر کے فلم سازوں نے دلچسپی کا سامان فراہم کیا۔ ہندوستانی فلمی دنیا میں اگرچہ کئی موڑ آئے لیکن ''شعلے'' فلم بننے کے بعد انڈر ورلڈ



کی سرگرمیوں اور سیاسی لیڈروں کی بے ضابطگیوں کے علاوہ رشوت ستانی، بلیک میلنگ اور غنڈہ عناصر کی سرگرمیوں کو بھی فلمی موضوعات میں شامل کیا گیا۔ اس طرح ہندوستانی فلموں کے ذریعے کئی موضوعات کی نشاندہی ہوتی رہی۔ فلمی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت ایسی فلموں کو حاصل ہے جو ''آرٹ فلم'' کہلاتی ہے۔ ہر دور میں کسی نہ کسی فلم ساز نے آرٹ فلم کی نمائندگی کی طرف توجہ دی۔ فلم ''کاغذ کی ناؤ'' سے لے کر ''تارے زمین پر'' جیسی پیش کردہ فلموں کو ہندوستان کی آرٹ فلموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اپنے آغاز سے لے کر 100 سال کی مدت کے خاتمے کے دوران ہندوستانی فلم سازی کئی اہم موضوعات پر فلم بنانے کے تجربے سے آراستہ ہوئی۔ ان کے بنائے ہوئے فلم نہ صرف یادگار کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ انھیں ملکی اور عالمی سطح کے اہم ایوارڈ بھی حاصل ہو چکے ہیں۔ جس سے ہندوستانی فلموں کی اہمیت اور ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندی فلموں کے علاوہ پنجابی، مراٹھی، تلگو، کنڑی، بنگالی اور گجراتی جیسی زبانوں میں ہندوستانی فلمیں پیش کی گئیں۔ ہر ریاست کی علاحدہ علاحدہ زبانوں میں فلمیں بنانے کے باوجود بھی سارے ہندوستان میں ہندی فلموں کا غلبہ رہا۔ ہندی کے نام پر بنائی جانے والی بیشتر فلموں کی زبان اردو ہوتی ہے، جسے عوام پسند کرتے ہیں، لیکن حکومت کی طرف سے ایسی فلموں کو بھی ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ مکمل اردو کی نمائندگی کرنے والی فلمیں جیسے ''مغلِ آعظم''، ''تاج محل''، ''صاحب بی بی اور غلام''، ''میرے محبوب'' اور ایسی ہی بیشمار فلمیں جن کا تمام تر ماحول اردو تہذیب سے وابستہ ہے، لیکن حکومت نے ایسی فلموں کو بھی ہندی سرٹیفکیٹ دے کر ہندی زبان کی اہمیت اور اردو زبان سے سوتیلے سلوک کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان تمام شہادتوں کے باوجود ہندوستانی فلموں میں مکالمے، گیت اور موسیقی کے علاوہ ان کی پیش کش کے انداز پر اردو تہذیب کا غلبہ ہے۔ عصر حاضر میں گینگ وار اور انسانی زندگیوں کی بے اعتدالیوں کو بنیاد بنا کر فلم سازی کی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے ہندوستانی فلم بھی مکمل طور پر یورپی فلموں سے نظریں ملا کر فروغ پانے کی علمبردار قرار پا رہی ہیں اور ان فلموں سے شائقین کے ذوق میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ٹی وی کلچر کی وجہ سے فلموں پر برا اثر پڑا ہے۔ بیشتر سنیما گھر بند ہوئے اور گھر میں ٹی وی کے ذریعے فلمیں دیکھنے کا چلن عام ہونے کی وجہ سے فلموں کو تھیٹر کے پردے پر دیکھنے کے شائقین کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جسے فلمی دنیا کے بڑے پردے پر پیش ہونے کی رکاوٹ سے تعبیر کیا جائے گا۔

■

Prof. Majeed Bedar
(Retd.) Professor Department of Urdu
University College of Arts & Social Sciences
Osmania University, H. No. 9-4-135
Raghava Colony,Hyderabad-500008
Mob: 9441697072
Email: majeedbedar@gmail.com



لوک داستانیں اور ہندی سنیما

احمد خان

ہندستانی سنیما اور داستانوں کے مابین ایک گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنیما میں علاقائی، روایتی، دیومالائی اور اساطیری داستانوں کی خصوصی پیش کش دیکھنے کو ملتی ہے۔ سنیما، روایتی کہانیوں اور کرداروں کو وسیع سامعین تک پہنچانے، انھیں تصویری شکل میں محفوظ کرنے اور ان کی بازتخلیق کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر کام کرتا ہے۔ دراصل عوامی دلچسپی کے پیش نظر اکثر تھیم، کردار اور پیش کش کے لیے مذہبی داستانوں اور لوک کہانیوں کو فلموں میں خصوصی جگہ دی جاتی رہی ہے۔ لوک داستانیں عام طور پر سنیما کے لیے تحریک کا کام کرتی ہیں۔ ایسی فلموں میں تہذیب و ثقافت کی موثر پیش کش ہوتی ہے، جس سے سامعین کے ساتھ ایک گہرا ربط قائم ہوتا ہے۔ سنیما کے آغاز سے ہی مذہبی اساطیر، لوک داستانوں اور ہندو دیو مالائی کہانیوں پر مبنی فلمیں، کثرت سے پردۂ سیمیں کی زینت بنتی رہی ہیں۔ مثلاً دادا صاحب پھالکے کی راجا ہریش چندر (1913)، موہنی بھسما سور (1913)، ستیہ وان ساوتری (1914)، لنکا دہن (1917) اور شری کرشن جنم (1918)، رگھوپتی سوریہ پرکاش کی بھیشم پرتگیا (1921)، جمشید جی فرام جی مدن کی ستیہ وادی راجا ہریش چندر (1917)، وی، شانتا رام کی گوپال کرشن (1929) وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ متکلم فلموں کے دور میں بھی ہندو مائیتھالوجی پر متعدد فلمیں بنائی گئیں۔ جیسے ہومی واڈیا کی سمپورن رامائن (1961)، اے، اے، ناڈیا والا کی مہابھارت (1965)، چترا پو نارائن راؤ کی بھکت پرہلاد (1967)، کمالاکر اکامیشور راؤ کی شری رام بنواس (1977)، اُوپندر جھا کی کرشنا، کرشنا (1986)، دلیپ کنیکاریا کی لَو کُش (1997)، انوراگ کشیپ کی اینی میٹیڈ فلم ریٹرن آف ہنومان (2007)، منی رتنم کی راون (2010) وغیرہ۔

ہندستانی سنیما میں دیومالائی و اساطیری داستانوں سے اخلاقیات، حسنِ سلوک، فرض کی ادائیگی، غیبی قوت، کائنات کی تخلیق، مقدس شخصیات اور اعتقاد و توہمات جیسے موضوعات کے لیے زرخیز زمین فراہم ہوتی ہے۔ سنیما میں رامائن، مہابھارت اور دیگر دیوی دیوتاؤں پر مبنی لوک داستانوں کو انتہائی دلچسپ انداز میں فلمایا گیا ہے۔ حالیہ برسوں میں بھی، ہندو مائیتھالوجی یا لوک داستانوں سے لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی فلموں میں ثقافتی ورثے کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جیسے سی، اشونی دت کی فلم کلکی (2024)، اوم راؤت کی 'آدی پروش' (2023)، ایان مکھرجی کی 'برہما شتر' (2022)، پُشکر گائتری کی فلم 'وکرم ویدھا' (2022) اور ایس، ایس، راجامولی کی فلم 'باہوبلی' (2015) وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ لوک داستانوں پر مبنی فلمیں، ماضی اور حال کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی ہیں، سامعین کو ان کی ثقافتی جڑوں سے جوڑتی ہیں اور انھیں تخلیقی صلاحیتوں اور اظہار کے نئے افق کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اس باہمی رشتے میں، لوک داستان اور سنیما کے مابین ایک ایسی داستانی فضا قائم ہوتی ہے، جس میں ہندستانیت کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔

اردو داستانوں اور ہندستانی سنیما میں بھی گہرا ربط رہا ہے۔ اردو میں زیادہ تر داستانیں فارسی اور عربی زبان سے ترجمہ شدہ ہیں۔ کچھ داستانیں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ ہندستانی سنیما کی ابتدا سے ہی اردو میں مروجہ داستانوں پر مبنی فلمیں بننے لگی تھیں اور یہ سلسلہ خاموش دور سے متکلم دور تک قائم رہا ہے۔ ایسی فلموں میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، چہار درویش، علی بابا اور چالیس چور، علاء الدین کا چراغ، حاتم طائی، گل بکاؤلی، گل صنوبر، بیتال پچیسی، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، حاتم طائی، رستم و سہراب، الف لیلیٰ اور وامق عذرا وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

فلم چار درویش، 1964 میں بنی تھی، جس کی ہدایت ہومی واڈیا نے کی تھی۔ فلم کی کہانی سی، ایل، کپوس نے لکھی تھی۔ اسکرین پلے جے، بی، ایچ، واڈیا نے لکھا تھا۔ اس فلم میں فیروز خان، سعیدہ خان اور بے بی ناز نے اپنی اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اردو اور فارسی میں چار درویش کی داستان کو دور قدیم سے ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ فلم چار درویش بناتے وقت داستان 'باغ و بہار' پیش نظر رہی ہو۔ اگرچہ فلم میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ مکمل داستان کا احاطہ کیا جا سکے۔ ہومی واڈیا نے فلم کی ضرورت اور تقاضے کے مطابق ترمیم و اضافے سے کام لیا ہے۔ اس فلم میں چوتھے درویش قمر بخت کی کہانی پیش کی گئی ہے، لیکن بادشاہ اور باقی درویشوں کی کہانی کو بھی اصل کہانی سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ فلم چار درویش میں لوک تہذیب، پرستانی دنیا، سمندر کی تہہ میں طلسماتی دنیا، عجائب الچراغ، صبر کی درگاہ، انتہا کا مزار، جادوئی انگوٹھی، غیبی جامہ، اڑنے والا غالیچہ، ہوائی گھوڑا، خاک مقدس، بھائیوں کا فریب، سپہ سالاروں کی غداری، شاہی آداب و اطوار، مرادوں کا پورا ہونا وغیرہ کی موثر عکاسی کی گئی ہے۔

فلم ہیر رانجھا، پنجاب کے صوفی شاعر وارث شاہ 1722-1798 کی منظوم داستان 'ہیر' (1766) پر مبنی ہے۔ وارث شاہ، اٹھارہویں صدی کے ایک پنجابی مسلم صوفی شاعر تھے، جنھیں پنجابی ادب میں گراں قدر خدمات

کے لیے مقبولیت حاصل تھی۔انھیں خصوصی طور پر ہیر رانجھا کی عشقیہ داستان کی تخلیق کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ پنجاب کی سب سے مشہور المناک عشقیہ داستان ہے۔ ہیر رانجھا،ایک روایتی پنجابی لوک داستان ہے۔ یہ پنجاب کی چار مشہور المناک رومانی داستانوں میں سے ایک ہے۔ باقی تین مرزا صاحباں،سوہنی ماہیوال اور سسی پنوں ہیں۔ ہیر رانجھا کی داستان کو کئی شاعروں نے قلم بند کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ معروف نسخہ وارث شاہ کا 'ہیر' ہے۔

اس فلم میں سیال اور رانجھا قبیلے کے رہن سہن، خوردونوش، تفریح وتفنن، رسم ورواج، قبائلی تصادم اور تخت ہزارہ، جھنگ اور دریائے چناب کی وادیوں کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب کی تہذیب وثقافت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ہیر رانجھا کی کہانی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس موضوع پر متعدد فلمیں بنائی گئیں۔

خاموش دور میں فلم ہیر رانجھا 1928 میں بنی تھی، جس کی ہدایت فاطمہ بیگم نے کی تھی۔ یہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہدایت کار تھیں۔اس فلم میں ہیر کا کردار زبیدہ نے انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اس دور کی دیگر فلموں میں فلم ہیر سندری (1928) فلم ہیر رانجھا (حورِ پنجاب) 1929 فلم ہیر رانجھا (1932) فلم ہیر (1956) شامل ہیں۔

فلم ہیر رانجھا (1970) کی ہدایت چیتن آنند نے کی اور اس کا اسکرین پلے بھی لکھا۔فلم کی موسیقی مدن موہن کی ہے۔کیفی اعظمی نے فلم کے مکالمے اور گیت لکھے۔اس فلم کی انفرادیت یہ ہے کہ پوری فلم کے مکالمے منظوم ہیں،جن کو کیفی اعظمی نے شاعرانہ طرز پر لکھا ہے۔ بقول پریم پال اشک:

''کیفی اعظمی کو چیتن آنند کی شہرۂ آفاق منظوم فلم ہیر رانجھا کا منظوم اسکرپٹ تحریر کرنے کا فخر بھی حاصل ہوا اور ہیر رانجھا ہماری اولین منظوم فلم قرار دی گئی۔''[1]

فلم الف لیلہ (1953) کی ہدایت اور فلم سازی کے امر ناتھ نے کی تھی۔اس فلم کی کہانی 'الف لیلہ ولیلہ' سے ماخوذ ہے۔فلم میں نمی (جنی)، آشا ماتھر (شہزادی)، وجے کمار (علاء دین)، پران، مراد، امرت رانا، مایا دیوی، گوپ (رشید)، ہیلن (رقاصہ) وغیرہ نے اداکاری کی ہے۔ایم، آر، نواب نے فلم کی کہانی اور اسکرپٹ لکھی ہے۔ساحر لدھیانوی نے گیت لکھے اور موسیقی شیام سندر نے ترتیب دی ہے۔

قصہ الف لیلہ ولیلہ، عرب کی مشہور لوک کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس میں ایک ہزار ایک کہانیاں درج ہیں۔ اس داستان کا ترجمہ متعدد زبانوں میں کیا گیا ہے۔سب سے پہلے انٹوان گلانڈ (Antoine Galland) نے اس کا فرانسیسی زبان میں ''Les Mille et Une Nuits'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔انٹوان گلانڈ کو اس کا مخطوطہ 1690 میں ملا تھا،جس کا فرانسیسی ترجمہ 1704 میں 2 جلدوں میں شائع ہوا اور 1717 میں مکمل داستان 12 جلدوں میں شائع ہوئی۔یہی ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں کے لیے بنیاد بن گیا۔پروفیسر ابوالحسن منصور احمد نے اس داستان کو اردو میں ''الف لیلہ ولیلہ'' کے نام سے سات جلدوں میں پیش کیا،جن کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہند، دہلی نے 46-1940 کے درمیان کی تھی۔

الف لیلہ ولیلہ کے مشہور قصوں میں علاء دین، علی بابا اور چالیس چور، مچھیرا اور جن، سند باد جہازی، تین سیب، دعوت برمکی، احمد اور بانو پری، وغیرہ شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں جو تاریخی کردار بیان کیے گئے ہیں، ان میں برامکہ، ہارون الرشید، حاتم طائی، خسرو پرویز، شیریں، ابونواس، زبیدہ بنت جعفر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حاتم طائی کا قصہ، الف لیلہ ولیلہ کی داستانوں میں سے ایک ہے۔حاتم طائی اگرچہ ایک تاریخی کردار ہے، لیکن اس سے منسوب سات سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے سفر کرنا، ایک فرضی داستان ہے۔ اس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اردو میں قصہ حاتم طائی لکھنے کا سہرا حیدر بخش حیدری کو حاصل ہے۔حیدری کی تصنیف آرائش محفل 1801 میں لکھی گئی، لیکن یہ 1805 میں ہندستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی اور یہ بات اس کے سرورق سے ظاہر ہوتی ہے۔قصۂ حاتم طائی کے مرتب اطہر پرویز کے مطابق ''حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل میں حاتم طائی کی سات سیروں کا ذکر ہے اور اسی لیے عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ ''سخن شعرا'' میں حیدری کی اس کتاب کا نام 'ہفت سیر حاتم'' لکھا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے کاغذات میں اس کا ذکر اکثر و بیشتر 'حاتم طائی' کے طور پر آیا ہے، اسی لیے میں نے اس نسخے کا نام 'قصۂ حاتم طائی' رکھا ہے۔''[2]

نورالحسن نقوی نے بھی اس داستان کو 'حاتم طائی کا قصہ' کے عنوان سے 1976 میں مرتب کیا تھا۔حاتم طائی کا قصہ عوام میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس پر متعدد فلمیں بنائی گئیں۔بقول پریم پال اشک:

''الف لیلیٰ کی داستانوں میں ایک اور مقبولِ عام قصہ حاتم طائی کا بھی ہے۔اس موضوع کے زیر عنوان 5 فلمیں پیش کی گئی ہیں۔ایک فلم خاموش دور میں آئی اور 4 فلمیں متکلم عہد میں پردۂ سیمیں کی زینت بنیں۔ 1934 میں بھارت موبی ٹون نے فلم حاتم طائی 4 حصوں میں بنائی۔یہ اب تک کی ہماری طویل ترین فلم ہے۔''[3]

فلم حاتم طائی (1956) کی ہدایت ہومی واڈیا نے کی تھی۔فلم کی کہانی، اسکرپٹ اور منظر نامہ جے، بی، ایچ، واڈیا نے لکھا تھا۔بسنت پکچرز نے اس فلم کو پروڈیوس کیا تھا۔حکیم لقا اور چاند پنڈت نے مکالمے لکھے تھے۔ گیت کاروں میں چاند پنڈت، بی، ڈی، مشرا، اختر رومانی اور راجہ مہدی علی خان شامل تھے۔

فلم میں دکھایا گیا ہے کہ یمن کا شہزادہ حاتم طائی ایک تاجر، شاعر، سخی اور مہربان انسان ہے، جو پتھر بن جانے والی ایک نوجوان پری کو بچانے کے لیے سات سوالوں کے جواب کی تلاش میں ایک خطرناک سفر پر نکل پڑتا ہے۔آخر میں تمام سوالوں کے جواب کئی مہم جوئی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔گلنار پری پھر سے اپنی اصل شکل اختیار کر لیتی ہے۔حسنہ پری کے والد، حاتم طائی کو حسنہ سے شادی کی اجازت دے دیتے ہیں۔ منیر اور حسن بانو کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔

فلم حاتم طائی (1956) کو تامل زبان میں فلم 'مایا موہنی' کے عنوان سے ڈب کیا گیا تھا۔یہ فلم 1956 میں ریلیز ہوئی تھی۔تھنجائی این۔ رمیّا داس نے تامل ورژن کے مکالمے اور بول لکھے۔T. Chalapathi Rao نے تامل گانوں کی موسیقی ترتیب دی۔

فلم حاتم طائی (1990)، کی ہدایت کاری بابو بھائی مستری کے ذمے تھی۔رتن موہن نے آر، ایم، آرٹ پروڈکشنز کے تحت اس فلم کو پروڈیوس کیا تھا۔

فلم علی بابا اور چالیس چور (1954) بھی عربی داستان 'الف لیلہ و لیلہ' سے ماخوذ ہے۔اس فلم کی ہدایت ہومی واڈیا نے کی تھی۔یہ فلم واڈیا برادرز پروڈکشن کے بینر تلے بسنت اسٹوڈیوز کی پیش کش تھی۔

علی بابا اور چالیس چور کی کہانی بہت دلچسپ ہے، جس میں، علی بابا ایک ایماندار غریب لکڑہارا ہے۔ایک دفعہ جنگل میں لکڑی کاٹتے ہوئے اس نے ڈاکوؤں کو ایک خفیہ غار میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، جس میں

ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا۔ جب ڈاکو غار سے واپس ہوگئے تو وہ جادوئی جملہ 'کھل جا سم سم' کے ذریعے غار میں داخل ہوجاتا ہے اور بہت سے ہیرے جواہرات اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ جب علی بابا کے لالچی بھائی قاسم کو خزانے کا علم ہوا تو وہ بھی خزانہ حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے اور چوروں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس فلم میں عرب معاشرے، قبیلوں کی زندگی، محنت کش لکڑہارے کی زندگی، دو بھائیوں کے مابین رقابت، معاشرے میں ڈاکوؤں کا عمل دخل، ڈاکوؤں کا خزانہ، دروازہ کھولنے کے لیے جادوئی الفاظ کا استعمال، قاسم کی لالچ، علی بابا کی ایمانداری، مرجینا کی حکمت عملی اور درزی کی مہارت وغیرہ کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے مذکورہ معاشرے کی تہذیب وثقافت اور عادات واطوار پر گہری روشنی پڑتی ہے۔

علی بابا اور چالیس چور کی داستان پر مبنی مذکورہ فلم کے علاوہ متعدد فلمیں بنائی گئیں، جن میں فلم علی بابا اور چالیس چور (1966) علی بابا اور چالیس چور (1980)، ایک ہندسوویت فلم ہے، جس کی ہدایت اُزبک ہدایت کار لطیف فیضیوف (Latif Faiziev) اور ہندستانی ہدایت کار اُمیش مہرا نے مشترکہ طور پر کی ہے۔ جسے آشا بھونسلے نے گایا ہے۔ ہندستانی سوویت مشترکہ پروڈکشن کی یہ سب سے کامیاب فلم تھی۔ علاوہ ازیں محبوب خان کی فلم علی بابا (1940) اور محمد حسین کی علی بابا (1976) بھی قابل ذکر ہیں۔

فلم علاء الدین اور جادوئی چراغ (1952) کی کہانی الف لیلہ ولیلہ کی کہانیوں میں سے ایک ہے، جو علاء الدین کی مہم جوئی اور غار میں جادوئی چراغ کی تلاش اور شہزادی بدر سے محبت پر مبنی ہے۔ اس فلم کی ہدایت اور فلم سازی، ہومی واڈیا نے کی تھی۔ یہ فلم، بسنت پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔

ہومی واڈیا نے بسنت اسٹوڈیو کے تحت اس موضوع پر دوبارہ 1978 میں 'علاؤالدین کے کارنامے' کے عنوان سے فلم بنائی تھی۔ اس فلم میں نقش اور کفیل آزر نے گیت لکھے اور ظفر راہی نے مکالمے فلم کے گلوکاروں میں آشا بھونسلے، محمد رفیع، انورادھا پوڈوال اور منّا ڈے شامل تھے۔ حمیر سُرتی نے فلم کا اسکرین پلے لکھا تھا۔ چترا گپتا نے فلم کی موسیقی تیار کی تھی۔ اس فلم میں سچن، نازنین، جے شری، رضا مراد، پینٹل، سدھیر، کنچن مٹو، اور پریما نارائن نے اداکاری کی ہے۔

فلم لیلیٰ مجنوں (1976) کی داستان بھی دنیا کی متعدد زبانوں میں انتہائی مقبولیت رکھتی ہے۔ یہ عربی زبان کی ایک مشہور داستان ہے۔ اس داستان کے متعلق خیال ہے کہ یہ ایک حقیقی عشقیہ داستان ہے۔

لیلیٰ مجنوں کی داستان کو عربی سے فارسی میں سب سے پہلے رودکی نے ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد شیخ نظامی گنجوی نے 'لیلیٰ مجنوں' (1188) کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کے کئی نسخے دستیاب ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ''لیلیٰ مجنوں نظامی'' کے عنوان سے منشی نول کشور نے 1904 میں شائع کیا تھا۔ امیر خسرو نے بھی لیلیٰ مجنوں کی داستان پر ایک مثنوی ''مجنوں لیلیٰ'' لکھی تھی، جسے مولانا حبیب الرحمٰن نے تصحیح وتنقید کے ساتھ اردو میں 1917 میں شائع کیا تھا۔ حیدر بخش حیدری نے ''قصۂ لیلیٰ مجنوں'' کے نام سے ایک داستان 1801 میں لکھی تھی، جو امیر خسرو کی فارسی مثنوی ''مجنوں لیلیٰ'' کا اردو میں نثری ترجمہ ہے۔ سترہویں صدی کے دکنی شاعر عاجز نے ''لیلیٰ مجنوں'' کے عنوان سے اردو میں ایک مثنوی 1636 میں لکھی تھی، جسے ڈاکٹر غلام عمر خاں، استاد، عثمانیہ یونیورسٹی نے 1967 میں مرتب کیا گیا۔ مرزا ہادی رسوا نے ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' کے عنوان سے ایک منظوم ڈراما لکھا تھا، جسے ترتیب دے کر عشرت رحمانی نے 1963 میں شائع کیا تھا۔ علاوہ ازیں لیلیٰ مجنوں کی داستانوں میں نظیر اکبرآبادی کی منظوم ''قصہ لیلیٰ مجنوں''، سید وصی حیدر کی ''قصہ لیلیٰ مجنوں'' اور محمد شفیع کی ''قصہ لیلیٰ و مجنوں'' بھی اہم ہیں۔ ہندوستان میں قصہ لیلیٰ مجنوں کی مقبولیت کے پیش نظر اس پر متعدد فلمیں بنائی جا چکی ہیں۔ بقول پریم پال اشک:

''مدن تھیٹر کی فلم لیلیٰ مجنوں نے بھی بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد اب تک 18 مرتبہ فلمایا جاچکا ہے۔ دو فلمیں خاموش دور میں آئیں اور 16 متکلم دور میں۔ ان میں سے 8 فلمیں ہندی میں اور ایک ایک فلم پنجابی، بنگلہ، تامل، تیلگو، ملیالم اور پشتو میں۔''[4]

لیلیٰ مجنوں پر بنائی گئی فلموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں چند کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے جے، جے، مدان کی 'لیلیٰ مجنوں' (1922)، منی لال جوشی کی لیلیٰ مجنوں (1927)، کانجی بھائی راتھوڈ کی لیلیٰ مجنوں (1931)، بی ایس راج ہنس کی لیلیٰ مجنوں (1933)، روشن لال شوری کی مجنوں (1936)، عبدالحسین سپنتا کی لیلیٰ ومجنوں (1937)، نذیر احمد خان کی لیلیٰ مجنوں (1945)، کے، امرناتھ کی لیلیٰ مجنوں (1953)، نسیم صدیقی کی لیلیٰ مجنوں (1954)، آر، ایل، دیسائی کی داستانِ لیلیٰ مجنوں (1974)، ہرنام سنگھ راویل کی لیلیٰ مجنوں 1976)، چندر اپیچ بہل کی 'سن میری لیلیٰ' (1983) اور ساون کمار ٹاک کی لیلیٰ (1984) وغیرہ۔

فلم لیلیٰ مجنوں کی داستان پر مبنی تمام فلموں میں سب سے مقبول اور کامیاب فلم ہرنام سنگھ راویل کی ہدایت میں بننے والی فلم 'لیلیٰ مجنوں' تھی، جو 11 نومبر، 1976 کو ریلیز ہوئی تھی۔ فلم کی کہانی، اسکرپٹ اور مکالمے کو ابرار علوی، انجنا راویل اور ہرنام سنگھ نے مشترکہ طور پر لکھا تھا۔ فلم کی موسیقی ساحر لدھیانوی کے نغموں کے ساتھ مدن موہن اور جے دیو نے ترتیب دی تھی۔

اس فلم کے تمام نغمے بہت مقبول ہوئے اور آج بھی دلچسپی کے ساتھ سنے جاتے ہیں۔ فلم کے نغموں میں 'حسن حاضر ہے' (لتا منگیشکر)، تیرے در پہ آیا ہوں (محمد رفیع)، اس ریشمی پازیب کی جھنکار (محمد رفیع، لتا منگیشکر)، اب اگر ہم سے خدائی بھی (محمد رفیع، لتا منگیشکر)، لکھ کر تیرا نام زمیں پر (محمد رفیع، لتا منگیشکر)، ''ہو کے مایوس تیرے در سے (محمد رفیع، عزیز نازاں، شنکر شمبھو، امبر کمار اور کورس)، یہ دیوانے کی ضد ہے اپنے (محمد رفیع)، لیلیٰ مجنوں دو بدن ایک جان تھے (استاد راجکمار رضوی، انورادھا پوڈوال، پریتی ساگر) اور کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو (لتا منگیشکر) شامل ہیں۔ اس فلم کو لازوال محبت اور قربانی کی موثر تصویر کشی کے لیے وسیع پیمانے پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس فلم میں رشی کپور اور رنجیتا کی جذبات سے لبریز اداکاری کو خوب سراہا گیا۔ فلم کی کامیابی نے ہندی سنیما میں نہ صرف اپنی جگہ مضبوط کی بلکہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔

گل بکاؤلی کا قصہ بھی اکثر اردو کی منظوم یا نثری داستانوں کا حصہ رہا ہے۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا قصہ بھی گل بکاولی پر مبنی ہے۔ نہال چند لاہوری کی نثری داستان 'مذہبِ عشق' (1804) ہے، جو تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستان پر مبنی ہے۔ نہال چند کی یہ داستان، شیخ عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف تاج الملوک وگل بکاولی (1722) کا اردو ترجمہ ہے۔ غرض یہ کہ گل بکاؤلی کی داستان بھی ہندستانی سنیما کا موضوع رہی ہے۔

خاموش فلم گل بکاؤلی (1924)، کوہ نور فلم کمپنی کے بینر تلے کانجی بھائی راٹھوڑ کی ہدایت میں بنی تھی۔ اس کی کہانی موہن لال دیو نے گجراتی میں لکھی تھی۔ فلم میں زبیدہ (بکاولی) اور خلیل (تاج الملوک) نے اداکاری کی ہے۔ گل بکاولی (1932)، ساگر موبی ٹون کے پروڈکشن میں اے، پی، کپور کی ہدایت میں بنی تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر فلمیں بنائی گئیں۔ برکات مہرا کی ہدایت میں ایک پنجابی فلم 'گل بکاولی' کے نام سے 1938 میں بھی بنی تھی، جسے ڈی ایم پانچولی نے پروڈیوس کیا تھا۔ ان میں ایک فلم ''گل بکاؤلی'' تامل زبان میں 1955 میں بنی، جس کے ہدایت کار اور فلم ساز ٹی، آر، رمنا تھے۔ فلم کا اسکرین پلے تھنجائی این، رمیہ داس نے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ ایک پاکستانی فلم گل بکاولی (1961)، زمان آرٹ پروڈکشنز کے تحت منشی دل کی ہدایت میں بنی تھی۔ فلم گل بکاؤلی (1963) کی ہدایت اور فلم سازی جگل کشور نے کی تھی۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں میں نیشی، جے راج، سپرو، سلوچنا چٹرجی وغیرہ شامل تھے۔

گل صنوبر کا قصہ بھی کافی مقبول رہا ہے۔ یہ قصہ پہلے فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ اب تک اس کے اردو نظم ونثر میں کئی ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن سب سے مقبول ترجمہ بعنوان ''قصہ گل وصنوبر''، منشی نیم چند کھتری کا ہے، جسے رفیق مارہروی نے مرتب کر کے 1962 میں شائع کیا تھا۔ منشی نیم چند کھتری کے مطابق گل وصنوبر کی داستان کچھ اس طرح ہے:

''قیوس شاہ ترکستان کی ریاست چین ماچین کا بادشاہ تھا، اس کی لڑکی مہر انگیز نہایت حسین وجمیل تھی، وہ جب جوان ہوئی تو اس کی شادی کا سوال پیدا ہوا، مہر انگیز نے اپنی شادی کی یہ شرط رکھی کہ میں اسی شخص سے شادی کروں گی جو میرے اس سوال کا صحیح جواب دے گا کہ ''گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا؟''

صنوبر کوہ قاف کا بادشاہ تھا اور گل اس کی بیوی تھی، بہت سے امیدوار مہر انگیز کی طلب میں اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے پہنچے لیکن ناکام رہے۔ مہر انگیز نے یہ بھی شرط لگا رکھی تھی کہ جو شخص میرے سوال کا جواب نہ دے سکے گا، اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ بہت سے سرفروش شاہزادے کشتۂ ستم ہوئے، مگر کسی سے اس کا سوال حل نہ ہو سکا۔ شمشاد لال پوش نام کا ایک بادشاہ تھا، اس کے لڑکے الماس روح بخش نے بھی مہر انگیز کے سوال کی جواب دہی کے لیے اپنے سر کی بازی لگائی اور بڑی کد وکاوش اور جدو جہد کے بعد اس نے مہر انگیز کے سوال کا بالکل صحیح جواب دے دیا۔ اس سوال کے حل کرنے میں اسے کتنی پریشانی اور کتنے خطرات کا مقابلہ کرنا پڑا، اس کی تفصیل بڑی حیرت ناک ہے۔ شاہزادہ الماس کو کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی اور اس پر کیا کچھ گزری، اس کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔''[5]

گل وصنوبر کے موضوع پر اردو میں متعدد منثور و منظوم داستانیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں میر تقی لکھنوی کی ''مثنوی گل وصنوبر'' (1881)، مرزا خداداد بیگ کا ''قصۂ گل وصنوبر'' (منظوم) اور پریم چند کا نثری قصہ ''قصۂ گل وصنوبر'' (1914) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی قصہ گل وصنوبر کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ ہندستانی سنیما میں بھی دیگر داستانوں کی طرح قصہ گل وصنوبر کو خصوصی جگہ دی گئی۔ اس موضوع پر متعدد فلمیں بنائی گئی ہیں، جن میں فلم گل صنوبر (1934)، کی ہدایت ہومی ماسٹر نے کی تھی۔ اس فلم کے اداکاروں میں روبی میئر، زبیدہ، زِلّو، لکشمی، اور دِنشا بلی موریہ وغیرہ شامل تھے۔ فلم گل صنوبر (1953) کی ہدایت آپسی ایرانی نے کی تھی۔ اس فلم میں آغا، حبیب، جگدیش کنول، شمی کپور اور شیاما نے اداکاری کی تھی۔ فلم گل صنوبر (1963) کی ہدایت اور فلم سازی جگل کشور نے کی تھی۔ اس کے مرکزی اداکاروں میں نیشی، جے راج، سپرو، سلوچنا چٹرجی جیسے ممتاز ستارے شامل تھے۔ قصہ گل صنوبر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فلم ساز دھیرو بھائی گوہل نے ''گل صنوبر'' کے نام سے 52 اپیسوڈ میں ڈی ڈی نیشنل کے لیے ایک سیریل بنایا تھا۔ جو 2000-1999 کے درمیان ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ گل صنوبر کا قصہ بھی قصہ الف لیلہ ولیلہ سے ماخوذ ہے۔

ہندستانی فلموں میں بڑی تعداد میں ہندو دیومالائی قصوں کہانیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندستانی لوک کتھاؤں میں وشنوشرما کی پنچ تنتر، نارائن پنڈت کی ہتوپدیش، بیتال بھٹ راؤ کی بیتال پچیسی، گوڑاڈھیہ کی برہت کتھا، سوم دیو بھٹ راؤ کی کتھا سرت ساگر کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اردو میں مظہر علی ولا کی ایک داستان ''بیتال پچیسی'' ہے، جسے فورٹ ولیم کالج کے تحت 1803 میں آسان اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ بیتال پچیسی کے موضوع پر ایک فلم ''وکرم بیتال'' 1986 میں بنی تھی، جس کی ہدایت شانتی لال سونی نے کی تھی۔ اس فلم کو فیروز ناڈیاوالا نے پروڈیوس کیا تھا۔ موسیقی ندیم شرون کی تھی اور اداکاروں میں وکرم گوکھلے، رجنی بالا، موہن شری، انجنا ممتاز، ستیش شاہ اور دیپیکا چیخالیا وغیرہ شامل تھے۔

مختصر یہ کہ حکایتوں، قصوں، کہانیوں، اساطیری و دیومالائی داستانوں میں سامعین کی دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ ہندوستان میں سنیما کا آغاز ہوا تو ایسی داستانوں اور کہانیوں کو خصوصی توجہ دی گئی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں قصوں، کہانیوں اور داستانوں کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔ داستانیں، اکثر لوک روایت کے ذریعے پروان چڑھتی رہی ہیں۔ حکائی ادب میں لوک کہانیوں کا کوئی ایک خالق نہیں ہوتا، بلکہ پورا معاشرہ ہوتا ہے۔ انھیں سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنیما میں بہت سی داستانوں کے مصنفین کو کریڈٹ نہیں دیا گیا۔ ان میں صرف اسکرپٹ نگار اور اسکرین پلے رائٹر کے نام درج ہیں۔ اگرچہ وہ داستانوں کے اصل خالق نہیں لیکن تقاضائے سنیما کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے داستانوں کو فلموں میں انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ سنیما کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو داستانوں کی نہ صرف بازیافت کی گئی ہے بلکہ زبانی روایت کو انتہائی فنکاری کے ساتھ پردۂ سیمیں پر محفوظ کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1 ہندستانی سنیما کے پچاس سال، پریم پال اشک، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2000، ص۔157

2 قصۂ حاتم طائی موسوم بہ آرائش محفل، حیدر بخش حیدری، تصحیح و ترتیب، اطہر پرویز، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 1972، ص۔5

3 ہندستانی سنیما کے پچاس سال، پریم پال اشک، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2000، ص۔157

4 ہندستانی سنیما کے پچاس سال، پریم پال اشک، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2000، ص۔142

5 قصہ گل وصنوبر، منشی نیم چند کھتری، مرتبہ رفیق مارہروی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1962، ص۔4-3

Prof. Ahmad Khan
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 (Telangana)
Email: ahmadk71@yahoo.co.in
Mob:9000138271



محمد فیضان

فینٹسی فلموں میں داستانوی عناصر

داستان انسانی تہذیب کی قدیم ترین بیانیہ روایات میں سے ایک ہے۔ انسان نے اپنی تخیلاتی قوت، متعجب احساسات اور نامعلوم دنیا کو جاننے کی خواہش کے اظہار کے لیے داستانوں کو وسیلہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر تہذیب میں ایسی داستانیں ملتی ہیں جن میں جادو، طلسم، دیو، پریاں، عجیب و غریب مخلوقات اور حیرت انگیز واقعات شامل ہیں۔ جدید دور میں جب فلم ایک طاقتور بصری وسیلہ بن کر سامنے آئی تو اس نے داستانی روایت سے گہرا رشتہ قائم کیا۔ خصوصاً فینٹسی فلموں نے داستان کے انھیں عناصر کو سنیما کی زبان میں پیش کیا۔ جدید بصری تکنیک، کمپیوٹر گرافکس، اینیمیشن اور وی۔ایف۔ایکس جیسی ٹیکنالوجی نے ان عناصر کو اس انداز سے پیش کیا کہ ناظر خود کو ایک خیالی مگر قابل یقین دنیا میں محسوس کرنے لگا۔ اس طرح فینٹسی فلمیں داستانی روایت کے تسلسل کی ایک جدید صورت بن گئیں۔ فینٹسی فلموں کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ انسانی تخیل کو وسعت دیتی ہیں اور حقیقت کی حدود سے آگے ایک ایسی دنیا تخلیق کرتی ہیں جہاں ناممکن بھی ممکن دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی خصوصیت انھیں داستان سے قریب کرتی ہے، کیونکہ داستان کا بنیادی وصف بھی حیرت اور تجسس کی فضا قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے فینٹسی فلموں میں داستانوی عناصر کا مطالعہ نہ صرف ادبی اہمیت رکھتا ہے بلکہ فلمی بیانیے کی ساخت اور اس کی جمالیات کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

فینٹسی فلمیں داستانوی روایت کی بصری توسیع ہیں۔ اگر داستان لفظوں کے ذریعے حیرت پیدا کرتی ہے تو فینٹسی فلم تصویر اور آواز کے ذریعے اسی حیرت کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

داستان اور فینٹسی کے درمیان سب سے مضبوط رشتہ تخیل کا ہے۔ دونوں اصناف حقیقت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایک ایسی کائنات تشکیل دیتی ہیں جہاں خیر و شر کی کشمکش، ہیرو کی مہم، جادوئی اشیا اور پراسرار مقامات کہانی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ فرق صرف اظہار کے وسیلے کا ہوتا ہے، جہاں داستان زبان اور بیان کے ذریعے اپنے اثرات مرتب کرتی ہے تو وہیں فینٹسی فلم انھیں عناصر کو بصری اور سمعی پیکر عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فینٹسی سنیما داستانوی روایت کے ارتقائی سفر کی ایک نئی منزل ہے۔ اس نظریاتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فینٹسی فلموں میں موجود داستانوی عناصر کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل ادبی اور ثقافتی روایت کا تسلسل ہیں، جس نے مختلف ادوار میں نئے ذرائع اظہار اختیار کرتے ہوئے اپنی معنویت کو برقرار رکھا ہے۔

داستانوں کی طرح فینٹسی فلموں میں بھی طلسم یا جادو کا مقصد صرف بصری حیرت پیدا کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہی طلسم اور جادو پوری کہانی کی ساخت، کرداروں کے باہمی تعلقات اور واقعات کے تسلسل کو منظم کرتے ہیں۔ مرکزی کردار کو اکثر اسی طلسمی دنیا میں داخل ہونا پڑتا ہے، جہاں اسے مختلف آزمائشوں مثلاً پراسرار مقامات اور غیر معمولی دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح طلسم یا جادو داستانی بیانیے کو مسلسل حرکت میں رکھتے ہیں اور ناظر کے تجسس کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہالی وڈ کی Harry Potter کی جادوئی دنیا، The Lord of the Rings کی مڈل ارتھ اور The Chronicles of Narnia کی نارنیا، ایک ایسی طلسمی فضا قائم کرتی ہیں جو داستانوی روایت کے طلسمات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اسی طرح بالی وڈ کی Aabra Ka Daabra مکمل طور پر جادوئی دنیا، جادوئی تعلیم اور غیر معمولی قوتوں کے گرد گھومتی ہے۔ فلم میں جادو سیکھنے کے مراحل، جادوئی مقابلے اور جادوئی ماحول داستانوی روایت کے اس تصور کو تقویت دیتے ہیں کہ جادو صرف طاقت کا اظہار نہیں بلکہ کردار کی قابلیت، اخلاق اور بصیرت کا امتحان بھی ہے۔ دکنی ہندوستانی فلم Puli میں جادو داستانوی بیانیے کی مرکزی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ فلم میں جادوگرنی، طلسمی سلطنت، مافوق الفطرت طاقتیں اور جادوئی ہتھیار پوری کہانی کے ارتقا کو متاثر کرتے ہیں۔ مرکزی کردار کو ایسی جادوئی قوتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کو صرف جسمانی طاقت سے شکست نہیں دی جا سکتی بلکہ عزم، ذہانت اور اخلاقی برتری کی بھی ضرورت ہے۔ اس طرح فلم جادو کو خیر و شر کی علامتی کشمکش کے ساتھ مربوط کرتی ہے، جو کہ داستانوں کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ان تمام فلموں میں طلسم اور جادو صرف منظر آرائی تک محدود نہیں رہتے بلکہ کرداروں کی نفسیات اور

خیر وشر کی کشمکش کا بنیادی پس منظر بھی بن جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے فینٹسی سنیما نے داستانوی طلسم یا جادو کو نئی بصری اور فنی جہت عطا کی ہے، تاہم اس کی بنیادی ساخت اور مقصد وہی ہے جو داستانوں میں ملتا ہے۔

داستانوں کی طرح فینٹسی فلموں میں بھی مافوق الفطرت کردار سامنے آتے ہیں۔ فلموں میں اس کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر Avatar میں ناوی اور پینڈورا کے روحانی و فطری وجود ایک منفرد مافوق الفطرت دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب کہ Alice in Wonderland میں بولنے والے جانور، سفید خرگوش، چیشائر بلی اور ہیٹر جیسے غیر معمولی کردار ایک ایسی خیالی دنیا تخلیق کرتے ہیں جو مکمل طور پر داستانوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اسی طرح بالی وڈ فلم Hatim Tai میں بھی مافوق الفطرت کردار داستانی بیانیے کی بنیاد ہیں۔ اس فلم میں گلنار پری اور پری بانو جیسی پریاں حسن اور روحانی قوت کی نمائندگی کرتی ہیں، جب کہ جادوگر کملاق اپنی طاقتوں کے ذریعے مرکزی کردار کے لیے مسلسل رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جنات، دیو ہیکل مخلوقات اور طلسمی محافظ جیسے مافوق الفطرت کردار بھی کہانی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ان تمام کردار میں کچھ ہیرو کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تو کچھ اس کی مدد کرتے ہیں، جس سے پوری فلم میں حیرت و تجسس کی فضا قائم رہتی ہے۔

ہیرو داستان کا مرکزی کردار ہوتا ہے جس کے گرد پوری داستان تشکیل پاتی ہے۔ فینٹسی فلموں میں بھی ہیرو کا داستانوی سفر کہانی کی بنیادی ساخت کو منظم کرتا ہے۔ اگرچہ ہر فلم کا ثقافتی اور فنی پس منظر مختلف ہوتا ہے، لیکن مرکزی کردار کی آزمائشیں اور اس کی فکری یا روحانی نشوونما تقریباً ہر فینٹسی بیانیے کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ اور یہی سفر فلم کو حیرت انگیز مناظر کے مجموعے سے آگے بڑھا کر ایک مربوط داستانوی تجربہ بنا دیتا ہے۔

بالی وڈ فینٹسی فلم Brahmastra: Part One-Shiva میں مرکزی کردار شیوا ابتدا میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے ناواقف ہوتا ہے، لیکن حالات اسے ایک ایسی مہم میں داخل کر دیتے ہیں جہاں اسے اپنی قوت اور اپنی ذمہ داری کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ سفر داستانوی روایت کے اس ہیرو کی یاد دلاتا ہے جو اپنی اصل حقیقت کو مختلف آزمائشوں کے بعد دریافت کرتا ہے۔ چینی فلم The Monkey King میں سن ووکونگ کا کردار طاقت، غرور، بغاوت اور بعد ازاں خود شناسی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اس کا سفر صرف جسمانی فتوحات تک محدود نہیں رہتا بلکہ روحانی ارتقا کی بھی علامت بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور چینی فلم Journey to the West: Conquering the Demons میں مرکزی کردار مسلسل آزمائشوں سے گزرتا ہے اور تجربات کے ذریعے اپنی شخصیت کو مکمل کرتا ہے۔ یہ سفر چینی داستانوی روایت میں ہیرو کی تربیت اور اخلاقی تکمیل کے تصور کو نمایاں کرتا ہے۔ جاپانی اینیمیشن فلم Princess Mononoke کا اشیتا ایک ایسے سفر پر روانہ ہوتا ہے جس میں ذاتی مفاد کے بجائے فطرت اور انسانی طاقت کے درمیان توازن تلاش کرنا اس کا اصل مقصد بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ جاپانی فینٹسی فلم ہیرو کی کامیابی، دشمن کو شکست دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی بصیرت کا بھی مظاہرہ کرتی ہے۔ مذکورہ ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فینٹسی فلموں میں ہیرو کا سفر صرف ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے کا عمل نہیں بلکہ خود شناسی، اخلاقی ارتقا، ذمہ داری کا احساس اور اجتماعی بھلائی کے لیے جدوجہد کی علامت ہے۔ داستانوں میں بھی ہیرو کی اصل کامیابی دشمن کو شکست دینے سے زیادہ اپنی شخصیت کی تکمیل میں مضمر ہوتی ہے۔ فینٹسی سنیما نے اسی داستانوی روایت کو نئے ثقافتی، فنی اور بصری اسلوب میں پیش کیا ہے۔

ہیرو داستان کا مرکزی کردار ہوتا ہے جس کے گرد پوری داستان تشکیل پاتی ہے۔ فینٹسی فلموں میں بھی ہیرو کا داستانوی سفر کہانی کی بنیادی ساخت کو منظم کرتا ہے۔ اگرچہ ہر فلم کا ثقافتی اور فنی پس منظر مختلف ہوتا ہے، لیکن مرکزی کردار کی آزمائشیں اور اس کی فکری یا روحانی نشوونما تقریباً ہر فینٹسی بیانیے کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ اور یہی سفر فلم کو حیرت انگیز مناظر کے مجموعے سے آگے بڑھا کر ایک مربوط داستانوی تجربہ بنا دیتا ہے۔

جادوئی اشیا بھی داستانوی ادب کا اہم عنصر ہیں، جو ہیرو کی مہم اور واقعات کے تسلسل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اردو داستانوں، بالخصوص الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا میں جادوئی اشیا مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے ذریعے حیرت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ کہانی کی ساخت اور کرداروں کی نفسیاتی تشکیل بھی کی جاتی ہے۔ اکثر مرکزی کردار کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار کسی مخصوص جادوئی شے پر ہوتا ہے، جس کی تلاش یا حفاظت پوری فلم کو آگے بڑھاتی ہے۔

ہالی وڈ فینٹسی فلم Stardust میں آسمان سے گرا ہوا ستارہ محض ایک فلکیاتی جسم نہیں بلکہ ایک جاندار اور جادوئی وجود کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جب کہ ایک طلسمی ہار اور دیگر پراسرار اشیا اقتدار کی خواہش اور لالچ کی علامت بن کر کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ اور The Lord of the Rings میں عصا کے ذریعے رونما ہونے والی مختلف توانائیاں اور جادوئی انگوٹھی کی حفاظت جادوئی اشیا کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح Mirror Mask میں جادوئی نقاب حقیقت اور خواب کی دنیا کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا ہے اور مرکزی کردار کی خود شناسی کے سفر میں بنیادی کردار بھی ادا کرتا ہے۔ چینی فینٹسی فلم The Yin-Yang Master میں مختلف روحانی تعویذات، جادوئی مہریں اور طلسمی ہتھیار مافوق الفطرت قوتوں سے مقابلے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ یہ اشیا اس فلم میں صرف جنگی طاقت کی علامت نہیں بلکہ روحانی توازن اور کائناتی نظم کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی طرح The Monkey King میں سن ووکونگ کا جادوئی عصا محض ایک ہتھیار نہیں بلکہ اس کی غیر معمولی شخصیت اور قوت کا استعارہ ہے۔ جب کہ بالی وڈ کی فلم: Brahmastra: Part One-Shiva میں 'برہماستر' ایک ایسی الوہی اور غیر معمولی طاقت ہے جس کے گرد پوری کہانی گردش کرتی ہے۔ یہاں جادوئی شے ایک ہتھیار کے ساتھ ساتھ ذمہ داری، تحفظ اور تباہی کے امکانات کا استعارہ بھی بن جاتی ہے۔ اسی طرح جاپانی اینیمیشن فلموں میں بھی جادوئی اشیا کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ Howl's Moving Castle میں جادوئی ہار، متحرک قلعہ اور آتشی روح داستانوی بیانیے کو متحرک کر دیتے ہیں، اور The Boy and the Beast میں مخصوص اسلحے اور تربیتی اوزار مرکزی کردار کی ذہنی اور جسمانی

نشوونما کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فینٹسی فلموں میں جادوئی اشیا داستانوی روایت کی ایک زندہ و جاوید علامت ہیں۔

خیر وشر کی کشمکش بھی داستانوں کا ایک بنیادی عنصر ہے، جس کے بغیر بیشتر داستانیں اپنی معنوی تکمیل حاصل نہیں کرتیں۔ جدید سنیما نے اس تصور کو زیادہ نفسیاتی اور سماجی جہتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کئی فلموں میں خیر و شر مطلق اور یک رخی نہیں رہتا بلکہ اس کے پس منظر اور داخلی تضادات کو بھی نمایاں کیا جاتا ہے، جس سے کہانی میں معنوی گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

ہسپانوی فلم Pan's Labyrinth میں خیر و شر کی کشمکش ایک منفرد انداز میں سامنے آتی ہے۔ فلم میں ایک طرف معصوم بچی اوفیلیا کی تخیلاتی دنیا ہے، جو امید اور معصومیت کی نمائندگی کرتی ہے تو دوسری طرف فاشسٹ اقتدار اور جبر و تشدد کی علامت کیپٹن ویدال موجود ہے۔ یہاں خیر و شر کا تصادم صرف خیالی دنیا تک محدود نہیں بلکہ سیاسی اور انسانی حقیقت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ چینی فلم Painted Skin میں خیر و شر کی سرحدیں زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک شیطانی وجود انسانی جذبات کی خواہش رکھتا ہے، جس سے ناظر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شر ہمیشہ فطری ہوتا ہے یا بعض اوقات حالات اور خواہشات بھی اسے جنم دیتے ہیں۔ اس طرح یہ فلم داستانوی کشمکش کو نفسیاتی سطح تک وسعت دیتی ہے۔ جب کہ بالی وڈ فلم Bulbbul میں خیر و شر کا تصور روایتی داستانوں سے مختلف زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ فینٹسی فلموں نے خیر و شر کی داستانوی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئی فکری جہتیں شامل کی ہیں۔ داستانوں میں یہ کشمکش نسبتاً واضح اور دوٹوک ہوتی ہے جب کہ فینٹسی فلمیں اسے نفسیاتی اور سماجی تناظر میں بھی سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے باوجود بنیادی مقصد وہی رہتا ہے جو داستانوی روایت کا وصف ہے، یعنی انسان کو اخلاقی ذمہ داری اور انصاف کی اہمیت کا شعور دینا۔

فینٹسی فلموں میں مہم جوئی یا جستجو خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ مرکزی کردار کو کسی غیر معمولی مقصد کے لیے اپنی مانوس دنیا سے نکل کر ایک اجنبی، پراسرار اور خطرناک دنیا میں داخل ہونا پڑتا ہے، جس میں وہ مہم جوئی اور جستجو کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو پہچانتا اور مشکلات پر قابو پاتا ہے۔ ہالی وڈ فینٹسی فلم The Never Ending Story میں ایک لڑکا کتاب کے ذریعے ایک خیالی دنیا میں داخل ہوتا ہے، جہاں اس کی جستجو صرف اس دنیا کو بچانے تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ اپنی ذات، خوف اور امید کو بھی نئے انداز میں سمجھنے لگتا ہے۔ یہاں مہم جوئی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بالی وڈ فلم Jajantaram Mamantaram میں مرکزی کردار ایک ایسے جزیرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں دیوقامت انسان بستے ہیں۔ یہ اجنبی دنیا اسے مسلسل نئے تجربات، غیر متوقع حالات اور مختلف آزمائشوں سے گزارتی ہے۔ ان حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ نہ صرف اپنی بقا کو یقینی بناتا ہے بلکہ اعتماد، قیادت اور دانش مندی جیسی صفات بھی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح فلم داستانوی مہم کو کردار سازی کے عمل سے جوڑ دیتی ہے۔ جب کہ چینی فلم Monster Hunt میں مرکزی کردار کا سفر ابتدا میں ذاتی بقا سے شروع ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ انسانوں اور مافوق الفطرت مخلوقات کے درمیان امن اور بقائے باہمی کی جدوجہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس فلم میں مہم جوئی صرف جسمانی خطرات سے نبرد آزما ہونے کا نام نہیں بلکہ خوف اور باہمی عدم اعتماد پر قابو پانے کی علامت بھی ہے۔ اسی طرح جاپانی فلم Spirited Away میں چیہیرو کا سفر ایک جادوئی دنیا میں داخل ہونے سے شروع ہوتا ہے، جہاں اسے مسلسل مختلف آزمائشوں اور غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان تجربات کے ذریعے وہ خوف زدہ اور کمزور بچی سے ایک ذمہ دار اور باہمت شخصیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ داستانوں ہی کی طرح فینٹسی سنیما میں بھی اصل اہمیت منزل سے زیادہ سفر کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہی سفر کردار کو نئے تجربات، نئی بصیرت اور نئی شناخت عطا کرتا ہے۔

اردو داستانوں میں خیالی دنیا کی تشکیل کا بہترین نمونہ طلسم ہوش ربا میں ملتا ہے، جہاں طلسمی شہر، پراسرار قلعے، جادوئی باغات، زیر زمین محلات، عجیب مخلوقات اور حیرت انگیز مقامات ایک خیالی کائنات تشکیل دیتے ہیں۔ اس دنیا کی اپنی داخلی منطق اور ترتیب ہوتی ہے، جس کی وجہ سے قاری اسے محض تخیل نہیں بلکہ ایک مکمل حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ یہی خصوصیت داستان کو عام قصے سے ممتاز کرتی ہے۔ فینٹسی فلموں نے بھی اس داستانوی عنصر کو سنیمائی امکانات کے ذریعے مزید وسعت دی ہے۔ جدید بصری ٹیکنالوجی کے ذریعے فلم ساز ایسی دنیا تخلیق کرتے ہیں جو بیک وقت حیرت انگیز اور جمالیاتی طور پر مربوط ہوتی ہے۔ اور اس تخیلاتی دنیا کا ہر مقام، ہر کردار اور ہر شے ایک وسیع داستانوی نظام کا حصہ محسوس ہوتی ہے۔

ہالی وڈ فلم Avatar میں سیارہ پینڈورا ایک ایسی خیالی دنیا کے طور پر سامنے آتا ہے جس کی اپنی حیاتیاتی ساخت، نباتات، حیوانات، زبان، رسوم اور روحانی عقائد ہیں۔ فلم کا تخیلاتی حسن صرف بصری مناظر تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس تخیلاتی دنیا کی داخلی تنظیم بھی حقیقت کا احساس دلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پینڈورا محض فلم کا مقام نہیں بلکہ ایک زندہ داستانوی کائنات بن جاتا ہے۔ جب کہ چینی انیمیشن فلم Big Fish Begonia میں سمندر، ارواح کی دنیا اور انسانی دنیا ایک دوسرے سے مربوط مگر الگ الگ کائناتوں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ فلم ان دنیاؤں کے درمیان تعلق اور توازن کو اس انداز میں واضح کرتی ہے کہ ناظر اس خیالی نظام کو ایک مکمل حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ اسی طرح بالی وڈ فلم Paheli میں راجستھانی لوک روایت، دیہی ماحول اور روحانی وجود مل کر ایک ایسی دنیا تشکیل دیتے ہیں جس میں مافوق الفطرت واقعہ ایک فطری حقیقت کے طور پر قبول ہونے لگتا ہے۔ یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ فینٹسی فلموں میں خیالی دنیا کی تشکیل صرف تخلیقی مہارت کا اظہار نہیں بلکہ داستانی بیانیے کی بنیادی ضرورت ہے۔ جس طرح داستان اپنے طلسمی ماحول اور حیرت انگیز مقامات کے ذریعے قاری کو ایک نئی کائنات میں داخل کرتی ہے۔ اسی طرح فینٹسی فلمیں بھی جدید بصری زبان کے ذریعے ناظر کے سامنے ایک مکمل متبادل دنیا پیش کرتی ہیں۔

وقت اور مکان ہر داستان کی بنیادی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، لیکن داستانوی ادب میں یہ دونوں عناصر حقیقت پسندانہ ادب کی طرح محدود اور جامد نہیں ہوتے بلکہ داستانوں میں وقت اپنے معمول کی رفتار سے آزاد ہوتا ہے اور مکان جغرافیائی حدود سے ماورا ایک ایسی وسعت اختیار کر لیتا ہے جہاں طلسمی شہر، پراسرار جزیرے، آسمانی دنیا اور نامعلوم سرزمینیں ایک ہی بیانیے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ فینٹسی فلموں میں بھی داستانوی وقت و مکان ایک بنیادی اور اہم عنصر ہے۔

فلم ساز حقیقی دنیا کے ساتھ ساتھ ایسی متبادل دنیا تخلیق کرتے ہیں جہاں وقت کا بہاؤ اور فاصلوں کا تصور عام انسانی تجربے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہی خصوصیت ناظر کو ایک داستانوی کائنات میں داخل ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

ہالی وڈ فلم Alice in Wonderland میں ایلس خرگوش کے بل کے ذریعے ایک ایسی دنیا میں داخل ہوتی ہے جہاں وقت اور مکان کے اصول بدل جاتے ہیں اور وقت ایک علامتی عنصر بن جاتا ہے، جو فلم کے تخیلاتی مزاج کو تقویت دیتا ہے۔ ساتھ ہی کرداروں کا طرز عمل اور مقامات کی ساخت خواب اور حقیقت کے درمیان ایک داستانوی فضا پیدا کرتی ہے۔

جب کہ چینی فلم The Yin-Yang Master میں انسانی دنیا اور ارواح کی دنیا ایک دوسرے کے ساتھ متوازی طور پر نظر آتی ہیں۔ ان دونوں جہانوں کے درمیان مختلف زمانی و مکانی قوانین اور ان کے باہمی تعلقات فلم کے داستانوی ڈھانچے کو تشکیل دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس فلم سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فینٹسی سنیما مکان کو جغرافیائی تصور کے ساتھ روحانی اور مابعد الطبیعیاتی حقیقت کے طور پر بھی پیش کرسکتا ہے۔ اسی طرح بالی وڈ فلم Brahmastra Part One-Shiva میں اگرچہ کہانی حقیقی ہندوستانی شہروں میں وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی پوشیدہ دنیا بھی موجود ہے، جہاں قدیم اساطیری قوتیں، خفیہ تنظیمیں اور غیر معمولی طاقتیں سرگرم ہیں۔ اس طرح فلم حقیقی اور خیالی مکان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے داستانوی فضا قائم کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور بالی وڈ فلم Aladin میں ایک جادوئی چراغ اور جن کی موجودگی عام شہری ماحول کو ایک ایسی داستانوی دنیا میں تبدیل کر دیتی ہے جہاں حقیقت اور تخیل ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں۔ اور جادوئی عناصر کے باعث کردار مختلف زمانی اور مکانی تجربات سے گزرتے ہیں، جس سے فلم کا بیانیہ داستانوی وقت و مکان کی خصوصیات اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل فینٹسی فلموں میں داستانوی عناصر کی یہ موجودگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ داستانوی روایت اپنی قدامت کے باوجود آج بھی انسانی تخیل اور اجتماعی شعور میں زندہ ہے۔ اگرچہ ذرائع اظہار بدل چکے ہیں اور زبانی و تحریری داستانوں کی جگہ بڑی حد تک سینما نے لے لی ہے تاہم داستان کے بنیادی اجزا اپنی اصل معنویت کے ساتھ آج بھی فینٹسی فلموں میں موجود ہیں۔

داستانیں ہمیشہ اپنے عہد کے فکری، تہذیبی اور سماجی تصورات کی نمائندہ رہی ہیں۔ داستانوں میں جادو، طلسم، دیو، پریاں، غیر معمولی ہیرو اور طویل مہمات محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ ان کے ذریعے خیر و شر، عدل و ظلم، وفاداری، قربانی اور انسانی حوصلے جیسے

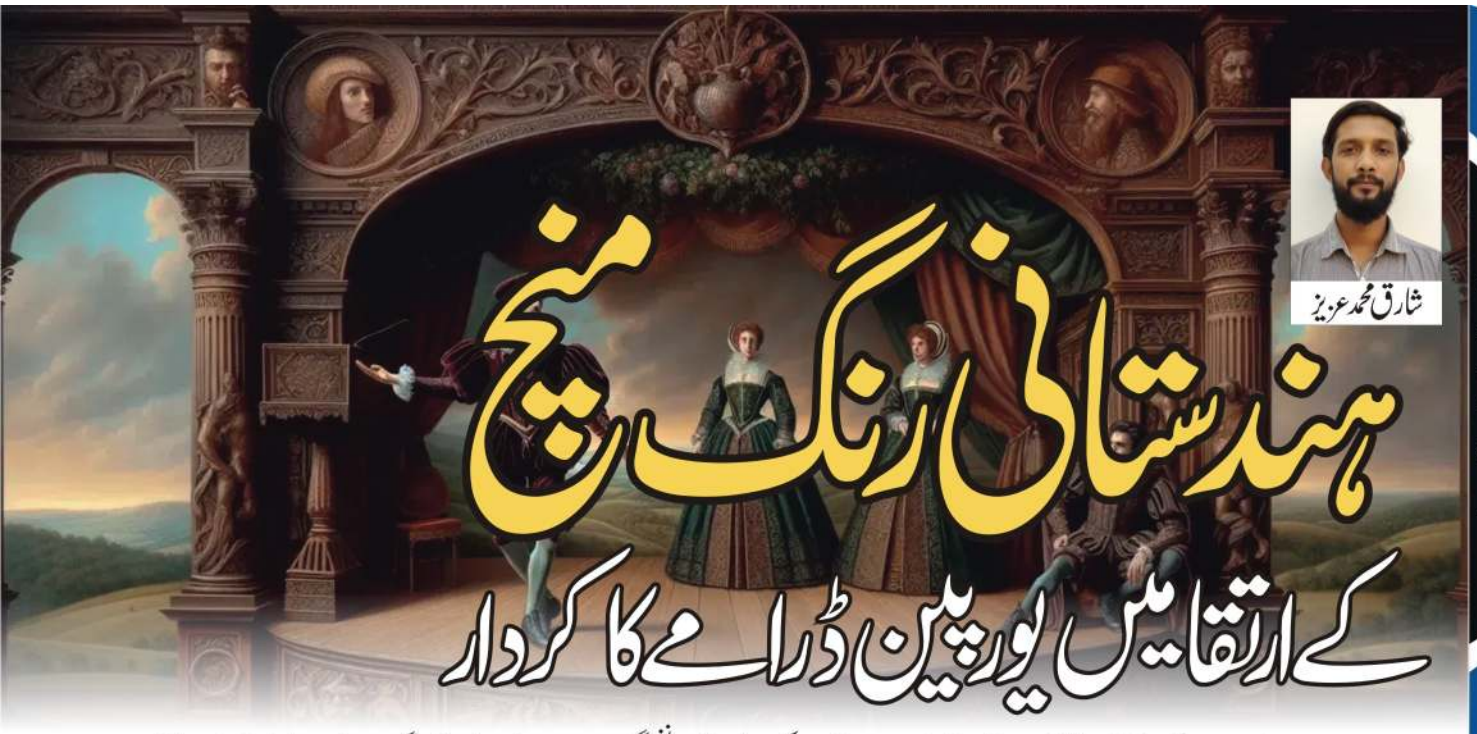


تصورات کو علامتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ فینٹسی فلمیں بھی انھیں موضوعات کو نئے عہد کے تناظر میں پیش کرتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ان تصورات کو الفاظ کے بجائے متحرک تصاویر اور جدید بصری تکنیک کے ذریعے زیادہ مؤثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ فینٹسی فلموں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختلف تہذیبوں کی داستانوی، اساطیری اور لوک روایات کو ایک عالمی ثقافتی مکالمے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر چینی فینٹسی فلمیں بدھ مت، تاؤ مت اور قدیم چینی اساطیر سے اثر قبول کرتی ہیں، جاپانی فینٹسی فلمیں شنتو عقائد، دیومالائی مخلوقات اور لوک کہانیوں کو نئی تعبیر دیتی ہیں، جب کہ ہندوستانی فینٹسی سنیما قدیم اساطیری روایات، ہندو دیومالائی عقائد اور داستانوی عناصر کو فینٹسی سنیمائی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح مغربی فینٹسی فلمیں یورپی لوک داستانوں اور قرون وسطیٰ کی رزمیہ روایات سے اپنے موضوعات اخذ کرتی ہیں۔ اس تنوع کے باوجود ان تمام فلموں میں داستانوی عناصر کی بنیادی ساخت حیرت انگیز طور پر مشترک دکھائی دیتی ہے۔

فینٹسی فلمیں اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ وہ جدید انسان کو ایسی دنیا سے روشناس کراتی ہیں جہاں حقیقت اور تخیل ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ یہ فلمیں اس تصور کو تقویت دیتی ہیں کہ تخیل محض حقیقت سے فرار کا ذریعہ نہیں بلکہ حقیقت کو نئے زاویوں سے سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے۔ اسی لیے فینٹسی سنیما میں تخلیق کی جانے والی خیالی دنیا اکثر حقیقی دنیا کے اخلاقی، سماجی، ماحولیاتی اور انسانی مسائل کی علامتی تعبیر بن جاتی ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو داستانوی عناصر آج بھی انسانی فکر کی تشکیل میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ جدید فلمی صنعت میں کمپیوٹر گرافکس، وی، ایف، ایکس تکنیک، بصری اثرات اور مصنوعی ذہانت جیسی جدید ٹیکنالوجی نے فینٹسی فلموں کے اظہار کو بے مثال وسعت عطا کی ہے لیکن ان تمام تکنیکی امکانات کے باوجود کسی بھی فینٹسی فلم کی اصل قوت اس کے داستانوی بیانیے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر مضبوط کہانی، مؤثر کردار، مربوط خیالی دنیا اور بامعنی کشمکش موجود نہ ہو تو محض بصری چمک دمک فلم کو دیرپا اہمیت نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کامیاب فینٹسی فلمیں ہمیشہ اپنے داستانوی ڈھانچے کی مضبوطی کی وجہ سے یاد رکھی جاتی ہیں۔ اس طرح فینٹسی فلموں میں داستانوی روایت کی معنویت صرف ادبی یا فلمی مطالعے تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ مختلف تہذیبوں کی حفاظت اور انسانی اقدار کے تسلسل کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ فینٹسی سنیما نے داستان کے بنیادی عناصر کو نئے فنی وسائل کے ساتھ ہم آہنگ کر کے انھیں نئی نسلوں تک منتقل کیا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ داستان ایک زندہ روایت ہے جو ہر عہد میں اپنے اظہار کے لیے نئے ذرائع اختیار کرتی رہتی ہے۔ اور یہی تسلسل فینٹسی فلموں کو تفریحی ذریعہ کے ساتھ داستانوی ورثے کی جدید اور مؤثر تعبیر بھی بناتا ہے۔

■

Mohd. Faizan
Near Laal Masjid, Pipalsana, Moradabad, Uttar Pradesh – 244402, India
Mob. 9536439838
Email: mohdfaizan2024@gmail.com



ہندستانی رنگ منچ

کے ارتقا میں یورپین ڈرامے کا کردار

شارق محمد عزیز

ہندوستان میں ڈرامے کی اپنی ایک قدیم، مستحکم اور فلسفیانہ روایت پہلے سے موجود تھی، جس کی عمر مغربی ڈرامے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس روایت کا شاکلہ بھرت منی کے مرتب کردہ صحیفے ''ناٹیہ شاستر'' پر رکھی گئی، جو غالباً دوسری صدی قبل مسیح اور دوسری صدی عیسوی کے درمیان مرتب ہوا۔ اس صحیفے میں رقص، موسیقی اور اداکاری کے اصول، اداکاروں کے چار انداز یعنی جسمانی حرکات، صوتی اظہار، لباس و بناؤ سنگار اور جذباتی اظہار تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس صحیفے کا مرکزی تصور ''رَس'' کا فلسفہ ہے جس کے مطابق کسی بھی ڈرامائی پیشکش کی کامیابی کا اصل معیار یہ ہے کہ آیا وہ تماشائی کے دل میں ایک خاص قسم کی جمالیاتی و روحانی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں۔ بھرت منی نے نو بنیادی رسوں کی نشان دہی کی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی جمالیات میں فن اور روحانیت کبھی الگ نہیں سمجھے گئے۔

اس فلسفے کی سب سے شاندار مثال کالیداس کا شاہکار ڈراما ''ابھِگیان شکنتلا'' ہے، جسے سنسکرت ادب کا تاج قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بالکل برعکس مغربی ڈرامے کی روح خواہ وہ یونانی سانحاتی روایت ہو یا نشاۃ ثانیہ کے بعد پروان چڑھنے والے ڈرامے ہوں، دونوں کی بنیاد تصادم یعنی کانفلکٹ پر استوار ہے۔ چاہے وہ دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان تصادم ہو، انسان اور انسان کے درمیان جدوجہد، یا فرد کے اندرونی جذبات اور خواہشات کی کشمکش۔ ارسطو نے ''بوطیقا'' میں سانحے کے چھ لازمی اجزا بیان کیے، جن میں پلاٹ، کردار، فکر، اسلوب کلام، نغمگی اور منظر نگاری شامل ہیں۔ ان میں سے پلاٹ کو سب سے اہم قرار دیا، کیونکہ کہانی ہی ڈرامے کا محور ہے۔

یہ دونوں نظام قرنوں تک ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے سے قاصر رہے۔ پھر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لیے، اسی تصادم اور بعد میں پیدا ہونے والے طویل تعامل نے ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ میں ایک نیا اور فیصلہ کن باب رقم کیا۔

1775 کے قریب برطانوی ہند کا انتظامی، تجارتی اور ثقافتی مرکز کلکتہ میں یورپی باشندوں نے اپنی ذاتی تفریح کے لیے تھیٹر تعمیر کرنا شروع کیے۔ کلکتہ پلے ہاؤس جسے نیو پلے ہاؤس بھی کہا جاتا ہے کی تعمیر اس سلسلے کی ایک اہم اور ابتدائی کڑی تھی۔ ان تھیٹروں میں بنیادی طور پر شیکسپیئر اور دیگر انگریزی ڈراما نگاروں کے ڈرامے پیش کیے جاتے تھے، اور ان کے سامعین بھی زیادہ تر برطانوی تاجر، فوجی افسر اور نوآبادیاتی انتظامیہ کے اہل کار تھے۔ اس ابتدائی دور میں عام ہندوستانی ان تھیٹروں کی چہل پہل سے تقریباً بالکل بے خبر تھا، انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم کے منظّم فروغ کے ساتھ دور رس اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے۔ 1817 میں قائم ہونے والا ہندو کالج کلکتہ اس سلسلے کا ایک نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کے بعد قائم ہونے والے دیگر مشنری و سرکاری اداروں میں شیکسپیئر اور دیگر مغربی کلاسیکی ادب کو باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ مگر تاریخ کی ایک عجیب ستم ظریفی یہ رہی کہ اسی نصاب سے ایک ایسی نئی، انگریزی خواں بنگالی اشرافیہ نے جنم لیا جو مغربی ڈرامائی روایت سے گہری اور غیر معمولی واقفیت رکھتی تھی۔ یہی وہ طبقہ تھا جس نے بنگالی زبان میں مغربی طرز کے ڈرامے تخلیق کرنے کی راہ ہموار کی اور نوآبادیاتی نظام تعلیم کو اس کے اپنے مقاصد کے برخلاف ایک تخلیقی ہتھیار میں تبدیل کر دیا۔

بنگالی ڈرامے میں مغربی اثر کی نمایاں ترین مثال مائیکل مدھوسودھن دت (1824-1873) کی ہے۔ انھوں نے 1843 میں عیسائیت قبول کی وہ بائرن جیسے رومانوی شاعروں اور شیکسپیئر جیسے ڈراما نگاروں سے شدید متاثر تھے۔ کچھ عرصہ برطانیہ اور فرانس میں گزارنے اور مغربی زندگی کو نہایت قریب سے دیکھنے کے بعد جب وہ 1856 میں کلکتہ واپس لوٹے تو انھیں محسوس ہوا کہ بنگالی زبان میں اچھے اور معیاری ڈراموں کی شدید کمی ہے۔ بیلگاچھیا تھیٹر سے وابستگی کے دوران انھوں نے 1859 میں اپنا ڈراما ''شرمشٹھا'' تحریر کیا۔ اس ڈرامے کو بنگالی زبان کا پہلا مکمل مغربی طرز کا ڈراما تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ ڈراما مہابھارت کے ایک قصے پر مبنی ہے۔ اس میں راجا یایاتی، اس کی بیوی دیوینی اور اسور راج کی بیٹی شرمشٹھا کے درمیان ایک پیچیدہ محبت کے مثلث کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ڈرامے کی ہیئت مکمل طور پر مغربی ہے۔ مدھوسودھن دت نے اسے پابند نظم کی بجائے بلینک ورس (بلا قافیہ آزاد نظم) میں لکھا، جو اس وقت تک بنگالی ادب کے لیے ایک نرالی بات تھی۔ اسی سال انھوں نے ''پدماوتی'' بھی لکھا، اور اس سے اگلے سال ایک اور اہم المیہ ڈراما ''کرشنا کماری'' (1860) تخلیق

کیا۔ کرشنا کماری کو آج بھی بنگالی ادب کے کامیاب ترین سانحاتی ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان ڈراموں کی خاص اور انقلابی بات یہ تھی کہ ان میں پہلی بار خواتین کرداروں، خصوصاً شرمشٹھا اور دیوینی، کو ایک پیچیدہ، خودمختار اور فیصلہ ساز انسانی وجود کے طور پر پیش کیا گیا، جو روایتی بنگالی ڈرامائی اسلوب سے یکسر مختلف تھا اور جس نے مدھوسودھن دت کو ادبی حلقوں میں پہلا ''باغی شاعر'' کا خطاب دلوایا۔

اس تناظر میں کرشن کرپلانی نے اپنی معروف کتاب "Modern Indian Literature: A Panoramic Glimpse" میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ جدید ہندوستانی ادب کی تشکیل مغربی ادب کے ساتھ ایک طویل اور پیچیدہ مکالمے کا نتیجہ ہے، جس میں مغربی ہیئتیں مقامی موضوعات اور احساسات کے ساتھ گھل مل کر ایک بالکل نئے پیکر میں ڈھل گئیں۔ اک ایسا پیکر جو نہ خالص مغربی ہے نہ خالص مقامی۔ کرپلانی کے مطابق یہی عمل ڈرامے کے میدان میں بھی نہایت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جہاں مغربی طرز نے ابتدا میں راہ دکھائی، مگر رفتہ رفتہ ہندوستانی تخلیق کاروں نے اپنی فطری تخلیقی جبلت کے تحت اسے اپنے مزاج اور اپنی ثقافتی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیا۔

بنگال کے رنگ منچ کی تاریخ میں رابندر ناتھ ٹیگور (1861-1941) کا مقام سب سے بلند، سب سے پیچیدہ اور سب سے زیادہ فکر انگیز ہے۔ ٹیگور کا رشتہ مغربی ڈرامے سے دو مختلف اور بالکل متضاد مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کے ڈرامے واضح طور پر مغربی طرز پر لکھے گئے: مثلاً ''راجہ اور رانی'' ایک بھرپور میلوڈرامہ تھا، اور ''چترانگدا سبھا'' جیسے مزاحیہ ڈرامے مغربی مزاحیہ روایت، خاص طور پر شناخت کی غلط فہمی پر مبنی کامیڈی سے متاثر تھے۔ ناقدین، خصوصاً موہن لال شرمانے، اس بات کی نشان دہی بھی کی ہے کہ ان کے بعض ڈرامے یورپی علامتی (سمبلسٹ) ڈرامہ نگاروں، خصوصاً موریس میٹرلنک کے اسلوب سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں، جن میں تجریدی خیال آرائی اور علامتی زبان کا استعمال نمایاں ہے۔

مگر ٹیگور کا اصل اور تاریخی اہمیت کا حامل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رفتہ رفتہ، ایک بالکل شعوری اور دانستہ عمل کے تحت، اس مغربی اثر سے انحراف کیا۔ انھوں نے تجارتی بنگالی رنگ منچ پر کھلے عام تنقید کی، جو ان کے بقول بھاری بھرکم سیٹوں اور حقیقت نگارانہ سجاوٹ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور جس نے تماشائیوں کو ''حقیقت نگاری کی حرص'' میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے بجائے انھوں نے ایک ایسا شاعرانہ، تخیلاتی اور کم سے کم وسائل پر مبنی تھیٹر تخلیق کیا جو نہ کسی مغربی روایت کا مقلد تھا اور نہ کسی خالص مشرقی سانچے کا اسیر۔ ٹیگور نے اپنے نظریات میں کلاسیکی سنسکرت رنگ منچ اور بنگال کی لوک روایت، خصوصاً ''جاترا''، سے رہنمائی لینے کی تجویز دی، جس میں علامت نگاری، خیال آفرینی اور کم سے کم سیٹ کا استعمال شامل تھا۔

پارسی تھیٹر کی تاریخ کا باضابطہ آغاز 1853 میں ہوتا ہے، جس کو اس دور کی معروف پارسی شخصیات، دادا بھائی نوروجی، کے آر کاما اور ڈاکٹر بھاؤ داجی کی سرپرستی حاصل تھی۔

پارسی تھیٹر کی اصل اور غیر معمولی خوبی یہ تھی کہ اس نے مغربی اسٹیج کرافٹ، یعنی منظر آرائی، مصنوعی پردے، روشنی کا حساب کتاب سے استعمال اور ڈرامائی ساخت بندی کو ہندوستانی، فارسی اور اردو داستانوں، لوک موسیقی، رقص اور کلاسیکی شاعری کے ساتھ اس مہارت اور توازن سے ملایا کہ یہ فن نہ خالص مغربی رہا اور نہ خالص مقامی، بلکہ ایک بالکل نئی ہائبرڈ صنف بن گیا۔

اسی روایت میں سب سے نمایاں اور دیرپا نام آغا حشر کاشمیری (1879-1935) کا ہے، جنھیں ان کے ہم عصر بجا طور پر ''شیکسپیئر ہند'' کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ آغا حشر نے شیکسپیئر کے کئی ڈراموں کو نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ اردو اور ہندی کے پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا، جن میں ان کا ڈراما ''خواب ہستی''، جو شیکسپیئر کے المیہ ''میکبتھ'' سے ماخوذ ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے ہاں شیکسپیئر کا پلاٹ، کردار نگاری کی گہرائی اور المیہ کا تصور تو مغرب سے آیا، مگر مکالمے کی شاعرانہ زبان، گیت اور محاورہ خالصتاً ہندوستانی مزاج کا عکاس تھا، اور یہی امتزاج آغا حشر کی سب سے بڑی فنی کامیابی تھی۔ محققین نے یہ نشان دہی بھی کی ہے کہ پارسی ڈراموں میں کرداروں کی زبان بھی ان کے سماجی مرتبے کے مطابق طے کی جاتی تھی، جو خود شیکسپیئر کے اسلوب سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ بلند طبقے کے کردار شاعرانہ اور مرصع زبان بولتے، جب کہ عام طبقے کے کردار نثری اور بول چال کی زبان استعمال کرتے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں ایک نئی اور طاقتور ادبی و ثقافتی تحریک، یعنی ترقی پسند تحریک، نے جنم لیا جس نے ڈرامے کو بھی گہرائی سے متاثر کیا۔ اس دور کے ڈراما نگاروں نے مذہبی اور اساطیری موضوعات کی بجائے سماجی حقیقتوں، غربت، طبقاتی نابرابری اور استحصال کو اپنے فن کا مرکزی موضوع بنایا۔ یہ رجحان مغرب کی حقیقت پسندانہ اور فطرت پسندانہ (نیچرلسٹ) ڈرامائی تحریک سے متاثر تھا، جس نے ناروتجین ڈراما نگار ہینرک ابسن اور دیگر یورپی ڈراما نگاروں کے ذریعے ہندوستان تک اپنی رسائی حاصل کی۔

اسی تناظر میں 1943 میں انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن، جسے مختصراً اپٹا کہا جاتا ہے، کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم سے پرتھوی راج کپور، بلراج ساہنی، رتوک گھٹک، اتپل دت، خواجہ احمد عباس اور پنڈت روی شنکر جیسی نامور شخصیات وابستہ رہیں۔ اپٹا کا سب سے اہم اور تاریخی ڈراما ''نبانہ'' (فصل کی کٹائی) تھا، جو بچن بھٹاچاریہ نے تحریر کیا اور شمبھو مترا اس کے ہدایت کار رہے۔ یہ ڈراما بنگال کے قحط کی ہولناکیوں اور برطانوی حکمرانوں کی مبینہ بے حسی کو بے نقاب کرتا تھا، اور اس نے حقیقت نگارانہ سماجی تھیٹر کی ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔

آزادی کے بعد کے دور میں مغربی اثرات کی نوعیت بھی بنیادی طور پر بدل گئی۔ اب صرف شیکسپیئر یا رومانوی مغربی ڈرامہ نگار ہی نہیں، بلکہ بیسویں صدی کے جدید یورپی رنگ منچی نظریات، خصوصاً جرمن ڈراما نگار برتولت بریخت کا ''ایپک تھیٹر'' اور ''الگاؤ کا اثر'' (ایلی نیشن ایفیکٹ) ہندوستانی ڈراما نگاروں کے لیے تحریک اور تجربے کا باعث بنے۔

اس تناظر میں حبیب تنویر (1923-2009) کا نام سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ بااثر ہے۔ 1954 میں اپنا مشہور ڈراما ''آگرہ بازار'' تخلیق کیا، 1959 میں حبیب تنویر نے ''نیا تھیٹر'' کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا، جو مکمل طور پر لوک اداکاروں کی صلاحیتوں پر انحصار کرتا تھا۔ اپنے ناخواندہ اداکاروں کو فطری انداز میں کام کرنے کی آزادی دینے کے لیے انھوں نے باقاعدہ اسکرپٹ کی بجائے تصنع سازی (امپرو ویزیشن) کا طریقہ اپنایا اور معیاری ہندی کی بجائے چھتیس گڑھی بولی کا استعمال کیا۔ حبیب تنویر کا سب سے اہم اور

مقبول ترین ڈراما ''چرن داس چور'' (1975) ہے، جسے چھتیس گڑھ کے لوک فن ''نچا'' کے ساتھ ملا کر تخلیق کیا گیا، اور جس میں ایک بہتر رکنی ساز دینے والا آرکسٹرا اسٹیج پر شریک ہوتا تھا۔ اس ڈرامے کو 1982 میں ایڈنبرا انٹرنیشنل ڈراما فیسٹیول میں ''فرنج فرسٹس ایوارڈ'' سے نوازا گیا، اور بعد میں ہندوستان کے چھیاسٹھ برسوں کے بہترین فنی کاموں میں شمار کیا گیا، جس کی تعریف ایک ایسی جدت طرازی کے طور پر کی گئی جو یکساں طور پر بریخت اور لوک محاوروں سے متاثر تھی۔ حبیب تنویر خود کہتے تھے کہ انھوں نے بریخت سے یہ سیکھا کہ رنگ منچ محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ سماجی تبدیلی اور انقلاب کا ایک نہایت مؤثر ہتھیار بھی ہوسکتا ہے۔

مراٹھی ڈراما نگار وجے تندولکر (1928-2008)، جو کولہاپور کے ایک سرسوت برہمن خاندان میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے چھ برس کی عمر میں اپنی پہلی کہانی لکھی ان کا ڈراما ''شانتتا کورٹ چالو آہے'' (انگریزی میں Silence! The Court is in Session)، جو 1967 میں پہلی بار اسٹیج ہوا، جدید ہندوستانی ڈرامے کا ایک نہایت اہم موڑ تصور کیا جاتا ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی تندولکر نے ایک ٹرین کے سفر کے دوران سنے گئے ایک مکالمے سے اخذ کی، اور اس میں ''ڈرامے کے اندر ڈرامہ'' کی مغربی تکنیک نہایت مہارت سے استعمال کی گئی: ایک نقلی مقدمے کی مشق، جو دراصل ایک تفریحی کھیل کے طور پر شروع ہوتی ہے، آہستہ آہستہ ایک حقیقی نفسیاتی و سماجی تشدد میں بدل جاتی ہے، جس کا نشانہ ایک غیر شادی شدہ حاملہ خاتون استاذہ لیلا بینارے بنتی ہے۔ اس کے مرد ساتھی، اداکاری کی آڑ میں، اس کی ذاتی زندگی کو بے دردی سے نوچنا شروع کر دیتے ہیں اور اسے ایک جھوٹے قتل کے الزام میں مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اس ڈرامے میں مغربی حقیقت نگاری اور نفسیاتی گہرائی کا امتزاج ملتا ہے، مگر اس کا موضوع، یعنی ہندوستانی متوسط طبقے کی مصلحت پسندی پر مبنی اخلاقیات اور صنفی امتیاز، خالصتاً مقامی اور اپنے دور کے سماج کا آئینہ دار ہے۔

کنڑ زبان کے ڈراما نگار گریش کرناڈ (1938-2019) نے مغربی اور ہندوستانی روایت دونوں سے یکساں اور نہایت متوازن طریقے سے استفادہ کیا۔ ان کا پہلا ڈراما ''یایاتی'' (1961) مہابھارت کے ایک مشہور قصے کی نئی تعبیر تھا، جس میں باپ بیٹے کے درمیان جوانی کے تبادلے کی کہانی کے ذریعے ذمہ داری اور انسانی کمزوری کے موضوعات کو اٹھایا گیا۔ ان کا دوسرا اہم ڈراما ''تغلق'' (1964) انیسویں صدی کے پارسی تھیٹر کے تاریخی ڈرامائی اسلوب میں لکھا گیا، جس میں سلطان محمد بن تغلق کے آدرشوں اور ان کے تباہ کن نتائج کو موضوع بنایا گیا۔ اس کے بعد ''ہیاوَدانہ'' (1971) میں انھوں نے مغربی ناول نگار تھامس مان کے افسانے ''دی ٹرانسپوزڈ ہیڈز'' سے تحریک لی، جو خود ایک قدیم ہندوستانی داستان ''کتھا سرت ساگر'' کی کہانی پر مبنی تھا۔ کرناڈ نے اس مغربی ماخذ کو یکشگانہ جیسے کرناٹکی لوک تھیٹر کی تکنیکوں، ماسک اور مصور راوی ''بھاگوت'' کے کردار سے ملا کر ایک بالکل نیا اور دنیا بھر میں سراہا جانے والا ڈراما تخلیق کیا۔ اسی سلسلے میں ان کا ڈراما ''ناگ منڈلہ'' (1988) کرناٹک کی دو لوک کہانیوں پر مبنی ہے، جو انھوں نے استاد اے کے رامانوجن سے سنی تھیں۔ کرناڈ خود ایک انٹرویو میں اعتراف کرتے تھے کہ انھوں نے یونانی ڈرامے، شیکسپیئر، برنارڈ شا، یوجین اونیل، آنوئی، بریخت، سارتر اور کامیو جیسے مغربی ادیبوں کا نہایت گہرا اور باقاعدہ مطالعہ کیا تھا،

بنگالی ڈراما نگار بادل سرکار (1925-2011) نے ایک اور اور نہایت جسورانہ راستہ اختیار کیا۔ 1963 میں لکھے گئے اور 1965 میں اسٹیج ہونے والے ڈرامے ''ایوم اندرجیت'' نے، جو آزادی کے بعد کے شہری نوجوانوں کی تنہائی اور بے مقصدیت کو نہایت گہرائی سے بیان کرتا ہے، انھیں فوری طور پر شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس ڈرامے کو بی وی کرانتھ، ستیہ دیو دوبے اور گریش کرناڈ جیسے فن کاروں نے یکساں طور پر سراہا، اور کرناڈ نے خود اعتراف کیا کہ اس ڈرامے نے انھیں ڈرامائی ساخت کی روانی کے بارے میں بہت کچھ سکھایا۔ بادل سرکار نے مغربی ''تھیٹر آف دی ابسرڈ'' سے استفادہ کرتے ہوئے روایتی اسٹیج کی حدود کو توڑا، اور 1972 میں اپنے ڈرامے ''ساگینا ماہاتو'' کے ذریعے ''تھرڈ تھیٹر'' یا ''تیسرے تھیٹر'' کے نام سے ایک ایسی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس میں پیشہ ورانہ اسٹیج، مہنگے ٹکٹ اور فاصلاتی تماشائی کے مغربی تصور کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا۔

مغربی ڈرامے کے اثرات کو محض ایک طرفہ اور خوش کن کہانی کے طور پر پیش کرنا کسی بھی سنجیدہ علمی مطالعے کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ اس موضوع پر کافی سنجیدہ علمی بحث بھی ہوئی ہے، اور کئی نامور اسکالرز نے اس یک طرفہ بیانیے پر سوالات اٹھائے ہیں۔ رستم بھروچا اپنی معروف کتاب "Theatre and the World Performance and the politics of Culture" میں یہ اہم نکتہ اٹھاتے ہیں کہ مغربی ڈرامہ نگاروں اور ناقدین نے اکثر ہندوستانی رنگ منچ کو اپنی ہی مغربی نظر اور تعصّبات کے ذریعے دیکھا اور اسے حقیقت سے زیادہ عجیب و غریب یا محض روحانی رنگ میں پیش کیا، حالانکہ ہندوستانی ڈرامہ اصل میں گہرے سیاسی اور سماجی مسائل سے بھرپور رہا ہے اور کبھی بھی محض روحانی تجربے تک محدود نہیں رہا۔ بھروچا کے مطابق یہ رویہ ایک نوآبادیاتی نظر کا تسلسل ہے، جس میں مشرق کو دیکھنے کا انداز ہمیشہ مغربی معیارات اور مغربی توقعات سے متعین ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح ایرن می نے اپنی کتاب "Theatre of Rooots-Redirecting the Modern Indian Stage" میں اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ آزادی کے بعد کے ڈراما نگاروں نے شعوری طور پر مغربی نوآبادیاتی رنگ منچ سے علیحدگی اختیار کر کے مقامی روایات کی طرف رجوع کیا، اور یہ عمل خود ایک ثقافتی سیاست کا حصہ تھا، محض ایک فنی انتخاب نہیں۔ نندی بھاٹیہ نے بھی اپنی تصنیف "Acts of Authority/Acts of Resistance" میں اسی نکتے کو تفصیل سے اجاگر کیا ہے کہ نوآبادیاتی دور کا رنگ منچ محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ طاقت اور مزاحمت کی کشمکش کا میدان بھی رہا ہے، جہاں ہر ڈرامائی انتخاب کے پیچھے کوئی نہ کوئی سیاسی معنویت پوشیدہ تھی۔

آج ہندوستانی ڈرامہ نہ مکمل طور پر مغربی ہے اور نہ مکمل طور پر اپنی قدیم روایت کا پرستار۔ یہ دونوں عظیم روایتوں کے بہترین اور توانا عناصر سے مرکب بدن ہے جس میں تخلیقی حرارت بھی ہے اور فنی گیرائی بھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہندوستانی رنگ منچ کو دنیا کے دیگر مابعد نوآبادیاتی معاشروں کے فنی تجربوں کی فہرست میں امتیازی مقام دلاتی ہے۔

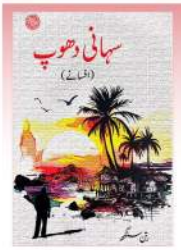
■

Shariq Mohammad Aziz
Urdu Scholar, Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
Add.: E238/B Dolphin House, 2nd Floor, Shaheen Bagh, Okhla, 110025
Email: shariquema07@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان وادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

سہانی دھوپ



مصنف: رتن سنگھ

صفحات: 494، قیمت: 305، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر فیضان الحق، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

اردو افسانہ نگاری کی روایت میں رتن سنگھ کا نام کئی اعتبار سے اہم ہے۔ رتن سنگھ نے زندگی کا ایک طویل عرصہ افسانہ لکھتے ہوئے گزارا۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت و مابعد جدیدیت تک کے رجحانات وتجربات کا مشاہدہ کیا۔ لیکن ایک خاص بات جو ان کے افسانوں کو انفرادیت عطا کرتی ہے، ان کا سادہ بیانیہ اور حقیقت نگاری ہے۔ اس حقیقت نگاری کا تعلق کسی نظریے یا تحریک سے نہیں بلکہ فطرت سے ہے۔ انھوں نے زندگی اور فطرت کو انتہائی شدت اور گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک افسانہ پیچ وخم، ابہام واستعارہ اور تجرید وعلامت سے کام لینے کے بجائے زندگی کی سچائیوں کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک سادہ مگر تخلیقی زبان و اسلوب سے سامنا ہوتا ہے۔ کردار بالکل واضح اور قریبی محسوس ہوتے ہیں، انھیں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رتن سنگھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے خاص رجحانات کے تحت افسانہ لکھنے والوں کے درمیان اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ لیکن یہ کمی رتن سنگھ کی نہیں، ان ناقدین کی ہے جنھوں نے افسانے کو خاص نظریے سے پڑھنے پر زور دیا۔ رتن سنگھ کے افسانے کل بھی زندگی کی ترجمانی کر رہے تھے اور آج بھی ان میں وہی قوت موجود ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ رتن سنگھ نے اپنی خودنوشت اور سوانحی تحریروں میں جذبات ومحسوسات کی جس شدت کو باقی رکھا ہے وہ افسانوں میں مدھم پڑ جاتی ہے۔ شاید یہی فکشن کا تقاضا بھی ہے۔ اس لیے افسانے کے قارئین کو رتن سنگھ کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی خاص نظریے کے بجائے زندگی کے حقائق کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

رتن سنگھ سے میری پہلی واقفیت انور عظیم کی تحریروں سے ہوئی۔ اسی وقت مجھے علم ہوا کہ رتن سنگھ ابھی باحیات ہیں اور انور عظیم سے ان کے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اتفاق سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے ایک پروگرام میں ان کی آمد ہوئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور دختر بھی ساتھ تھیں۔ پروگرام کے بعد میں نے رتن سنگھ سے ملاقات کی اور انور عظیم کا ذکر کیا۔ نام سنتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھے اور اپنی اہلیہ سے کہا ''دیکھو انھوں نے میرے یار کا ذکر کیا ہے۔'' پھر کافی دیر انور عظیم اور ان کے فکشن کے تعلق سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ رتن سنگھ اور انور عظیم ایک دوسرے کے کتنے قدردان تھے۔ انھوں نے مزید گفتگو کے لیے اپنے دولت کدے پر آنے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن کورونا کے سبب یہ ملاقات ممکن نہ ہو سکی اور بالآخر وہ 2021 میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔



رتن سنگھ کے افسانے ان کے انتقال کے بعد مطالعے میں آئے۔ خاص طور پر ان کی کتاب 'ایک ندی: نام سرسوتی' اور سوانحی ناول 'دربدری'۔ ان دونوں کتابوں نے ذہن پر رتن سنگھ کا گہرا نقش قائم کیا۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے، جن میں پہلی آواز، گیارہ بجنے میں سترہ منٹ، کاٹھ کا گھوڑا، مانک موتی، پانی پر لکھا نام، پناہ گاہ، پنجرے کا آدمی وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والا ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ 'سہانی دھوپ' کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں 105 افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے کچھ نئے اور کچھ پرانے بھی ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے رتن سنگھ کے فکشن کو سمجھنے کا بہترین موقع فراہم کرتے ہیں۔ موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی خوبصورتی ان افسانوں سے نمایاں ہے۔ مرد، عورت، بچے، افسر، اوباش، عاشق، کسان، مزدور، حاکم، مختار، مجبور سبھی کے مسائل کسی نہ کسی صورت میں ان افسانوں میں موجود ہیں۔

مجموعے کا پہلا افسانہ 'تلاش' حقیقت پر تصور کی فتح کا بیانیہ ہے۔ یہ افسانہ بنیادی طور ایک نادیدہ جہان کی سیر کے تجسس پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار جس خاتون کے تصور میں سرگرداں تھا، اسے حاصل کرنے کے بعد ایک ایسی لڑکی کے تصور میں گم نظر آتا ہے جسے کچھ ہی دیر قبل دیکھا ہے۔ نا آسودگی اور تصوراتی پیچ وخم کی اس سے بڑی مثال کیا ہوسکتی ہے۔ رتن سنگھ نے کہانی میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی بجائے سادگی اور فطری رویے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ان کا یہ فطری بیانیہ جنسی آسودگی اور ہوس کے پہلوؤں کو واضح کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ رتن سنگھ کے نفسیاتی شعور اور تجزیے کی بھی مثال ہے۔ اسے فرائڈ کے جنسی نظریے کے تحت بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن رتن سنگھ کو اس پر اصرار نہیں۔ یہی حال ان کے بیشتر افسانوں کا ہے، جہاں سادگی اپنا حسن دکھاتی ہے۔ ان افسانوں کو متعدد جدید نظریات کا ترجمان ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ رتن سنگھ کے فن کی صحیح شناخت نہیں ہوگی۔ ان کا فن حقیقت اور زندگی کو سمجھنے کا فن ہے۔

افسانہ 'مہاپرش' سماجی ٹھیکیداروں اور متمول زمینداروں کی مصنوعی ہمدردی کے جذبات پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں موجود مرکزی کردار ایک خاص استحصالی نظام کا مالک ہے، جو عوام سے بے پروا ہو کر اپنے مفاد اور نام ونمود کے لیے عطیہ کرتا ہے۔ سخت بھک مری کی حالت میں محض چند روپیوں کا عطیہ، اخباروں میں اس کی تشہیر اور پھر کالا بازاری یا اشیا کے نرخ میں اضافے کے ذریعے اس کی بھر پائی اور منافع کی کوششیں اسی استحصالی نظام کا حصہ ہیں۔ اس افسانے کی روشنی میں نئے معاشرے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا کہ معاشرہ اب ان برائیوں سے پاک ہو چکا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دان اور عطیہ کے نام پر عوام کو ٹھگنے کے نئے نئے طریقے رواج پا گئے ہیں۔ یہ افسانہ انہی مسائل سے متعلق غور وفکر اور نفسیاتی تجزیے کی مثال ہے۔

افسانہ 'نیا عزم' ایک شرارتی اور غنڈہ قسم کے طالب علم کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں احباب کو پریشان کرنے سے متعلق اس لڑکے کی مختلف حرکتیں بیان کرنے کے بعد افسانہ نگار نے اس کی قلب ماہیت کو پیش کیا ہے۔ یہ قلب ماہیت ڈرامائی نہیں بلکہ سادہ ہے۔ افسانہ کسی گہرے نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرنے کے بجائے اسے بیان کرنے کی کوشش معلوم ہوتا ہے۔ بیانیہ سپاٹ اور سادہ ہے۔ البتہ مرکزی کردار کے رویوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے حالیہ رویے کے پس پردہ احساس محرومی و نارسائی کارفرما ہے۔ اس افسانے سے اسکول اور کالج میں موجود خاص قسم کے طالب علموں کی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔ طالب علموں کی نئی نسل کے رویوں کو سمجھنے اور غور کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

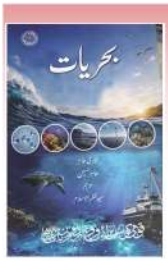
افسانہ 'بیوی کی خاطر' ایک بڑی معاشرتی حقیقت پر مبنی ہے۔ کاروبار اور سرمایہ داری کس طرح ازدواجی رشتے پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا خوبصورت بیان افسانے میں موجود ہے۔ مرکزی کردار اپنی بیوی کے لیے فکرمند ضرور ہے لیکن اس کی مصروفیات کب اس کے رشتے کو بدل دیتی ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ سیٹھ کی اپنی دنیا ہے اور رفتہ رفتہ بیوی کی بھی الگ دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ موسیقی کے نام پر اس کی تنہائی کو دور کرنے کا سامان تو مہیا کر دیا گیا، لیکن رشتے پر پڑنے والی ضرب سے وہ غافل رہا۔ افسانہ قارئین کو ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔ اس افسانے سے موجودہ تجارتی نظام اور دولت کی ہوس سے ازدواجی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاموشی ہر بیماری کا علاج نہیں بلکہ بسا اوقات ایک خطرناک رخ پر چل رہی ہوتی ہے، جسے محسوس کرنا ضروری ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اپنی بیوی کے اطمینان اور خاموشی کو سمجھنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔ یہ جدید معاشرے کا المیہ ہے جسے افسانے میں خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ 'شکریہ' انسانی جبلت اور قوت احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ واحد متکلم کی صورت میں موجود افسانے کا راوی جذبۂ محبت میں شامل اپنی نامناسب حرکتوں کا احساس کرتا ہے اور اچانک انھیں ترک کر دیتا ہے۔ یہ انسانی باطن کی تقلیب ہے، جس کا سبب محبت ہے۔ افسانہ نگار نے اس جذبے کے توسط سے شر پر خیر کے ارادے کو فتح دلائی ہے۔ افسانے کا بیانیہ تہہ دار اور اسلوب دلچسپ ہے۔ اس افسانے میں بھی نفسیاتی تجزیہ شامل ہے۔ رتن سنگھ کی یہی خوبی ہے کہ وہ سادگی کے ساتھ گہرے نفسیاتی مسائل پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں محبت کا جذبہ ایک بڑی قوت کے طور پر نمودار ہوتا ہے۔

افسانہ 'اصل مالک' کسان کے ساتھ انسانی ہمدردی اور اس کے مسائل کی تفہیم پر مبنی ہے۔ کوآپریٹو بینک کا نیا ملازم فائل میں ایک خط دیکھ کر کسان کے تعلق سے جس احترام اور عقیدت کے جذبے کا اظہار کرتا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی اور دفتر کے ذمہ داران لاپروائی سے کام لے رہے تھے۔ افسانہ نگار کا کسان، کھیتی اور مزدور طبقے سے ہمدردی کے اظہار کا یہ رویہ دلچسپ ضرور ہے لیکن کوئی گہرا تاثر قائم نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا سادہ بیانیہ ہے۔ یہ افسانہ ملازم کی کسان کے ساتھ پیدا ہونے والی ہمدردی کا کوئی خاص نقطہ پیش نہیں کرتا۔ ممکن ہے رتن سنگھ نے اسے ضروری نہ سمجھا ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے افسانے کا قاری جیسے جیسے بالیدہ ذہن ہوتا جاتا ہے وہ اشارات کو سمجھ لیتا ہے اور وقوعات کی نفسیاتی منطق پر غور کرتا ہے۔ رتن سنگھ بسا اوقات اس تعلق سے اپنے قاری کو مایوس کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

'سہانی دھوپ' میں شامل رتن سنگھ کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی فکری ارتقا اور افسانوی سفر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں رتن سنگھ کے مختلف ادوار کی کہانیاں شامل ہیں۔ قومی اردو کونسل نے ان کہانیوں کو نہایت خوبصورت سرورق اور طباعت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امید ہے قارئین اس کتاب میں دلچسپی لیں گے اور رتن سنگھ کے فکر وفن کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

بحریات



مصنفین: میری طاہر، طاہر حسین، مترجم: سید ظفر الاسلام
صفحات: 486، قیمت: 315، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال
N-93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

زمین کے دو حصے ہیں، ایک حصہ تری یعنی سمندر اور دوسرا حصہ خشکی یعنی زمین کا وہ حصہ جس پر پہاڑ، جنگل، صحرا اور وہ حصہ جہاں انسانی معاشرت آباد ہے۔ زمین کی پیدائش سے متعلق سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ سورج کا ایک دہکتا ہوا ٹکڑا تھا جو کسی طرح ٹوٹ کر خلائے بسیط میں گر پڑا، جہاں پانی ہی پانی بھرا ہوا تھا۔ زمین

جب ایک دہکتے ہوئے انگارے کی شکل میں خلائے بسیط کے پانی میں آ کر گری تھی تو اس نے ناچنا شروع کیا۔ آگ اور پانی کے اس میل کے نتیجے میں بے پناہ بھاپ اوپر اٹھ کر بادلوں کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی اور پھر بادلوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر برسنا شروع کر دیا۔ اس گولے کے چاروں جانب پانی ہی پانی تھا، ادھر ہواؤں کے تیز جھکڑ بھی چل رہے تھے۔ یہ سلسلہ اربوں، کھربوں برس بھی جاری رہا۔ پھر زمین کی گرمی دھیرے دھیرے گھٹی اور اعتدال پر آتی گئی۔ ہواؤں کے طوفان اور پانی کی ٹھنڈی خاصیت نے رفتہ رفتہ زمین کو ٹھنڈا اور ٹھوس بنا دیا۔ زمین سورج سے جدا ہوتے وقت جو مختلف عناصر اپنے ساتھ لائی تھی، انھوں نے جمع ہوتے ہوئے زمین کے کچھ حصوں کو جزیروں، پہاڑوں اور خشکی کی شکل دے دی اور گہرے حصوں کو سمندر کا روپ دے دیا۔ خشکی کے یہی حصے براعظم اور سمندر کے حصے بحرِ اعظم کہلائے جانے لگے۔ خشکی کو 6 بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ حصے (1) ایشیا، (2) یورپ، (3) افریقہ، (4) امریکہ، (5) آسٹریلیا، (6) اور انٹارکٹیکا ہیں۔ اسی طرح سمندر کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا، جس کے پانچ بڑے حصے درج ذیل ہیں (1) بحرالکاہل، (2) بحراٹلانٹک، (3) بحر ہند (4) بحرمنجمد شمالی (5) بحرمنجمد جنوبی۔ یہ پانچوں سمندر آر یہ نام کے اعتبار سے الگ الگ ہیں، لیکن یہ براعظموں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

پیش نظر کتاب 'بحریات' جس کے مصنفین میری طاہر اور طاہر حسین ہیں، جنھوں نے یہ کتاب انگریزی میں Oceanography کے عنوان سے تصنیف کی ہے۔ یہ ایک بڑا تحقیقی پروجیکٹ ہے، جس کو ان دونوں مصنفین نے بڑی محنت شاقہ کے بعد مکمل کیا اور پھر کتابی شکل میں پیش کیا۔ پروفیسر میری طاہر اور پروفیسر طاہر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ جغرافیہ سے وابستہ ہیں اور اپنی علمی خدمات کے باوصف شہرت رکھتے ہیں۔ اس کا ترجمہ سید ظفر الاسلام نے کیا ہے۔ انھوں نے بڑی حد تک ترجمے کے اصول وضوابط کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ ترجمہ رواں رہے اور اس میں کوئی جھول اور نقص نہ رہ جائے۔

انھوں نے اپنی اہم کتاب 'بحریات' کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب 'بحریات' کی فطرت اور دائرۂ عمل ہے، جن کے تحت بحریات کیا ہے؟ بحریات کے اجزا اور بحریات کی فطرت اور دائرۂ عمل پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور یہ بات وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ سمندری پلیٹوں کی حرکت پانی کی گرد تھی، غذا کی دستیابی اور توانائی کے وسائل کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے سمندروں کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ زمین محدود ہے، لیکن سمندر کی وسعتوں کا صحیح معنوں میں اندازہ کرنا دشوار ہے۔ یہ عنوان سائنس دانوں کے لیے بڑی دلچسپی رکھتا ہے جو تحقیق وتفتیش کے عمل کے بے شمار برسہابرس کے بعد اب سماج کی موجودہ اور مستقبل ضرورتوں کو فراہم کرنے کے اہل ہوئے ہیں۔ اس باب میں بحریات کی ابتدائی تاریخ، جدید بحریات اور اس کے پانی، بحری مہم جوئی سے لے کر سمندروں کے ماحولیاتی تحفظ تک، پھر بحریات اور دیگر علوم وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم ٹھوس اور سیال کرۂ ارض ہے جس کے تحت زمین اور پانی کی تقسیم، ایک نظر میں بحرِ اعظم، زمین کی ساخت، تاریخی پس منظر، براعظموں کے نیچے کے حالات، زمین کی پرتیں اور تحقیق کے طریقوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ باب سوم میں بحری طاس کی وضع، براعظمی حاشیہ، براعظمی شیلف، براعظمی ڈھال، اور براعظمی ابھار کا حتی المقدور جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ بحری فرش طاس، حاشیائی سمندر اور اندرونی طاس بحر، دیگر تحت البحر تنگ خدوخال اور سمندروں کی زیریں سطح کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں سمندروں اور سمندری بیسن (طاس) اور ان سے متعلق نظریات اور بحر ہند کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم میں رسوبات (علم جغرافیہ اور ارضیات میں دریاؤں کے تیز دھارے یا ہوائیں قشر زمین سے مٹی اور پتھر کے جو باریک ذرات کاٹ کر سمندروں یا جھیلوں میں لے جاتی ہیں اور وہ وہاں تہہ میں بیٹھ جاتی ہیں، انھیں رسوبات کہتے ہیں) یا ماخذ اور خصوصیات، رسوب اندازی کی شرح اور رسوب جمع ہونے کے طریقوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ باب ششم میں سمندری پانی کی طبیعی اور کیمیائی خصوصیات اور ان کو کنٹرول کرنے کے عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب ہفتم میں پیمائشی آلات کی دھارائیں، دھاراؤں کے اسباب اور ان کے اتار چڑھاؤ، زمینی انحرافی توازن اور آب وہوا کے عوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب ہشتم میں لہریں اور مدوجزر، ان کی پیمائش، موجب قوتیں، لہر کی حرکت اور تقسیم وغیرہ کی تفصیل سامنے لائی گئی ہے۔ باب نہم میں جزائر مرجانی سنگستان کی اقسام، ابتدائی نظریات، مرجان کی تاریخ اور ہندستانی سمندروں میں مرجانی سنگستانوں پر آب و ہوا کی تبدیلی کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ باب دہم بحری وسائل سے متعلق ہے۔ اس کے تحت ماہی گیری، آبی کاشت، معدنیات کا بڑا وسیلہ سمندر، توانائی، آب وہوا کو معتدل کرنا اور بحر ہند کے وسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب یازدہم میں بحری آلودگی کا تعارف، تاریخ، راست اخراج، جہاز اور فضائی آلودگی، گہرے سمندر کی کانکنی، تیزاب بننے کا عمل، پلاسٹک ملبہ، تھیلی سے ہونے والی آلودگی، سمندری ملبہ کاری، بین الاقوامی تعاون اور بحری منتظمہ آفات جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ باب دوازدہم میں ساحلی کٹاؤ اور مینجمنٹ، ساحلوں کا ارتقا، درجہ بندی لہروں اور مدوجزر سے ہونے والے کٹاؤ کے عوامل، دیگر ساحلی عوامل اور مینجمنٹ کے حالیہ نظام کے تنقیدی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب سیزدہم میں خلائی بحریات کی تاریخ، اہمیت، ڈاٹا کے حدود اور سٹیلائٹ کے استعمال اور طریقے بتائے گئے ہیں۔

باب چہاردہم میں آب و ہوا، سمندر اور گلوبل اثرات، گلوبل وارمنگ اور سمندری سطح کا ابھار، تبدیلیوں کے اثرات، سمندر اور انسان اور سمندر بمقابل آب و ہوا پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخری باب، باب پانزدہم میں سمندر کے قوانین، ان کی تاریخ، بیسویں صدی میں سمندر کا قانون، مخصوص معاشی منطقہ، اصولوں کا اعلامیہ، سمندر کے قوانین پر اقوام متحدہ کی کانفرنس اور کنونشن پر گفتگو کی گئی ہے۔

ہر باب سے متعلق جدول کی فہرستیں اور ہر عنوان سے متعلق ضرورتاً نقشے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ آخر کتاب میں فرہنگ اصطلاحات سے بھی شامل کتاب ہے، جو یقیناً ایسے الفاظ اور جملوں کی ساخت کو سمجھنے میں معاون ہوگی، جن سے عام طور پر قاری کی واقفیت معمولی ہوتی ہے۔ 16 صفحات پر کتابیات کی فہرست بھی شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفین نے کتنی محنت شاقہ کے بعد یہ تحقیقی کتاب تیار کی ہے، پروفیسر میری طاہر، پروفیسر طاہر حسین اور مترجم سید ظفر الاسلام بھی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے 'بحریات' جیسے خشک موضوع سے اردو دنیا کو واقف کرایا ہے۔

قومی کونسل جو صرف اردو ادب ہی نہیں بلکہ علمی اور تہذیبی ورثے کے تحفظ میں اہم خدمات انجام دیتی رہی ہے مبارکباد کی مستحق ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے یہ کارنامے یقیناً لائق ستائش ہیں، اس کے لیے پوری اردو دنیا کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

ادویہ مفردہ



صفحات:444، قیمت:285روپے

سنہ اشاعت:2026

مبصر: ڈاکٹر محمد عقیل

صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

طب یونانی میں علاج کے لیے استعمال ہونے والی مرکب ادویہ کو سمجھنے کے لیے مفرد ادویہ کے مزاج، خواص اور تعامل کا علم بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے علم الادویہ میں ادویہ مفردہ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یونانی ادویہ ایک سے زیادہ مفرد اجزا کو ملا کر تیار کی جاتی ہیں۔ مفرد ادویہ کے خواص اور تعامل سے واقفیت کے بغیر مناسب اور کارگر مرکب تیار کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفرد ادویہ ہی مرکب ادویہ کی بنیاد ہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

یونانی طب کے قدیم اطبا مثلاً بقراط، جالینوس، رازی، ابن سینا اور ابن بیطار وغیرہ نے مختلف مفرد ادویہ کے خواص اور استعمالات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مفردات کا علم اس قدیمی وعلمی روایت کو محفوظ رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادویہ مفردہ کے نام سے یہ اہم کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ اصلاً ایک پروجیکٹ کے تحت لکھی گئی کتاب ہے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال ہیں۔ یہ کتاب اپنی محتویات اور مشمولات نیز تحقیقات کے سبب ایک جامع انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں علم المفردات سے متعلق تفصیلی وتوضیحی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ علم طب باعتبار معالجہ کی بنیاد مولید ثلاثہ؛ یعنی نباتات، جمادات اور حیوانات سے حاصل کی گئی ادویہ پر ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے؛ پہلا باب 'مختلف اعتبار سے ادویہ مفردہ کی تقسیم' ہے جسے پروفیسر عبدالودود نے تحریر کیا ہے۔ اس میں طب یونانی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ادویہ مفردہ کی تقسیم اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی یونانی علم الادویہ کے چار ذیلی علوم یعنی کلیات ادویہ، مفردات، صیدلہ اور مرکبات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ادویہ مفردہ کی تقسیم باعتبار ماہیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی منظم اور غیر منظم قسموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب 'ادویہ معدنیہ' پر مشتمل ہے۔ اسے حکیم مستحسن نے تحریر کیا ہے۔ اس باب میں تقریباً 40 ادویہ مفردہ کے خواص اور ان کے تعامل کا تذکرہ ہے اور ہر ایک کی تعریف اور اس کے اثرات نیز اس سے متعلق قدیم وجدید تحقیقات کا تعارف اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں جن ادویہ مفردہ کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے ان میں ابرک، شنگرف، زنگار، حجر الیہود، سنگ جراحت، سہاگہ، سلاجیت، فولاد، نوشادر، یاقوت، مومیائی، گل سرخ، سونا اور نمک کی 5 قسموں کے علاوہ دیگر معدنی ادویہ شامل ہے۔ حکیم مستحسن نے ان کے ماخذ، مترادفات، ماہیت، مقام پیدائش، مزاج، تعامل، استعمال بسورت کشتہ وسفوف، مقدار خوراک، نفع خاص، مضرات اور مصلحات کا ذکر طبی اصول وضوابط کے تحت کیا ہے۔ جس سے عام قاری بھی حسب ضرورت وتوفیق استفادہ کرسکتا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب 'ادویہ حیوانیہ' ہے۔ اسے بھی حکیم مستحسن نے تحریر کیا ہے جس میں 21 مفردات حیوانیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں آبریشم، انڈا، مروارید، صدف، کیکڑا، عنبر، موم، بیر بہوٹی، شہد، مرجان، کف دریا، مشک وغیرہ شامل ہیں۔ حکیم مستحسن نے ان ادویہ مفردہ کے مترادف نام، ان کی ماہیت، مقام پیدائش، اجزائے مستعملہ، طریقۂ استعمال، نفع خاص، مقدار خوراک اور ان کے مضر اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا چوتھا باب 'ادویہ نباتیہ' پر مشتمل ہے۔ یہ باب حروف تہجی کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ 'الف' تا 'ب' سے شروع ہونے والی ادویہ مفردہ کی تفصیلات اور ان کے استعمال وغیرہ کی معلومات ڈاکٹر نسرین (این آئی یو ایم بنگلور) نے فراہم کی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر میں طبی اصول کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے۔ 'ت' تا 'ج' اور 'م' تا 'ن' سے شروع ہونے والی ادویہ مفردہ کا تعارف حکیم شمیم ارشاد اعظمی (صدر شعبۂ علم الادویہ، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، پریاگ راج) نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے بھی ان ادویات کے خواص اور تعامل پر عمدگی کے ساتھ اظہار خیال ہے۔ 'د' سے 'ز' تک کی ادویہ مفردہ کے خواص پر ڈاکٹر تاج الدین (کولکاتا) نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ حصہ گو کہ مختصر ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اسی طرح انھوں نے 'ص' تا 'ظ' اور 'ق' تا 'ل' بھی تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر ایم فیصل اقبال (قرول باغ دہلی) نے 'ز' سے 'ش' تک والے حصے کو تحریر کیا ہے۔ اس حصے میں کئی مفید دواؤں کا ذکر ملتا ہے۔ 'ع' تا 'ف' والا حصہ ڈاکٹر عبدالرؤف (صدر شعبہ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ) نے لکھا ہے۔ 'و' تا 'ہ' سے جن ادویہ مفردہ کا نام شروع ہوتا ہے ان کا تعارف ڈاکٹر عبداللطیف (شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے لکھا ہے۔ یہ حصہ بھی کافی اہم ہے۔

باب چہارم میں جن ادویہ مفردہ کی خاصیت، اثرات اور مزاج وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ان میں آبنوس، آملہ، ارجن، املتاس، بادام، بابونہ، بھنگ، تخم بالنگا، جاوتری، دارچینی، ریٹھا، زعفران، زیرہ، زیتون، سجنہ، عناب، فلفل، قرنفل، کافور، کباب چینی، کیوڑہ، گاجر، لاجونتی، لوبان، لہسن، مروڑ پھلی، نیلم، نیم، ہینگ وغیرہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایسی متعدد اشیا کے خوص اور اس سے ہونے والے فوائد ونقصانات کا علم ہوتا ہے اور قاری اپنی صحت وتندرستی کا خیال ایسی معلومات افزا کتابوں کے سہارے رکھ سکتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف عام قاری کے لیے بلکہ افادیت کے لحاظ سے علم طب میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

باقیات شعر شبلی



مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 128، قیمت: 200 روپے
ناشر: ادبی دائرہ، اعظم، گڑھ، یوپی
مبصر: سید تجمل اسلام شاہ
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

برصغیر کی علمی تاریخ میں ایسی بہت سی اہم شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے ہندستان کے مستقبل کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ ان ہی اہم اشخاص میں مولانا شبلی نعمانی کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ شبلی نعمانی پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، جن کے مطالعے سے ان کی شخصیت اور کارناموں سے واقفیت حاصل ہوتی ہیں۔ شبلی نعمانی کے حوالے سے جب بھی کسی کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کی ہمہ جہت شخصیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

'باقیات شعر شبلی' کے مطالعے کے بعد شبلی کی زندگی اور کارناموں کے حوالے سے مزید واقفیت حاصل ہوئی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کتاب میں جو معلومات اردو دنیا کو فراہم کرائی گئی ہیں، اس سے پہلے کسی نے نہیں کرائی۔ ہاں ہر مصنف کی علمیت اور اس کا انداز بیان جدا ہوتا ہے۔

پہلی نظر میں مجھے ایسا لگا کہ شاید اس کتاب میں وہی روایتی انداز ہوگا، جو عام طور پر دیگر مصنفین کی کتابوں میں ہوتا ہے، لیکن جوں جوں کتاب پڑھتا گیا اس قدر لطف آنے لگا کہ ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ ڈالی۔

محمد الیاس الاعظمی صاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اچھی کتاب ہے۔ انھوں نے جس خوش اسلوبی اور آسان بیانی کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ ان کا وصف خاص ہے۔ ابتدا میں 'علامہ شبلی پر ایک نظر' کے عنوان سے جو شبلی کی ابتدائی زندگی سے لے کر آخری عمر تک کا منظر دکھایا گیا ہے، اس سے قاری کو خاص دلچسپی ہوگی۔ اس کتاب میں جس طرح ہر باب کو الگ الگ پیش کیا گیا ہے وہ بہت ہی متاثر کن ہے، مثلاً ان کا سرسید سے ملنا اور علی گڑھ کالج کی ملازمت اختیار کرنا وغیرہ۔ شبلی علی گڑھ میں صرف درس و تدریس سے منسلک نہیں رہے بلکہ بہت سے علمی کارنامے انجام دیتے رہے۔

ان کے اہم کارناموں میں 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' پر محققانہ مقالہ پیش کرنا، جس کو اس وقت کے سبھی اہل علم نے بے حد پسند کیا۔ اس کے علاوہ المامون، سیرۃ النعمان، مجالس میلاد، الفاروق، سفرنامہ روم و مصر و شام وغیرہ۔ شبلی نے تاریخ اور فلسفہ جیسے موضوعات کو بھی دلچسپ بناتے ہوئے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ان کارناموں کی وجہ سے شبلی ایک باکمال شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

سرسید کی وفات کے بعد شبلی نے علی گڑھ کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا، پھر وہ ندوۃ العلما سے منسلک ہوئے اور علمی و تحقیقی خدمات میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ آخری وقت میں دارالمصنّفین کا قیام عمل میں آیا جہاں انھوں نے کافی وقت تک اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رکھا۔

ادب کا طالب علم ہونے کی وجہ سے ابتدا سے ہی شبلی کو پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے، اور عام طور پر لوگوں کا یہ تصور ہوتا ہے کہ شبلی صرف محقق، نقاد اور ادیب ہیں جن پر ناقدین نے خوب لکھا ہے مگر شاعر کے طور پر ناقدین کی توجہ ذرا کم گئی ہے، وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے، انھوں نے اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں شاعری کی ہے، جسے پسند بھی کیا گیا ہے۔ چونکہ میں نے شبلی کی شاعری کو پہلی بار پڑھا، پہلی قرأت سے ہی میں ان کی شاعری کا گرویدہ ہوگیا۔ اس دوران جو اشعار مجھے بہت پسند آئے، ان میں بطور نمونہ دو شعر پیش کر رہا ہوں ؎

رحم تو ایک طرف پایہ شناسی دیکھو
قیس کو کہتے ہیں مجنوں تھا صحرائی تھا
کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم
چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا

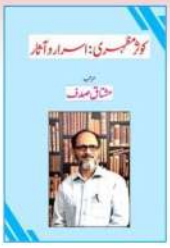
اسی طرح ڈھیروں ایسے اشعار ہیں جو بہت پسند آئے۔ شبلی کی بقیہ تحریریں جس قدر دلکش ہوا کرتی ہیں اتنی ہی خوبصورت ان کی شاعری بھی ہے۔

اردو کلام کے بعد شبلی کا عربی کلام بھی شامل کیا گیا ہے، اور اس کے بعد فارسی کلام، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کی علمی شخصیت کا دائرہ کس قدر وقیع ہے اور وہ بیک وقت کتنی زبانوں پے دسترس رکھتے تھے۔

اس کتاب کے بیانیے نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری خواہش ہے کہ اہل ادب اور ادب سے محبت کرنے والے اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں اور شبلی جیسے عظیم شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کریں، بالخصوص ان کی شاعری کو اپنے مطالعے کا حصہ ضرور بنائیں۔

ترتیب

کوثر مظہری: اسرار و آثار



مرتب: مشتاق صدف
صفحات: 504، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: عبدالرحمٰن شافی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر کوثر مظہری اردو دنیا میں ایک معتبر شاعر، سنجیدہ نقاد، فکشن شناس اور محقق کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ طویل عرصے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور تدریس و تحقیق کے میدان میں ان کی خدمات اہل علم کے نزدیک مسلّم ہیں۔ ان کی ادبی شناخت صرف شاعری تک محدود نہیں بلکہ تنقید، تحقیق، ناول نگاری اور ادبی مباحث میں بھی ان کی گہری دلچسپی اور فعال شرکت رہی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں اردو تنقید اور فکشن کے مطالعات میں حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہیں۔

کوثر مظہری کی شخصیت اور فن پر مرتب کی گئی کتاب 'کوثر مظہری: اسرار و آثار' عصرِ حاضر کی ان اہم ادبی تصانیف میں شمار کی جاسکتی ہے جو کسی ادیب کی علمی، ادبی اور تنقیدی خدمات کا ہمہ جہت جائزہ پیش کرتی ہیں۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر مشتاق صدف ہیں، جنھوں نے مختلف اہلِ قلم کے مضامین کو یکجا کر کے

پروفیسر کوثر مظہری کی ادبی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب ھذا کی بڑی خوبی اس کی موضوعاتی وسعت اور تنوع ہے۔ اس میں شامل مضامین کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے کوثر مظہری کی شخصیت کے کسی ایک پہلو پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی شاعری، تنقید، فکشن فہمی، تدریسی خدمات، شخصی اوصاف اور ادبی اثرات سب کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک ادبی شخصیت نامہ کی صورت اختیار کر جاتی ہے، جس میں مختلف زاویۂ نظر رکھنے والے قلمکار اپنی اپنی بصیرت کے مطابق کوثر مظہری کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسی طرح کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کوثر مظہری کا اصل امتیاز ان کی تنقیدی بصیرت ہے۔ انھوں نے اردو فکشن، خصوصاً ناول اور جدید تنقیدی مباحث پر نہایت سنجیدگی سے کام کیا ہے۔ ان کی تنقید تاثراتی نہیں بلکہ علمی استدلال، فکری گہرائی اور ادبی شعور سے عبارت ہے۔ مختلف مضامین نگاروں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کوثر مظہری تخلیق اور تنقید کے باہمی رشتے کو گہرائی سے سمجھتے ہیں، اسی لیے ان کی تنقیدی تحریروں میں تخلیقی حسن اور علمی وقار ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

کتاب کا ایک اہم حصہ کوثر مظہری کی شاعری سے متعلق ہے۔ مضمون نگاروں نے ان کی غزل گوئی، شعری رویّوں اور فکری جہات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی شاعری عصرِ حاضر کے سماجی، تہذیبی اور انسانی مسائل کا شعوری ادراک بھی ہے۔ ان کے اشعار میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم نظر آتا ہے۔ وہ نہ تو روایت سے مکمل انقطاع اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی جدیدیت کے نام پر شعری اقدار کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہی اعتدال ان کی شاعری کو ایک خاص وقار عطا کرتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میاں کوثر اٹھو فصلِ بہار آئی ہے دیکھو تو
یہی موسم ہے جس میں چاک دامانی بھی ہوتی ہے

قطرۂ شبنم کے بھی احسان یاد آنے لگے
ہونٹ سوکھے جا رہے ہیں جب سے میں پانی میں ہوں

کتاب کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف معاصر ناقدین اور ادیبوں کے مضامین ہی شامل نہیں بلکہ اردو کے ممتاز اہلِ علم اور ادبی شخصیات کے تاثرات اور آرا بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان آرا سے کوثر مظہری کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے اور قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ اردو دنیا کے سنجیدہ حلقوں میں ان کی خدمات کو کس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے کوثر مظہری کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے، اور وہ ہے ان کی تدریسی خدمات۔ ایک استاد کی حیثیت سے انھوں نے طلبہ اور محققین کی رہنمائی میں جو کردار ادا کیا، وہ ان کے ادبی کارناموں سے کم اہم نہیں۔ کتاب کے بعض مضامین میں ان کے اخلاق، انکسار، علمی دیانت اور شاگرد نوازرویّے کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جیسے کینوس پر کوئی مصور رنگ بھرتا جا رہا ہو۔ جیسے جیسے مطالعہ آگے بڑھتا جاتا ہے قاری کے ذہن میں ایک شفیق استاد کی تصویر ابھرتی جاتی ہے جو صرف درس و تدریس تک محدود نہیں بلکہ علمی اور اخلاقی تربیت کا بھی فریضہ انجام دیتا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین بھی قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے مواد کے انتخاب میں خاص احتیاط اور توازن سے کام لیا ہے۔ اگرچہ بعض مضامین میں موضوعاتی تکرار محسوس ہوتی ہے، تاہم مجموعی طور پر کتاب کی ساخت منظّم اور مربوط ہے۔ مرتب کی یہ کامیابی ہے کہ انھوں نے مختلف النوع مضامین کو ایک ایسی وحدت میں پرو دیا ہے جو کتاب کو بکھرنے نہیں دیتی۔ تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو 'کوثر مظہری: اسرار و آثار' اردو ادب میں شخصیات پر مرتب ہونے والی ان کتابوں میں شامل ہے جو صرف تعریف و توصیف تک محدود نہیں رہتیں بلکہ علمی و ادبی تجزیے کی سطح پر بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب سے نہ صرف کوثر مظہری کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اردو تنقید، شاعری اور فکشن کے معاصر رجحانات کو بھی سمجھنے کے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر 'کوثر مظہری: اسرار و آثار' ایک اہم، مفید اور وقیع کتاب ہے جو پروفیسر کوثر مظہری کی علمی و ادبی زندگی کا جامع خاکہ پیش کرتی ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب محققین، طلبہ، اساتذہ اور اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف ایک ممتاز ادیب کی شخصیت کے مختلف گوشے روشن ہوتے ہیں بلکہ اردو ادب کی معاصر فکری اور تنقیدی روایت کا بھی بہتر ادراک حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور آئندہ کوثر مظہری کے حوالے سے ہونے والی تحقیق میں بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔

شخصیت

سحر سندیلوی : حیات اور کلام

مصنف: ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی
صفحات: 319، قیمت:300 روپے
ناشر: نعمانی پریس، گولہ گنج، لکھنؤ
مبصر: ساجد عبید، سی-1 (چوتھی منزل)، اولڈ جسولہ ولیج
نزد ایڈووکیٹ کمپاؤنڈ، نئی دہلی۔ 110025

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی تخلیق کردہ زیرِ نظر کتاب 'سحر سندیلوی: حیات اور کلام' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے 'پیش لفظ' ہے، اس کے بعد 'حیات سحر سندیلوی' کے عنوان سے پہلے باب میں سحر سندیلوی کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، 'استادِ سحر سندیلوی' کے عنوان سے دوسرے باب میں محمد اطہر نفیس سندیلوی کی حیات و خدمات کا بیانیہ ہے، 'معاصرین سندیلوی' کے عنوان سے تیسرے باب میں سحر سندیلوی کے معاصرین کا ذکر ہے جب کہ چوتھے باب میں سحر سندیلوی کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے نعتیہ کلام ہے، پھر غزل ہے، اس کے بعد نظم کو رکھا گیا ہے جب کہ دعا پر کتاب کا اختتام ہوا۔

'پیش لفظ' میں مصنف ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے اپنا تعارف پیش کرنے کے بعد یہ واضح کیا ہے کہ چونکہ سحر سندیلوی کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا، اس لیے انھوں نے 22 فروری 2026 کو سحر سندیلوی کے انتقال کے بعد ان کے کلام کو یکجا کر کے کتاب کی شکل دے دی۔ سحر سندیلوی کے کلام کے ساتھ مصنف نے

سحر سندیلوی کی زندگی، ان کے استاد اور ان کے معاصرین پر روشنی ڈال کر کتاب کو جامع بنا دیا ہے اور کتاب کی کامیابی کا انحصار قائین پر چھوڑا ہے۔ سحر سندیلوی کی بات کی جائے تو پہلے باب میں شامل اقتباس کے مطابق سحر سندیلوی نے اوائل عمر میں ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور محمد اطہر نفیس سندیلوی جو علامہ اطہر ہاپوڑی کے شاگرد تھے، سے اصلاح لینی شروع کر دی نیز پروفیسر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، چودھری وجاہت علی سندیلوی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی، غلام صابر قدیری سندیلوی جیسے مشاہیر ادب اور محضر لکھنوی، فدا حسین صوفی، باقر حسینؒ عاصی جیسے استاد سخن سے استفادہ کیا۔ ان کے نیازمندانہ رویے اور کثرت مطالعہ و مشاہدہ کا ثمرہ تھا کہ نثر و نظم کی متعدد اصناف ادب میں منفرد حیثیت کے حامل ہو گئے تھے۔ جیسے کتاب میں موجود نعت کے یہ اشعار۔

مل گیا سایہ دامن مصطفیٰ
عاصیوں کے سہاروں کی کیا بات ہے
جن کے صدقے ہیں گلہائے باغ ارم
ان پھولوں کے خاروں کی کیا بات ہے
خاک طیبہ پہ شیدا ہیں شمس و قمر
پر ضیاء ریگ زاروں کی کیا بات ہے

غزل کے یہ اشعار بھی سحر سندیلوی کی شاعری کی انفرادیت کے گواہ نظر آتے ہیں۔

محبت کی زباں سمجھے نہ دل کا مدعا سمجھے
کہا تھا ان سے کیا ہم نے خدا جانے وہ کیا سمجھے
لوح پر دل کے جو ہے رقم دیکھیے
پڑھ کے میری وہ روداد غم دیکھیے

نظم کی بات کی جائے تو 'خدا سے مانگ' کے عنوان سے کتاب میں شامل یہ اشعار دیکھیں جن میں کہا گیا ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور جو بھی مانگنا ہے، وہ خدا سے مانگو، وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

خوف خدائے پاک کی نعمت خدا سے مانگ
یعنی کہ جان روح عبادت خدا سے مانگ
سوز و گداز کی دولت خدا سے مانگ
محبوب کبریا کی محبت خدا سے مانگ
تسخیر کائنات کا مضمر ہے اس میں راز
صدیق با صفا کی صداقت خدا سے مانگ

سحر سندیلوی کے کلام کی روشنی میں مصنف ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور بڑے حسین اور دل آویزا انداز میں احساسات و جذبات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ واقعی ان کا کلام زبان و بیان کی سلاست و سادگی، روانی و برجستگی، شگفتگی و پختگی اور الفاظ کی چستی کا مظہر ہے۔ مصنف کا یہ شکوہ بھی بجا نظر آتا ہے کہ سحر سندیلوی سندیلہ کی سطح پر انفرادی حیثیت کے حامل ہو گئے تھے لیکن انھیں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بہر حال! سندیلہ میں سحر سندیلوی کے ساتھ ہوئی ناانصافی کو سامنے رکھتے ہوئے سندیلہ سے ہی منسلک مصنف ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی کوشش قابل ستائش ہے، انھوں نے سحر سندیلوی کے کلام کو کتاب کی شکل میں یکجا کر کسی حد تک ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کی کمپوزنگ، ڈیزائننگ اور پرنٹنگ بھی اچھی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مصنف کی کوشش کامیاب ہو۔

رسائل و جرائد



سبق اردو (خصوصی شمارہ: پروفیسر شہپر رسول)
چیف ایڈیٹر: دانش الہ آبادی
جلد:10، شمارہ:12
صفحات:174، قیمت:200 روپے، سنہ اشاعت: دسمبر 2025
مبصر: زاہد ندیم احسن۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

رسالہ سبق اردو (گوپی گنج، ضلع بھدوہی) دسمبر 2025 کا شمارہ اپنے اندر ایک خاص ادبی حرارت، فکری سنجیدگی اور تنقیدی وقار سموئے ہوئے ہے۔ جلد دہم کی یہ آخری اشاعت معروف شاعر پروفیسر شہپر رسول کے نام معنون خصوصی شمارہ ہے۔ یہ صرف ایک شاعر کی شخصیت اور فن کو خراج تحسین پیش نہیں کرتا بلکہ معاصر اردو شاعری کے ایک اہم تخلیقی منظرنامے کو بھی پوری جامعیت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ادبی دستاویز اور آئندہ تحقیق کے لیے ایک معتبر ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شمارے کا آغاز خود شہپر رسول کے مضمون نئی غزل کی ربع صدی سے ہوتا ہے۔ یہ مضمون نئی غزل کی تاریخ اور اس کے ارتقا امکانات اور فکری جہات کا ایک صاحب نظر شاعر کی نگاہ سے کیا گیا تجزیہ ہے۔ یہاں شاعر اپنے تخلیقی تجربات، تنقیدی بصیرت اور ادبی شعور کو اس انداز سے بیان کرتا ہے جیسے کوئی مسافر طویل سفر کے بعد مڑ کر اپنی طے شدہ راہوں کا جائزہ لے رہا ہو اور ہر پڑاؤ کی روشنی کو نئی معنویت عطا کر رہا ہو۔ اس کے بعد شامل منتخب غزلیں اور نظمیں اس شمارے کو جمالیاتی تازگی عطا کرتی ہیں۔ شہپر رسول کی شاعری میں داخلی کرب، وجودی تنہائی، عصری بے سمتی اور انسان کی باطنی کشمکش نہایت لطیف پیرائے میں سامنے آتی ہے۔ ان کے اشعار میں لفظ محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ احساس کی تہہ در تہہ کیفیت کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ شاعر گویا اپنے وجود کی خاموش شکست و ریخت کو زبان عطا کرتا ہے۔

وہ اک تصویر ہم کو ایک دیوانہ سمجھتی ہے
سو ہم بھی ایک دیوانی سے باتیں کرتے رہتے ہیں

یہ شعر محبت کے روایتی احساس کو نئی معنویت بخشتا ہے جہاں دیوانگی ایک کمزوری نہیں بلکہ باہمی شناخت کی علامت بن جاتی ہے۔ اسی طرح۔

تم کو پکارتے ہیں ہمیں دیکھتے ہیں لوگ
جیسے کہ ایک ہی ہو ہمارا تمھارا نام

یہ شعر محبوب اور عاشق کے وجودی امتزاج کو نہایت سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے جہاں شناختیں ایک دوسرے میں تحلیل ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ شخصی مضامین اس خصوصی شمارے کا نہایت دلکش اور وقیع حصہ ہیں۔ خالد محمود کا 'قصہ شہپر رسول کا' اور غضنفر کا 'سیلاب کو ناؤ بنانے والا شاعر' جیسے مضامین شہپر رسول کے اس انسانی اور تخلیقی

وجود کو آشکار کرتے ہیں جو زندگی کی تمام دشواریوں کے باوجود اپنے فن اور اپنے عہد سے وفادار رہا۔ ان تحریروں میں کہیں دوستی کی خوشبو ہے کہیں محبت کا خلوص اور کہیں ایک ایسے فنکار کی جدوجہد جو ہر طوفان میں اپنے چراغ کی لو کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

تنقیدی مضامین اس شمارے کی علمی قوت کا اصل مظہر ہیں۔ عتیق اللہ اپنے مضمون میں شہپر رسول کی غزل کی فکری ساخت، داخلی ربط اور معنوی تہہ داری کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شہپر رسول کی شاعری بظاہر سادہ مگر اپنے باطن میں نہایت پیچیدہ فکری نظام رکھتی ہے۔ ان کی غزل میں روزمرہ تجربات، وجودی سوالات، تہذیبی شعور اور انسانی کرب اس طرح باہم پیوست ہو جاتے ہیں کہ ہر شعر قاری کے لیے نئے معانی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ جب کہ قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی انھیں آفاقی شعری روایت کا معتبر نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شہپر رسول نے روایت سے وابستگی کو کبھی تقلید نہیں بنایا بلکہ اس کے اندر رہتے ہوئے نئے عہد کے انسان کے دکھ، اضطراب اور امید کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک طرف کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور دوسری طرف پوری طرح عصر حاضر کے شعور سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

علی احمد فاطمی کی نظر میں شہپر رسول ایسا مسافر ہے جس کے قدموں میں سفر کی تھکن بھی ہے اور دل میں گھر کی دائمی یاد بھی۔ ان کے نزدیک شاعر کی داخلی ہجرت، شناخت کی تلاش اور تہذیبی وابستگی اس کی غزل کے بنیادی عناصر ہیں۔ عراق رضا زیدی انھیں 'ریختہ کا مجذوب' قرار دیتے ہیں یعنی ایسا شاعر جو زبان سے محض اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کے باطن میں اتر کر اس کے امکانات کو نئی وسعت عطا کرتا ہے۔ جب کہ کوثر مظہری ان کی شاعری میں دانش ورانہ لہجے اور فکری گہرائی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نجمہ رحمانی شہپر رسول کے غزل کی تہہ دار جمالیاتی رنگوں کو نہایت باریک بینی سے سمجھاتی ہیں۔

ان تمام مضامین کا حاصل یہی ہے کہ شہپر رسول کی غزل صرف جذبے کی ترجمان نہیں بلکہ اپنے عہد کی فکری، تہذیبی اور وجودی بے چینی کا ایک معتبر شعری اظہار بھی ہے۔ ان کی شاعری میں فرد کی داخلی کشمکش، شناخت کا بحران، تہذیبی زوال کا احساس، امید کی رمق اور انسانی وقار کی تلاش مسلسل موجود رہتی ہے۔ اس حقیقت کی جھلک ان کے اس شعر میں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

اس سے پہلے کہ انا میری اڑاتی مجھ کو
خاک مٹھی میں بھری اور اڑا دی میں نے

یہ شعر انا کے فلسفے پر نہایت گہری معنویت رکھتا ہے۔ شاعر خودی کے غرور کو فنا کے شعور سے شکست دیتا ہے۔ یہ شعر محض انکسار کی تلقین نہیں بلکہ انسانی انا کے فلسفے پر ایک گہرا تبصرہ ہے۔ شاعر نے 'خاک' کو فنا، حقیقت اور اصل وجود کی علامت بنایا ہے۔ انسان جب اپنی مٹی ہونے کا شعور حاصل کر لیتا ہے تو غرور، تفاخر اور خود پسندی خود بخود تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں صوفیانہ فکر، اخلاقی شعور اور وجودی آگہی تینوں ایک ساتھ جمع ہو گئے ہیں۔

سہیل احمد فاروقی اور خالد جاوید کے مضامین شہپر رسول کی غزل کے فنی اور صوتی محاسن کا باریک مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں یہ احساس دلاتی ہیں کہ شہپر رسول کی شاعری محض جذبات کی ترسیل نہیں بلکہ زبان، آہنگ، استعارے اور معنی کے باہمی رشتوں کا ایک مسلسل تخلیقی مکالمہ ہے۔

خالد مبشر کا مضمون 'شہپر رسول کا نظمیہ متن' اس خصوصی شمارے کی ایک اہم اور منفرد جہت ہے۔ عمومی طور پر شہپر رسول کی شناخت ایک غزل گو شاعر کی رہی ہے لیکن خالد مبشر اس تصور کو وسعت دیتے ہوئے ان کی نظموں کی فکری وسعت، علامتی ساخت، آہنگ اور وجودی شعور کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شہپر رسول کی نظمیں محض بیانیہ اظہار نہیں بلکہ انسانی تاریخ، تہذیب، وقت، تنہائی اور شناخت کے پیچیدہ سوالات سے مکالمہ کرتی ہیں۔ ان کی نظم میں علامتیں محض آرائش نہیں بلکہ معنی کی تخلیق کا بنیادی وسیلہ بن جاتی ہیں۔ اس حقیقت کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم 'زمانہ لیتا ہے کروٹ' میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں شاعر زمانے کی کروٹ کو صرف سیاسی یا سماجی تبدیلی کے طور پر نہیں بلکہ انسانی شعور، اقدار اور احساسات کی تبدیلی کے استعارے کے طور پر پیش کرتا ہے۔

چمکتی دھوپ بھی، نرمی بھی، کچھ ہوا بھی تھی — کہاں گئی وہ سچ کی صدا فضا میں تھی
نئی امید سے پلکوں پہ صبح اترتی تھی — بہ صد سکون دبے پاؤں دن گزرتا تھا
کنار شام تخیل ستارے جنتا تھا — شب دبیز کے پردے پہ خواب اترتے تھے
مگر یہ کیسی سحر ہے جو دھم سے آئی ہے — ہر ایک گوشۂ ادراک میں سمائی ہے

اس نظم میں شاعر ماضی اور حال کے درمیان ایک نہایت لطیف مگر گہرا تقابل قائم کرتا ہے۔ ابتدائی مصرعوں میں دھوپ کی چمک، ہوا کی نرمی، سچ کی صدا، امید بھری صبح اور سکون سے گزرتے دن ایک ایسے معاشرے کی علامت ہیں جہاں انسانی اقدار، اعتماد اور باہمی رشتوں میں توازن موجود تھا۔ لیکن نظم کا آخری حصہ اچانک ایک شدید داخلی اضطراب کی فضا پیدا کرتا ہے۔ 'مگر یہ کیسی سحر ہے' کا سوال دراصل اس نئے عہد پر سوالیہ نشان ہے جس میں صبح تو آئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ روشنی کے بجائے بے یقینی، اضطراب اور فکری انتشار بھی در آیا ہے۔ یہاں 'ہر ایک گوشہ ادراک میں سمائی ہے' کا مصرع اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ تبدیلی صرف خارجی دنیا تک محدود نہیں بلکہ انسان کے شعور، احساس اور ادراک کی گہرائیوں تک سرایت کر چکی ہے۔ شہپر رسول کی نظم کا یہی وصف ہے کہ ان کی نظم میں وقت ایک زندہ کردار بن جاتا ہے خواب تہذیبی آرزو کی علامت بن جاتے ہیں اور صبح محض نئے دن کا آغاز نہیں بلکہ بدلتے ہوئے انسانی شعور کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔

مجموعی طور پر سبق اردو کا یہ خصوصی شمارہ صرف ایک شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے فن، فکر، زبان، اسلوب اور تہذیبی شعور کی تہہ در تہہ معنویت کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ، منظم اور علمی کوشش بن جاتا ہے۔ اس شمارے نے ایک بار پھر ثابت کیا ہے کہ ادبی رسائل محض مطبوعہ صفحات نہیں ہوتے بلکہ اپنے عہد کی فکری، تخلیقی اور تہذیبی تاریخ کے زندہ دستاویز ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ دسمبر 2025 کا یہ خصوصی شمارہ آنے والے برسوں میں شہپر رسول کے فن اور شخصیت پر ہونے والی ہر سنجیدہ تحقیق کے لیے ایک بنیادی اور معتبر حوالہ ثابت ہوگا۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

80 ویں یوم آزادی کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں پرچم کشائی کی تقریب

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 80 ویں یوم آزادی کے موقعے پر آزادی کا جشن مناتے ہوئے پرچم کشائی کی گئی اور



جوش وخروش کے ساتھ قومی ترانہ گایا گیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ آج کا دن ہم تمام ہندوستانیوں کے لیے نہایت اہم اور جشن کا دن ہے۔ آج ہندوستان اپنا 80 واں یوم آزادی منا رہا ہے۔ یہ دن ایک طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے جس میں ہندوستان کے تمام مذاہب وطبقات کے افراد کی قربانیاں شامل ہیں۔ ہندوستان نے آزادی کے بعد ایک لمبا سفر طے کرتے ہوئے علوم وفنون اور ترقی کی راہیں طے کی ہیں۔ یہ سفر مسلسل جاری ہے اور عزت مآب وزیر اعظم شری نریندر مودی کے 'وکست بھارت 2047@' کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی طرف گامزن ہے۔ ملک کی اس ترقی میں دیگر علوم وفنون کے ساتھ ہندوستانی زبانوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنگ آزادی میں اردو ادب وصحافت کی بے مثال خدمات کا ہر کوئی معترف ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس زبان کے ذریعے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے اور ملک کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل ہیں۔ پرچم کشائی کے اس موقعے پر کونسل میں جشن کا ماحول دیکھا گیا۔ بچوں نے بھی نہایت جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی اور حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹرز، ریسرچ افسران اور اراکین بھی موجودہ رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 15 اگست 2026

تقسیم کی انسانی کہانیوں کی یاد میں

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں 80 ویں جشن یوم آزادی کی مناسبت سے 'تقسیم کی انسانی کہانیوں کی یاد میں' کے عنوان سے ایک لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی (ممتاز پروفیسر و سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کی جب کہ بحیثیت مقرر پروفیسر ارتضیٰ کریم (سابق ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و سابق صدر شعبہ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی) نے شرکت کی۔ اس سے قبل ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں اس انسانی المیہ کا ذکر جس شدت سے کیا گیا ہے شاید ہی کسی دوسری زبان میں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ یہ المناک داستان جس مرکز پر بطور خاص رقم ہو رہی تھی اس کی زبان اردو تھی اردو کے ادیبوں نے اس کا گہرا اثر لیا اور اس کی جزئیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے افسانے اور ناول لکھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے بعد اس انسانی المیے کے واقعہ نے اردو فکشن کو نیا رخ عطا کیا۔

آج کے مقرر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ادیبوں نے تقسیم کے انسانی المیے کو شدت سے محسوس کیا اور تقسیم کے درد کا مؤثر اظہار کیا، انھوں نے تقسیم کی المناکیوں کے ضمن میں منٹو کی کہانی 'شہید ساز' کی قرأت بھی کی اور اس کو بنیاد بنا کر تقسیم کی مختلف جہات کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان کہانیوں میں پوشیدہ سچائیوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی ضرورت ہے، جس سے تقسیم کے المیے سے متعلق بہت سی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ یہ کہانیاں ہمیں ہر دور کے انسانی رشتوں سے وابستہ کرتی ہیں اور انسانی بنیادوں پر اپنے احساسات و جذبات کو زندہ رکھنے کی طرف راغب بھی کرتی ہیں۔



صدارتی خطاب میں پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے تقسیم کے المیے پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو فکشن پر اس کے اثرات پر گفتگو کی اور اس حوالے سے منٹو کی خدمات کو بھی واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم کے المیے پر منٹو نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ اخیر میں ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے کلمات تشکر ادا کیے اور نظامت نایاب حسن نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر قطب الدین، سراج عظیم، مظفر غزالی، منور حسن کمال اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی کے علاوہ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹرز، ریسرچ افسران اور دیگر اراکین موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی، 14 اگست 2026

آج کے تناظر میں پریم چند کی معنویت

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام لکچر روم 2 انیکسی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں 31 جولائی 2026 کو ایک پینل ڈسکشن بعنوان 'آج کے تناظر میں پریم چند کی معنویت' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم (ممتاز ناقد ومحقق، سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے کی جب 24 جلدوں میں کلیات منشی پریم چند شائع کیا، اس کے علاوہ مکمل کشور گوئنکا اور دیگر پریم چند شناس ادیبوں کی تحریریں بھی کونسل شائع کر چکی ہے۔ بطور ڈائرکٹر پریم چند کے یوم پیدائش کی مناسبت سے اس پینل ڈسکشن کا اہتمام کرتے ہوئے مجھے حد درجہ مسرت ہو رہی ہے۔



کہ بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر شانتو مکھر جی (ریٹائرڈ آئی پی ایس، سابق مشیر برائے قومی سلامتی ماریشس و ڈائرکٹر خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی) اور بطور پینلسٹ پروفیسر شہزاد انجم (کارگذار ڈائرکٹر، جے پی اے ایل سی، سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) اور محترمہ سائرہ مجتبیٰ (معروف مترجم و نیوز اینکر، آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی) شریک ہوئے، جب کہ اس پروگرام کی نظامت نہاں رباب (اسسٹنٹ ایڈیٹر این سی پی یو ایل) نے کی۔

استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد شمس اقبال (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی) نے کہا کہ پریم چند ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اس ملک کی 50 فیصد آبادی پر اثر ڈالا ہے۔ ان کا فکشن نہ صرف اردو اور ہندی بلکہ تمام ہندوستانی ادبیات پر اپنا اثر رکھتا ہے اور دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ان کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پریم چند اردو فکشن کے سب سے موثر ادیب کے طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پریم چند کی تمام تخلیقات پر مشتمل

مہمان خصوصی ڈاکٹر شانتو مکھر جی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہندوستانی ادب میں جو ان کی خدمات ہیں وہ نمایاں ہیں اور ان کے نقوش انمٹ ہیں، انھوں نے پریم چند کی مختلف کہانیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پریم چند کسی بھی مسئلے میں بنیاد کو پکڑتے ہیں اور پھر اس کو تمام باریکیوں کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عورتوں کے مسائل میں بھی پریم چند نے جس روشن خیالی کا مظاہرہ کیا وہ وہی کر سکتے تھے ان کی شخصیت وژنری تھی۔ انھوں نے گفتگو کے آخر میں پریم چند کی کہانی 'دنیا کا سب سے انمول رتن' بھی اپنے مخصوص لہجے میں پڑھ کر سنائی۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ پریم چند احساسات اور جذبات کے ادیب ہیں، پریم چند نے اپنے کو دولت کے لیے نہیں بلکہ ادب اور سماج کے لیے وقف کر دیا تھا، پریم چند پہلے فکشن نگار ہیں جن کے اندر حب الوطنی کا جذبہ نمودار ہوا۔ ان کی کہانیاں بظاہر سادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کی تہ بہ تہ جزئیات ان کو خاصی معنی خیز بناتی ہیں۔ پریم چند سماج کے کسی بھی طبقے کو نشانہ نہیں بناتے بلکہ وہ ان چیزوں پر انگلی رکھتے ہیں جن سے سماج میں تبدیلی پیدا







ہو۔ پریم چند کو آج تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں پڑھایا جا رہا ہے، جس کی بنیادی وجہ ان کا تصور انسان و انسان دوستی ہے۔

اس پروگرام کے پینلسٹ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے پریم چند پر اس اہم مذاکرے کا انعقاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں پریم چند کا ترجمہ نہ ہوا ہو، پریم چند نجی زندگی میں بہت سادگی پسند تھے، مشکلات کا سامنا بھی کیا لیکن سماج کے مسائل کو واشگاف کرنے کے معاملے میں بہت ہی زیادہ حساس تھے، انھوں نے پریم چند کے کرداروں پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ سماجی تناظر کو بھی ان سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے زبان کی سطح پر بھی اس وقت ایک بڑی تبدیلی پیدا کی تھی جس میں انھوں نے مشترکہ تہذیب کی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ پریم چند ہندوستانی ادب کے معمار اور سرخیل تھے، جن پر گفتگو ہوتی رہنی چاہیے۔ پریم چند کی شخصیت اور فن کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

محترمہ سائرہ مجتبیٰ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے جس سماج کا منظرنامہ اپنی تخلیقات میں پیش کیا تھا موجودہ منظرنامہ اس سے بہت مختلف نہیں ہے، اب بھی سماج میں ایسی فکر موجود ہے جس کو بدلنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے، پریم چند کا تصور ایک بہتر انسانی سماج کی تشکیل کا تصور تھا، آج بھی ہمیں اس تصور کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مذاکرے کے آغاز سے قبل شال پوشی کے ذریعے مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ اس پروگرام میں پریم چند پر خصوصی گوشے پر مشتمل قومی اردو کونسل کے رسالے ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے ترجمہ نمبر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر) کے کلماتِ تشکر کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس پروگرام میں کونسل کے اسٹاف کے علاوہ دہلی کے اہل علم و قلم، دانشوران، اساتذہ و ریسرچ اسکالرز کی بڑی تعداد موجود رہی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 1 اگست 2026

اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی روشنی میں

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے پانچ روزہ ورکشاپ بعنوان 'اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی روشنی میں' کا افتتاح آج گاندھی بھون آڈیٹوریم، کشمیر یونیورسٹی میں عمل میں آیا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی پروفیسر نیلوفر خان نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی علمی، ادبی



اور تعلیمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس بات پر بے حد خوش ہیں کہ این سی پی یو ایل نے مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کے ساتھ باہمی اشتراک کرتے ہوئے اس اہم ورکشاپ کے انعقاد میں بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کی قیادت کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی رہنمائی میں کونسل اردو زبان کے فروغ، ترویج اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے چنار بک فیسٹیول میں این سی پی یو ایل کی فعال اور موثر شرکت کا بھی خصوصی ذکر کیا اور کہا کہ نو روز تک جاری رہنے والی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں نے کشمیری عوام کو اردو زبان و ادب سے جوڑے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، جو ادارے کی سنجیدہ علمی و ادبی وابستگی کا مظہر ہے۔ پروفیسر نیلوفر خان نے کہا کہ اردو زبان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے تاکہ یہ بدلتے ہوئے تعلیمی اور سماجی ماحول میں موثر کردار ادا کر سکے۔ مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس ادارے کے طلبہ نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں اور انھیں یقین ہے کہ یہ پانچ روزہ ورکشاپ اردو اساتذہ کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافہ کرے گی۔

مہمانِ اعزازی ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، این سی پی یو ایل نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک بھر میں اردو زبان و ادب کے فروغ، معیاری ادبی کتب کی اشاعت، اساتذہ کی تربیتی سرگرمیوں کے انعقاد اور جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ مختلف پروگراموں کے ذریعے اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ این سی پی یو ایل کی مسلسل کوشش ہے کہ اردو کو نئی نسل سے جوڑا جائے اور اسے روزگار، تحقیق اور جدید تعلیم کے میدان میں مزید کارگر بنایا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اساتذہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئی تدریسی مہارتوں اور تعلیمی رجحانات سے خود کو مسلسل آراستہ کرتے رہیں۔

مہمانِ اعزازی پروفیسر شہناز (ڈین، اسکول آف اوپن لرننگ) نے کہا کہ ورکشاپس کا بنیادی مقصد اساتذہ کی علمی و تدریسی صلاحیتوں کو نکھارنا اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سیکھنے کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ ان کے مطابق زبان صرف اظہارِ خیال کا وسیلہ نہیں بلکہ کسی بھی قوم کی تہذیب، ثقافت اور شناخت کی امین ہوتی ہے، اور اردو اس اعتبار سے ایک نہایت زرخیز اور متمول زبان ہے۔

قبل ازاں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر الطاف انجم (ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم) نے کہا کہ ہر زبان اپنی انفرادیت اور حسن رکھتی



ہے اور اس کی خوبصورتی اس کے صحیح استعمال میں مضمر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس پانچ روزہ ورکشاپ کے ذریعے اردو اساتذہ کو قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے اہم نکات، جدید تدریسی طریقوں اور لسانی تربیت سے روشناس کرایا جائے گا۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد رفیع (اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم) نے کی جب کہ کلماتِ تشکر ڈاکٹر شوکت رشید وانی (ایسوسی ایٹ پروفیسر، مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم) نے پیش کیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم کے کانفرنس ہال میں تین تکنیکی سیشن منعقد ہوئے۔ پہلے سیشن میں پروفیسر شفق سوپوری نے 'شعر: شرح، تفہیم اور تعبیر' کے موضوع پر تفصیلی اور فکر انگیز گفتگو کی، جب کہ اس سیشن کی صدارت پروفیسر شفیقہ پروین (سابق ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم) نے کی۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے تدریسی طریقے سیکھنے چاہئیں تاکہ بچوں میں اردو زبان کے تئیں دلچسپی پیدا کی جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ مصنوعی ذہانت سے تدریسی عمل میں مدد لی جا سکتی ہے، تاہم اس پر مکمل انحصار تعلیمی نظام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ ٹیکنالوجی کو معاون وسیلہ بنائیں، نہ کہ اس کا متبادل۔

دوسرے تکنیکی سیشن میں جناب شاکر شفیع نے 'اردو شاعری کی تدریس کے طریقۂ کار' پر جامع لیکچر دیا۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر انوار عالم پاشا (سابق چیئر پرسن ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو) نے کی۔ انھوں نے شرکائے ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اساتذہ دراصل خود صلاحیت ساز ہوتے ہیں اس لیے ان کی ذمے داری بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تدریس کے اصول وضوابط کی پابندی ضروری ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور جدید تدریسی طریقوں کے ذریعے کلاس روم کو زیادہ دلچسپ اور موثر بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی ذہنی سطح، عمر اور نفسیاتی ضروریات کا خاص خیال رکھنا نہایت اہم ہے۔

تیسرے تکنیکی سیشن میں ڈاکٹر عظمت اللہ خان احساس نے 'تدریسی مہارتیں، بچوں کی نفسیات اور اردو اساتذہ کا کردار' کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ اس سیشن کی صدارت جناب شاکر شفیع نے کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس پالیسی کی مختلف خصوصیات، عملی و تخلیقی تدریس، اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔





قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے 'اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی روشنی میں' کے عنوان سے منعقدہ پانچ روزہ ورکشاپ آج اختتامی اجلاس کے ساتھ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوگئی۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف الدین پیرزادہ، ڈین اکیڈمک افیئرز، کشمیر یونیورسٹی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اس نوعیت کی تربیتی ورکشاپس اساتذہ کی علمی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافے کا موثر ذریعہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پانچ روزہ ورکشاپ میں جن اہم اور عصری موضوعات پر ماہرین نے اظہارِ خیال کیا، وہ موجودہ تعلیمی منظرنامے میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے شرکائے ورکشاپ پر زور دیا کہ وہ یہاں حاصل کیے گئے علم، تجربات اور جدید تدریسی طریقوں کو اپنی درس گاہوں میں عملی طور پر بروئے کار لائیں اور اپنے طلبہ تک منتقل کریں، کیونکہ اسی صورت میں اس ورکشاپ کے حقیقی مقاصد حاصل ہوسکیں گے۔

پروفیسر طارق احمد چشتی، سابق ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم نے اپنے خطاب میں اساتذہ کے کردار کو نہایت اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ تدریسی عمل میں بچوں کی نفسیات، ذہنی استعداد اور بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک اچھا استاد صرف نصاب نہیں پڑھاتا بلکہ طلبہ کی شخصیت سازی اور ان کی ہمہ جہت ترقی میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

پروفیسر الطاف انجم، ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم نے کہا کہ اس ورکشاپ کے دوران حاصل ہونے والی معلومات اور تدریسی مہارتوں کو عملی زندگی میں نافذ کرنا ہی اس کی اصل کامیابی ہے۔ انھوں نے شرکائے ورکشاپ سے اپیل کی کہ وہ یہاں سیکھی ہوئی جدید تدریسی تکنیکوں، قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نکات اور جدید تعلیمی رجحانات کو اپنے طلبہ تک ضرور پہنچائیں تاکہ ان کی تدریس مزید موثر اور بامقصد بن سکے۔

اس موقعے پر پروفیسر صلاح الدین ٹاک، پروفیسر سجان کور بالی، پروفیسر محمد ریاض اور سید جاوید کرمانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس نوعیت کی علمی و تربیتی سرگرمیوں کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا اور اردو اساتذہ کے لیے ان کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

اختتامی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد رفیع نے انجام دی جب کہ ڈاکٹر بلال نے کلماتِ تشکر پیش کیے۔ آخر میں ورکشاپ میں شریک تمام ریسورس پرسنس، مختلف تکنیکی نشستوں کے صدور اور شرکائے ورکشاپ میں اسناد تقسیم کی گئیں۔

پانچ روزہ ورکشاپ کے دوران اٹھارہ تکنیکی سیشنس منعقد ہوئے۔ ان سیشنس میں قومی تعلیمی پالیسی 2020، اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی، جدید تدریسی اسالیب، مصنوعی ذہانت (AI) کا تعلیمی استعمال، اردو شاعری اور نثر کی تدریس، شعر کی شرح و تعبیر، سوال سازی، بچوں کی نفسیات، درست تلفظ، املا و تحریر، اخلاقی اقدار کی تدریس، کثیر جہتی تعلیم، ایک مثالی استاد کی خصوصیات اور جدید تعلیمی ٹیکنالوجی سمیت متعدد اہم موضوعات پر تفصیلی اور عملی لیکچرز پیش کیے گئے۔

ورکشاپ میں پروفیسر شفق سوپوری، پروفیسر محمد ریاض احمد، پروفیسر الطاف انجم، ڈاکٹر عظمت اللہ خان احساس، ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر راکیش کمار، ڈاکٹر نصرت جبیں، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، ڈاکٹر محمد رفیع، ڈاکٹر شوکت رشید وانی، ڈاکٹر اسرار احمد خان، ڈاکٹر حبیب اللہ شاہ، محترمہ مطہرہ حنیف، ڈاکٹر روحی سلطانہ، میر ساجد رمضان، شاکر شفیع نے مختلف علمی و تدریسی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ تمام سیشنز میں جدید تدریسی طریقوں، قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے عملی پہلوؤں اور اردو زبان کی موثر تدریس سے متعلق مفید مباحث ہوئے۔ ہر تکنیکی سیشن کے بعد سوال و جواب کا بھی وقفہ رکھا گیا، جس میں شرکائے ورکشاپ نے بھرپور دلچسپی کے ساتھ موضوعات سے متعلق سوالات کیے اور ماہرین نے ان کے مدلل اور اطمینان بخش جوابات دیے۔

اس ورکشاپ کا بنیادی مقصد قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں اردو اساتذہ کو جدید تدریسی مہارتوں، نئی تعلیمی ٹیکنالوجی اور موثر تدریسی حکمتِ عملیوں سے آراستہ کرنا تھا۔ پانچ روز تک جاری رہنے والی اس علمی و تربیتی ورکشاپ نے شرکا کو نہ صرف نئے تدریسی رجحانات سے روشناس کرایا بلکہ انھیں عملی مشقوں، مکالمے اور ماہرین کے تجربات سے استفادہ کرنے کا بھی بھرپور موقع فراہم کیا، جس کے باعث یہ ورکشاپ اپنے مقاصد کے حصول میں نمایاں طور پر کامیاب رہی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی، 28 جولائی و 2 اگست 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای۔میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دھلی

راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات

نئی دھلی: اردو کے صاحب اسلوب شاعر، معروف ناول نگار راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کا آغاز 1 اگست 2026 کے روز اردو گھر میں ایک منفرد انداز



میں ہوا۔ افتتاحی تقریب میں مشہور زمانہ ٹیلی ویژن سیریل 'مہابھارت' کے ساڑھے تین منٹ کے ایک یادگار منظر کی پروجیکٹر کے ذریعے نمائش کی گئی۔ یہ وہی تاریخی سیریل ہے جس کی اسکرپٹ راہی معصوم رضا نے اردو رسم الخط میں تحریر کی تھی۔ تقریب کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی، جب کہ معروف سماجی کارکن سبھاشنی علی نے اپنے خصوصی خطاب میں راہی معصوم رضا کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو ہند کے لائف ٹرسٹی اور سابق مرکزی وزیر خارجہ سلمان خورشید، پروفیسر ہریش ترویدی، وبھوتی نارائن رائے، ڈاکٹر مجاز مونس سمیت کثیر تعداد میں اہل علم و ادب موجود تھے۔ نظامت کے فرائض مالک اشتر نے انجام دیے۔ سلمان خورشید نے اپنے خطاب میں کہا کہ راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کا مقصد صرف ایک عظیم ادیب کو یاد کرنا نہیں بلکہ اپنی مشترکہ تہذیبی وراثت سے دوبارہ رشتہ قائم کرنا بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے اپنی تہذیب کے ساتھ انصاف نہیں کیا، بلکہ راہی معصوم رضا کے ساتھ بھی وہ انصاف نہیں ہوسکا جس کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے کہا کہ راہی معصوم رضا کی تحریروں کی اشاعت کا کام بہت پہلے ہوجانا چاہیے تھا، لیکن اب اس سمت میں پیش رفت کی جارہی ہے۔ اردو اور ہندی کے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے سلمان خورشید نے کہا کہ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں، ایک چہرے کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔ ہم یہ بات سمجھاتے رہے، لیکن افسوس کہ یہ پیغام لوگوں کے دلوں تک پوری طرح نہیں پہنچ سکا۔ تقریب میں ڈاکٹر صدف فاطمہ نے کہا کہ انجمن کی کوشش ہے کہ راہی کے شہرہ آفاق ناول 'آدھا گاؤں' کو تدوین کے اصولوں کے مطابق شائع کیا جائے تاکہ اصل متن قارئین تک پہنچ سکے۔ پروفیسر ہریش ترویدی نے کہا کہ سب جانتے ہیں کہ 'آدھا گاؤں' اردو رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ اردو ایڈیشن کی اشاعت اور فروخت کے اعداد و شمار واضح نہیں ہیں، جب کہ ہندی میں اس ناول کی دس لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں، جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ تقریب میں مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ راہی معصوم رضا کی ادبی خدمات کو نئی نسل تک پہنچانے اور ان کی اصل تخلیقی شناخت کو برقرار رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تقریب کے ایک اور اہم سیشن میں پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر عاصم صدیقی اور پروفیسر محمد سجاد نے راہی معصوم رضا کی شخصیت، ان کے فکری پس منظر اور علی گڑھ سے ان کے گہرے تعلق پر گفتگو کی۔ مقررین نے کہا کہ راہی کی ادبی تشکیل میں علی گڑھ کی علمی و تہذیبی فضا کا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے راہی کی تخلیقات میں موجود سماجی شعور، مشترکہ تہذیب اور علی گڑھ کی روایات کے اثرات کو بھی اجاگر کیا۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ راہی معصوم رضا کو صرف ایک ادیب کے طور پر نہیں بلکہ برصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ قلمکار کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 2 اگست 2026

مادری زبان اور انگریزی

نئی دھلی: شعبۂ تعلیمی مطالعات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی 'پوسٹ گریجویٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن' (پی جی ای اے) اور ڈی ای ایس تھوری، پریکٹس کنیکٹ کے اشتراک سے 23 جولائی 2026 کو صبح 11 بج کر 40 منٹ پر شعبہ کے سمینار ہال میں 'مادری زبان اور انگریزی' کے موضوع پر ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔ اس لیکچر کا مقصد طلبہ، ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کو کثیر لسانی معاشروں اور عصری تعلیمی پالیسیوں کے تناظر میں مادری زبان کے ذریعے تعلیم اور انگریزی زبان سیکھنے کے عمل کے باہمی تعلق کے بارے میں گہری سمجھ فراہم کرنا تھا۔ علاوہ ازیں، اس کا مقصد ہندوستانی تناظر میں زبان، شناخت، مساوات اور تعلیمی مواقع جیسے موضوعات پر بامقصد علمی مکالمے کو فروغ دینا بھی تھا۔ جناب اظہر احمد نے اپنے خیر مقدمی خطاب میں موضوع کی اہمیت کو

اجاگر کیا جو کثیر لسانیت کو فروغ دینے کے لیے تدریس کے ذریعے ابلاغ کے طور پر مادری زبان کے استعمال کی وکالت کرتا ہے۔ پروفیسر چیس لاڈوسا، بشریات کی صدر اور پروفیسر اور ہیملٹن کالج، نیویارک، امریکہ میں ایجوکیشنل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر لاڈوسا بین الاقوامی سطح کے مقبول اسکالر ہیں جن کی تحقیق زبان، تعلیم، سماجی طبقے اور سیاسی معیشت پر مرکوز ہے، جسے شمالی ہندوستان میں وسیع پیمانے پر ایتھنوگرافک فیلڈ ورک کے ذریعے تعاون حاصل ہے۔ اپنے خطاب میں پروفیسر لاڈوسا نے اس پر زور دیا کہ زبان، رابطے کا ذریعہ محض نہیں۔ یہ شناخت، ثقافت، سماجی نقل وحرکت اور تعلیمی تجربات کے ساتھ مضبوطی سے منسلک ہے۔ ہندوستان میں اپنی طویل مدتی نسل سے متعلق تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے، انھوں نے وضاحت کی کہ کس طرح مادری زبان اور انگریزی کے درمیان سمجھی جانے والی تقسیم اکثر لسانی حقائق کے بجائے وسیع تر سماجی خواہشات اور عدم مساوات کی عکاسی کرتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 25 جولائی 2026

ورلڈ ہیپاٹائٹس ڈے پر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا سمینار

نئی دھلی: ورلڈ ہیپاٹائٹس ڈے کے موقعے پر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے زیر اہتمام اردو گھر میں ایک علمی تقریب کا انعقاد کیا، جس میں اطبا، اساتذہ، طبی طلبہ اور



طب سے وابستہ افراد کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مقررین نے ہیپاٹائٹس اور جگر کے دیگر امراض سے متعلق آگہی، بروقت تشخیص، احتیاطی تدابیر اور علاج کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ معروف ماہر امراض جگر ڈاکٹر کاشف ذکائی نے ہیپاٹائٹس کی مختلف اقسام، اسباب، علامات، احتیاطی تدابیر اور جدید علاج پر تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس موذی مرض کی روک تھام کے لیے عوام میں شعور بیدار کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہمدرد ویلنیس کے ڈاکٹر نوشاد علی رانا نے فیٹی لیور کے موضوع پر پرزینٹیشن پیش کرتے ہوئے کہا کہ جگر انسانی جسم کا انتہائی اہم عضو ہے، جس کی حفاظت کے لیے متوازن غذا، صحت مند طرزِ زندگی، باقاعدہ ورزش اور موٹاپے پر قابو پانا ضروری ہے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر رگھورام ائیاگری، رجسٹرار، دہلی بھارتیہ چکستا پریشد نے اپنی تقریر میں ہیپاٹائٹس سمیت جگر کے امراض کے بڑھتے ہوئے خطرات پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے عوامی بیداری، احتیاطی تدابیر اور مختلف طبی شعبوں کے باہمی تعاون کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر محمد زبیر، پرنسپل طبیہ کالج، قرول باغ نے کہا کہ جگر کی حفاظت درحقیقت صحت مند زندگی کی بنیاد ہے، جس کے لیے احتیاط، بروقت تشخیص اور مناسب علاج کو فروغ دینا ناگزیر ہے۔

اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے کہا کہ جگر انسانی جسم کی 'کیمیائی فیکٹری' ہے اور اس کی صحت پورے جسم کی صحت کی ضامن ہے۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی میں ہیپاٹائٹس، فیٹی لیور اور دیگر امراضِ جگر کے لیے موثر، محفوظ اور آزمودہ ادویات اور علاجی اصول موجود ہیں، جن کی افادیت صدیوں کے طبی تجربات سے ثابت ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جدید سائنسی تحقیق کو طب یونانی کی روایتی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے جگر کے امراض کے علاج اور روک تھام میں مزید بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کانفرنس مستقبل میں بھی اطبا کی علمی و پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے فروغ، مسلسل طبی تعلیم (سی ایم ای)، جدید مہارتوں کے حصول، تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ اور طب یونانی کی ترقی کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھے گی، تاکہ یہ نظامِ طب قومی صحت عامہ کے پروگراموں میں مزید موثر کردار ادا کرنے کے ساتھ عالمی سطح پر بھی اپنی اہمیت کو مستحکم کر سکے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر عشرت کفیل نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 30 جولائی 2026

بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ تھیٹر کی دنیا کی ممتاز شخصیت



سلیم عارف نے 'ہندستانی تھیٹر: آج اور کل' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا عموماً جب بھی ہندستانی تھیٹر کی بات ہوتی ہے تو زیادہ تر ناسازگار حالات لوگوں کی بے توجہی اور سرکاری معاونت میں کمی کا رونا رویا جاتا ہے لیکن کوئی عملی اقدام کی طرف توجہ نہیں دلائی جاتی۔ میری نظر میں تھیٹر کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ مناسب قیمت پر آڈیٹوریم کی کمی ہے۔ اگر کم قیمت پر سہولیات کا خیال رکھتے ہوئے آڈیٹوریم کا انتظام ہو تو تھیٹر کی دنیا میں نمایاں پیش رفت ہوگی۔ خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس جناب بدرورریز احمد نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ بیگم عابدہ احمد اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا رشتہ اساسی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں اردو کے ایسے ادارے کا خواب دیکھا تھا جو روایت کے ساتھ عصری مسائل کو بھی پیش نظر رکھتا ہو۔ آج کا خطبہ بھی انہی کے وژن کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ہمارے یہاں جو سمینار ہوتے ہیں وہ خالص ادبی اور تحقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کا یہی مزاج قائم رکھنے کی ضرورت ہے، لیکن دوسری ادبی سرگرمیوں کے ذریعے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ وہ پہلو بھی زیر بحث آئیں جن کا سیدھا تعلق ادب اور تحقیق سے نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس تصور کی تکمیل کے لیے اب سے پہلے بھی جو ارباب فکر یہاں تشریف لائے ان کی گفتگو بہت فکرانگیز ثابت ہوئی اور آج کا خطبہ بھی اسی روایت کو مستحکم کرے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو یادگاری خطبات کا انعقاد کرتا ہے۔ ایک

فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ اور دوسرا بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبہ۔ ان دونوں لکچرس میں ہماری کوشش رہتی ہے کہ خالص ادب کے بجائے اپنے اردگرد کے دیگر مسائل پر بھی گفتگو ہو سکے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 26 جولائی 2026

پروفیسر محسن عثمانی کی تصنیف 'تراوشِ قلم' پر مذاکرہ

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے مجدد آئی او ایس سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر نے نامور ادیب و مصنف پروفیسر محسن عثمانی کے مضامین کی کتاب 'تراوشِ قلم' پر ایک مجلس گفتگو کا اہتمام کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے کی، جب کہ نامور اسکالرز پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد مبشر، اور معصوم مرادآبادی نے مذاکرے میں حصہ لیا۔ خیر مقدمی اور شرکائے مذاکرہ کا تعارف مجدد آئی او ایس سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کے کنوینر انجم نعیم نے پیش کیا۔ انھوں نے سینٹر کے مقاصد اور اس کی سنجیدہ ادبی مصروفیات پر روشنی ڈالی۔ مصنف کتاب پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے کتاب کے مواد پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے کہا یہ کام ان منتشر اوراق کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے، جو اہم موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے اردو نثر میں مصنف کے تعاون کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کے یہ مضامین اہل علم وادب کے لیے اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'تراوشِ قلم' ادبی خوبصورتی اور علمی صداقت کا امتزاج ہے اور مصنف کے گہرے مشاہدے اور گہری انسانی فکر کا عکاس بھی ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کتاب کو معیاری اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ انھوں نے مصنف کے اسلوب کو دلفریب اور پرخلوص بتایا۔ انھوں نے کہا کہ کتاب قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس کے مضامین سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کتاب کی ادبیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ندوی جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، علمی معروضیت اور ادبی ہنرمندی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ معصوم مرادآبادی نے 'تراوشِ قلم' کو اردو کی ادبی اور فکری زندگی کے ایک اہم دور کی دستاویز قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ قارئین کے لیے ان کا ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ پروفیسر ندوی نے اس موقعے پر مقررین اور دیگر شرکائے مذاکرہ کے فکرانگیز مشاہدات و تاثرات پر ان کا شکریہ ادا کیا

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جولائی 2026

میر تقی میر کی یاد میں

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی کے ملٹی پرپز ہال میں جناب وپن گرگ کی



مرتب کردہ 'دیوانِ میر' کے ہندی ایڈیشن کی اشاعت کے موقعے پر 'میر تقی میر کی یاد میں' کے عنوان سے ایک شاندار ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں میر تقی میر کی شخصیت، شاعری اور ادبی وراثت پر ایک فکرانگیز ادبی مذاکرہ منعقد ہوا، جب کہ دوسرے سیشن میں میر کی غزلوں پر مشتمل دل نشیں محفل غزل پیش کی گئی۔ یہ پروگرام زبان و ادب اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے حکومت دہلی کے وزیر محکمہ فن، ثقافت و السنہ و چیئرمین اردو اکادمی، دہلی جناب کپل مشرا کی مسلسل سرپرستی اور تعاون کا نتیجہ تھا۔ واضح رہے کہ حکومت دہلی اور معزز وزیر ثقافت کے مسلسل تعاون کے باعث اردو اکادمی، دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں نہایت اہتمام کے ساتھ تسلسل سے جاری ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں دہلی حکومت کے محکمہ فن، ثقافت اور السنہ کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے معزز مہمانانِ جناب امت یادو (سابق سکریٹری، حکومت ہند)، جناب پی کے ترپاٹھی (سابق چیف سکریٹری، حکومت دہلی)، جناب اشوک مہیشوری (مینیجنگ ڈائریکٹر، راج کمل پرکاشن) اور ممتاز غزل گلوکارہ محترمہ ودیا شاہ کا خیر مقدم کیا۔ اپنے استقبالیہ خطاب میں جناب لیکھ راج نے تمام شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ جناب وپن گرگ نے دیوانِ میر کو ہندی میں مرتب کر کے ایک نہایت اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے ذریعے میر تقی میر کی شاعری ہندی قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچ سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام اس لیے بھی بے حد ضروری تھا کہ میر کی شاعری ہر دور میں زندہ رہنے والی شاعری ہے اور تین صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کا کلام اسی تازگی اور تاثیر کے ساتھ پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ پروگرام کا پہلا سیشن 'میر تقی میر: شاعر، ان کی شاعری اور ادبی وراثت' کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک علمی و ادبی مذاکرے پر مشتمل تھا، جس میں معروف صحافی اور داستان گو جناب دارین شاہدی نے دیوانِ میر کے ہندی ایڈیشن کے مرتب و مدیر جناب وپن گرگ سے میر کی شاعری، زبان، ہندی میں دیوان کی ترتیب کی ضرورت اور اس اہم کام کی تکمیل کے دوران پیش آنے والی مشکلات پر تفصیلی اور معلومات افزا گفتگو کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 23 جولائی 2026

علاقائی زبانوں کے انضمام کے ذریعے قانونی تعلیم کو مضبوط بنانا

نئی دھلی: حکومت ہند کی وزارت قانون و انصاف کے قانونی امور کے محکمے نے بار کونسل آف انڈیا (بی سی آئی) کے تعاون سے آج بار کونسل آف انڈیا، نئی دہلی کے احاطے میں علاقائی زبانوں کے انضمام کے ذریعے قانونی تعلیم کو مضبوط بنانے کے موضوع پر ایک قومی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ کانفرنس میں آرمڈ فورسز ٹریبونل کے چیئرپرسن اور بار کونسل آف انڈیا کی قانونی تعلیم سے متعلق قائمہ کمیٹی کے شریک چیئرمین عزت مآب جسٹس راجندر مینن، ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) اور بار کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جناب منان کمار مشرا، محکمہ قانونی امور کے سکریٹری ڈاکٹر راجیو مانی اور دیگر معززین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا انعقاد ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں قانونی تعلیم اور انصاف کی فراہمی کے نظام کو فروغ دینے کے لیے دس سالہ نقطہ نظر ایکشن پلان تیار کرنے کے مقصد سے کیا گیا تھا۔ اس تقریب نے مرکزی حکومت کے سینئر نمائندوں، قانونی تعلیم کے سرکردہ مراکز کے وائس چانسلروں، بار کے اراکین، عدلیہ کے نمائندوں اور نامور قانونی ماہرین تعلیم کو ہندوستان میں کثیر لسانی قانونی تعلیم کو مضبوط بنانے کے لیے ایک منظم روڈ میپ پر غور کرنے کے لیے اکٹھا کیا۔ بات چیت میں انگریزی کو ایک اہم

قومی اور بین الاقوامی روابط والی زبان کے طور پر محفوظ رکھتے ہوئے ہندوستانی زبانوں کو قانونی تعلیم میں ضم کرنے کے لیے ایک مرحلہ وار، منظم، قابل پیمائش اور معیار پر یقین رکھنے والا فریم ورک تیار کرنے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ مجوزہ فریم ورک کا مقصد قانونی فہم کو بڑھانے، انصاف تک رسائی کو بہتر بنانے، قانونی امداد اور طبی قانونی تعلیم کو مستحکم کرنے اور مستقبل کے قانونی پیشہ ور افراد کو ضلعی اور ماتحت عدالتوں کے سامنے پریکٹس کے لیے بہتر طور پر تیار کرنے کے لیے ذولسانی اور بتدریج کثیر لسانی قانونی تعلیم کے ماڈل کو فروغ دینا ہے۔ شرکا نے قانونی ماحولیاتی نظام کے اندر زبان کے انضمام کو تیز کرنے میں ٹیکنالوجی کے کردار پر بھی غور کیا۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندوستانی زبانوں میں درست اور قابل اعتماد قانونی تعلیم کو آسان بنانے کے لیے ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجیز بشمول مصنوعی ذہانت سے چلنے والے ترجمہ کے اوزار، ڈیجیٹل قانونی ذخائر، معیاری قانونی لغت اور اصطلاحات کے ڈیٹا بیس کا موثر طریقے سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے، جو قانونی اور لسانی ماہرین کی طرف سے سخت توثیق کے تابع ہوں۔ آگے بڑھنے کے راستے کے ایک حصے کے طور پر، کانفرنس نے قانونی تعلیم میں ہندوستانی زبان سے متعلق قومی اعلامیہ کی سمت میں کام کرنے، مرحلہ وار نفاذ کے لیے دس سالہ نقطہ نظر ایکشن پلان کے وسیع فریم ورک کو حتمی شکل دینے اور ایک قومی اسٹیئرنگ کمیٹی قائم کرنے کا عزم کیا، جو مشترکہ طور پر محکمہ قانونی امور اور بار کونسل آف انڈیا کے زیر اہتمام ہے، تاکہ مجوزہ اصلاحات کے نفاذ کی نگرانی، رہنمائی اور نگرانی کی جاسکے۔ کانفرنس نے ہندوستانی زبانوں کو مربوط طریقے سے مربوط کر کے جامع، قابل رسائی اور اعلیٰ معیار کی قانونی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے حکومت ہند، بار کونسل آف انڈیا اور تمام اسٹیک ہولڈرز کے مشترکہ عزم کا اعادہ کیا، اس طرح انصاف تک مساوی رسائی کے وژن کو آگے بڑھانا اور وکست بھارت 2047@ کے حصول میں تعاون کرنا بھی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جولائی 2026

غالب توسیعی خطبہ

نئی دھلی: ''آج ساری دنیا میں عالمی ادب کا تصور بہت تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ عالمی ادب کس کو



کہا جائے اس کے معیار اور پیمانے کیا ہونے چاہیے اور اس کے انتخاب جیسے اہم سوالات اور اس سمت میں اقدامات کی طرف ساری دنیا متوجہ ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں مغرب میں ایک کتاب بھی مرتب ہوئی ہے جس میں اردو کی طرف سے صرف غالب نمائندگی کرتے ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر انیس الرحمٰن نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مغرب نے جہاں بہت سی باتوں سے چشم پوشی کی ہے وہیں ایسے کام بھی کیے جس کے لیے تمام ادبی دنیا کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر فرانس پریچٹ کا نام سرفہرست ہے جو اپنی بنائی ہوئی ویب سائٹ کو روزانہ اپڈیٹ کرتی ہیں۔ اس میں اردو سے متعلق جو مواد ہے وہ کسی دوسری سائٹ پر نہیں مل سکتا۔ غالب نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب توسیعی خطبہ بظاہر عام سی رسم ہے لیکن ہم اس کے انعقاد سے پہلے بہت غور وفکر اور مشورہ کرتے ہیں کہ کس شخصیت کو دعوت دی جائے تاکہ تکرار سے محفوظ رہا جاسکے۔ آج پروفیسر انیس الرحمٰن نے جن پہلوؤں کی جانب ہمیں متوجہ کیا وہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ وہ ساری دنیا میں ادبیات کی سمت ورفتار اور نئے چیلنجز کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ قومی اور بین الاقوامی سمینار کے انعقاد کے علاوہ اہم موضوعات پر توسیعی خطبات کا بھی انعقاد کرتا ہے۔ ان خطبات کے ذریعے اردو دنیا میں تحقیقی وتنقیدی رجحان کو فروغ دینا ہماری ترجیحات میں شامل ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 جولائی 2026

سی ایس آئی آر کی پاپولر سائنس کی کتابوں کے اردو ترجمہ کو حتمی شکل دینے کے سلسلے میں ورکشاپ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نوم چومسکی کمپلیکس میں واقع اردو اکیڈمی کے لائبریری کم کمیٹی روم میں سی ایس آئی آر این آئی ایس سی پی آر کی پاپولر سائنس کی کتابوں کے اردو ترجمے پر نظر ثانی اور حتمی شکل دینے سے متعلق ہفت روزہ ورکشاپ آج اختتام پذیر ہوئی۔ ورکشاپ کا بنیادی مقصد سی ایس آئی آر این آئی ایس سی پی آر کے پاپولر سائنس کی کتابوں کے اردو ترجمے کی درستگی اور انھیں حتمی شکل دینا تھا۔ ورکشاپ کے دوران جن سائنسی کتابوں کو حتمی شکل دی گئی، ان کے عنوانات اس طرح ہیں 'آرٹیفیشیل انٹلی جنس' از ڈی کے پاوتے، 'ان سائیڈ ایٹمز' از ایل ایس کوٹھاری اور ایچ پی تیواری، 'مائنگ دی اوشنز پی کے ایس مورتی، وی جی کلکرنی آر این بھاگوت، 'ڈوئنگ سائس از فن' از وی جی کھمبیر اور 'لائف ان دی یونیورس' ایم ایس چڈھا اور بال پھونڈ کے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے قومی ترجمہ مشن (این ٹی ایم) سی آئی آئی ای، وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند میسور کے اشتراک سے ہفت روزہ ورکشاپ کے انعقاد کی منظوری اور ہر ممکن تعاون دینے پر وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف اور رجسٹرار پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی کا شکریہ ادا کیا۔ اکادمی کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر جسیم احمد نے پروگرام کے آغاز میں ورکشاپ کے خصوصی ماہرین اور ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹرس ڈاکٹر محمد نوشاد عالم، قومی ترجمہ مشن، سی آئی آئی ایل، میسور اور ورکشاپ کے مقامی کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر نوشاد عالم، مترجم، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر احمد نے اس نوع کے منفرد ورکشاپ کی اہمیت اجاگر کی جن میں بچوں کی دلچسپی اور تجسس کو مدنظر رکھا جاتا ہو نیز جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بچوں پر مرکوز کتابوں کو حتمی شکل دی جاتی ہو، انھوں نے نوجوان صلاحیتوں کی آبیاری کے لیے ایسی کتابوں میں مرموز اقدار کو بھی اجاگر کیا۔ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شعیب عبداللہ (سبکدوش) شعبۂ تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ماہرین خصوصی کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری انتہائی خلوص سے سرانجام دیں تاکہ کتابوں کو اشاعت کے لیے بھیجنے سے قبل انھیں ہر قسم کی غلطیوں سے پاک کیا جاسکے چونکہ یہ ورکشاپ پاپولر سائنس کی

کتابوں کے اردو ترجمے کا جائزہ لینے اور انھیں حتمی شکل دینے کے سلسلے میں منعقد کی جارہی ہے، اس لیے دیے گئے متون کا مطالعہ کرتے وقت خصوصی احتیاط کی اشد ضرورت ہے۔ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر محمد نوشاد عالم نے این ٹی ایم، میسور کے 2008 میں قیام کے بعد سے اب تک کی اس کی نمایاں کامیابیوں سے متعلق ایک مختصر پرزنٹیشن دیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 16 جولائی 2026

حضرت امیر خسرو اردو، ہندی کے پہلے شاعر

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام وزارت ثقافت حکومت ہند کے تعاون سے حضرت امیر



خسرو اردو، ہندی کے پہلے شاعر کے عنوان سے 20 جولائی کو ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہندی کے پروفیسر جانکی پرساد شرما نے لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ زبان کے تعلق سے امیر خسرو کا نظریہ بہت معتدل تھا۔ ہم اردو ہندی میں تفریق نہیں کر سکتے۔ ہندی کے ادیب بالمکند گپت جو صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے امیر خسرو کی ہندی شاعری شائع کی تھی۔ بھارتیندو اور رام چندر شکل نے اپنی کتاب ہندی ادب کی تاریخ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اردو شاعری اور زبان کی روایت کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اردو کا استعمال پرتھوی راج راسا میں کیا گیا۔ ہندی کی ادبی تاریخوں میں ایک باب لکھا جانا چاہیے۔ امین چیریا کوٹی نے حضرت امیر خسرو کا کلام مرتب کر کے 'جواہر خسروی' کے عنوان سے علی گڑھ سے شائع کیا تھا اور سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آب حیات میں تفصیلی ذکر کیا اور پریم چند نے اپنے مدراس کے خطبے 1934 میں کہا تھا کہ ادبی ہندی کا پہلا بیج امیر خسرو نے بویا، اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی محبوب اور دل نواز ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، جنھیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا۔ وہ صوفی بھی تھے، سپاہی بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ ماہر موسیقی اور مورخ بھی تھے۔ فارسی اور ہندی میں شاعری کی۔ اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے انسانی ذہنوں میں آج تک زندہ و تابندہ ہیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ امیر خسرو نے اپنی زبان میں برج بھاشا کا استعمال کیا۔ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ امیر خسرو نے اس میں پہیلیاں بھی لکھیں اور ان کا نعتیہ اور منقبتی کلام بہت مشہور ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ امیر خسرو نے آٹھ بادشاہوں کا دورہ دیکھا تھا، وہ عربی فارسی ترکی جانتے تھے۔ خسرو جیسا شاعر فارسی زبان میں پیدا نہیں ہوا۔ خسرو تمام اصناف کے بادشاہ تھے۔ لاکھوں غزلیں لکھی ہیں، موسیقی ان کی دین ہے، ستار اور طبلے کا ایجاد کیا۔ امیر خسرو کا کلام قوال پڑھتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 21 جولائی 2026

دہلی ریجنل سینٹر کے نئے دفتر کا افتتاح

نئی دھلی: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نصب العین اردو زبان کو فروغ دینا اور نئی نسل کو روزگار کے قابل بنانا ہے۔ اس مقصد کے تحت یونیورسٹی اب تک اردو میڈیم نصاب کی 534 کتابیں تیار کر چکی ہے جب کہ تقریباً 400 ماہرین اردو میں نصاب کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے دہلی ریجنل سینٹر کے نئے دفتر کے افتتاح کے موقعے پر منعقدہ ایک پروقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی پورے ملک میں اردو میڈیم کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے پیشہ ورانہ کورسز کے ذریعے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو روزگار کے قابل بھی بنا رہی ہے۔ اس موقعے پر مہمانِ اعزازی، سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ یونیورسٹی نے بالخصوص مدارس کے طلبہ کے لیے پیشہ ورانہ کورسز فراہم کر کے ان کے بہتر مستقبل کی راہ ہموار کی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو یونیورسٹی اور این سی پی یو ایل کا قیام تقریباً ایک ہی وقت میں عمل میں آیا، تاہم اردو یونیورسٹی کو ایسے قائدین ملے جن کی صلاحیتوں اور قیادت کی بدولت ادارہ مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر مدھوکر ایم وارے نے بھی اردو یونیورسٹی کی شاندار کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ پروگرام کا آغاز دہلی ریجنل سینٹر کی ریجنل ڈائرکٹر روچیکا کیم کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ نظامت سید جعفر مہدی واسطی اور صادقہ زہرہ نے کی، جب کہ اظہار تشکر جاوید عالم نے پیش کیا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے مختلف ریجنل سینٹروں سے بڑی تعداد میں اساتذہ، افسران اور دیگر افراد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 23 جولائی 2026

ادبی نشست

نئی دھلی: اردو کی شیدائی سماجی کارکن ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نے القاضی اردو اکیڈمی اینڈ کوچنگ ٹرسٹ کی بنیاد رکھ کر ثابت کر دیا کہ اردو زبان کو سرزمین ہند سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان کی ترقی کے پیش نظر دی انڈیا مال نیو فرینڈز کالونی میں آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ کی روح رواں، القاضی اردو اکیڈمی اینڈ کوچنگ ٹرسٹ کی بانی اور سرگرم سماجی کارکن ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور طبی یونانی کانگریس کے صدر ڈاکٹر سید احمد خاں کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ اس موقعے پر بحیثیت صد ر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نے قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید احمد خان نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عالمی سطح پر اردو زبان ہمیشہ زندہ رہے گی۔ طبیہ کالج قرول باغ کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ادریس نے مسرت آمیز لہجہ میں کہا کہ ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نہ صرف قانونی کام کر رہی ہیں بلکہ آیورویدک و یونانی دواخانہ کے ساتھ ساتھ القاضی اردو اکیڈمی اینڈ کوچنگ ٹرسٹ کا قیام قابل تحسین کام ہے۔ مہمان ذی وقار سراج الدین قریشی (انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے سابق ڈائرکٹر) نے کہا کہ خاتون وکیل ہونے کے ناطے شاہ جبین قاضی کی اردو زبان کے تئیں توجہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف اردو زبان کی ترقی بلکہ سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی صحت و تعلیم پر بہترین کام انجام دینے میں سرفہرست ہیں۔ پروفیسر شامہ نے پرزور انداز میں کہا کہ اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے اشد ضروری ہے۔

ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی اردو زبان کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ معروف ادیبہ، صحافی، شاعرہ اور معلّمہ ڈاکٹر وسیم راشد نے کہا کہ ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نسل نو کے لیے روشن چراغ ہیں۔ سابق پرنسپل ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ القاضی اردو اکیڈمی اینڈ کوچنگ ٹرسٹ مستقبل کے لیے ایک تابندہ ستارہ ہے زبان و ادب کا ایسا درخت ہے جس کی شاخوں پر اردو زبان کے پھول مہکتے رہیں گے۔ تقریب کے آخر میں سماجی سوشل ورکر ایڈوکیٹ شاہ جبین قاضی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 21 جولائی 2026

غالب اکیڈمی میں ماہانہ نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ماہانہ شعری نشست کا اہتمام 13 جولائی کو کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر گلشن رائے کنول نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ خسرو پیدا نہیں ہوگا، گلزار دہلوی زندہ ہوتے تو سو سال کے ہوتے۔ غالب نے ہر موضوع پر شعر کہا ہے۔ ذوق، انشا، مومن، دبیر نے جو شعر کہے ہیں ان کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ جگر مراد آبادی جیسا غزل گو شاعر اب پیدا نہیں ہوگا۔ شاعری نغمگی کا ٹکڑا ہے۔ خاموش گفتگو ہے۔ آج کی شاعری کو سماج کا آئینہ ہونا چاہیے۔ آج کے مسائل کا اس میں عکس ملنا چاہیے۔ شاعری زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اس موقعے پر شہلا احمد، کیلاش سمیر وششٹھ دہلوی، رچنا نرمل، سورج پال سنگھ ادنیٰ، امثل فواز، عارف دہلوی، یامین منظر، محبوب عالم وارثی، نعیم ہندوستانی، سدھارتھ آغا، نیلم باورامن، سریندر سفر، گولڈی غضب، سنتوش سمپرتی، شاداں احسن، ترون جین نے اشعار پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 14 جولائی 2026

دوہا لکھنے والے شعرا کے مسابقے کا اہتمام

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں شاعری کی صنف دوہا لکھنے والے شعرا کے مسابقے کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ حضرت امیر خسرو اردو اور ہندی کے پہلے شاعر ہیں۔ انھوں نے دوہے، پہیلیاں، انمل جیسی عوامی دلچسپی کی اصناف میں شاعری کی ہے۔ آج دوہے، پہیلیاں اور انمل جیسی اصناف میں کم لکھا جارہا ہے۔ مسابقے میں 16 شعرا نے اپنے دوہے پیش کیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ہندی کے مشہور شاعر اور صحافی ڈاکٹر منوج ابودھ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ دوہے میں 1311 کا اور قافیے کا التزام ہی کافی نہیں ہے۔ دوہا گاگر میں ساگر بھرنے کی صنف ہے۔ ایک دوہا طویل تصنیف پر بھاری ہوسکتا ہے۔ اس میں تبدیلی اور توسیع کی بڑی گنجائش ہے۔ اردو کے مشہور شاعر شاہد انور نے کہا کہ دوہا ماتراؤں اور قافیہ پیمائی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مصرعے میں منفی بات کہہ کر دوسرے مصرعے میں اسے مثبت بنا کر پیش کرنے کا عمل ہے۔ اس موقعے پر شعرا کا انتخاب اور مشاعرہ کی ناظم ڈاکٹر سنتوش سمپرتی نے کہا کہ ہندی میں دوہا لکھنے کا چلن بہت زیادہ ہے، اس کی اطلاع فیس بک پر دی گئی تو بہت سے شعرا نے دوہا پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان میں سے 16 شاعروں کا انتخاب کر کے مشاعرے میں دوہا پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ یہ ہندی اردو زبان میں ایک شاندار ابتدا ہے۔ دوہے کا الگ کوی سمیلن مشاعرہ نہیں ہوتا۔ غالب اکیڈمی نے وزیر ثقافت حکومت ہند کے تعاون سے بہت مبارک قدم اٹھایا ہے جس کی بڑی پذیرائی ہورہی ہے۔ ہندی کی شاعرہ سریتا گپتا اور اردو کے شاعر شاہد انور نے تین شعرا کا انتخاب کیا جن میں اول کو 1500 روپے، دوم کو 1400 روپے اور سوم کو 1300 روپے کا انعام دینے کا اعلان بھی کیا۔ شعرا میں سنگیتا ورما، سریش مہرا (راج)، پنیتا سنگھ، پرتیوش گوتم، سریکھا ساہو، وندنا چودھری، رجنی بالا (سہج)، دیوورت شرما (این)، گستاخ ہندستانی، جینندر جیت، گولڈی غضب اور آرتی جھا آدیہ قابل ذکر ہیں۔ آخر میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 4 اگست 2026

اتر پردیش

جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی

میرٹھ: خاندانی طور سے جگن ناتھ آزاد کو اقبال سے جو انسیت تھی وہ ان کے کلام کی تاثیر کی وجہ سے تھی۔ علامہ اقبال کا پورا کلام تلوک چند محروم کے بیٹے جگن ناتھ آزاد کو ازبر تھا۔ جگن ناتھ آزاد کی اقبال پر بارہ یا تیرہ کتابیں ہیں مگر جگن ناتھ آزاد کی تین یا چار کتابیں بڑے پائے کی ہیں۔ یہ الفاظ تھے بین الاقوامی شہرت یافتہ ناقد



ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی' موضوع پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر قدوس جاوید (سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے آنلائن شرکت فرمائی۔ مقرر خاص کے بطور بین الاقوامی شہرت یافتہ ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے شرکت فرمائی جب کہ مقالہ نگار کے بطور جموں سے عرفان عارف نے شرکت کی۔ لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی پروگرام میں موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض فرحت اختر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اردو شعر و ادب کا وہ مرد مجاہد ہے جسے ہم شاعر، ادیب اور ناقد کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اقبالیات سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا بلکہ اقبال شناسی آپ کی شناخت بن چکی ہے۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جگن ناتھ آزاد نے مغربی ادبا کا موازنہ اقبال سے کیا، ساتھ ہی اقبال شناسی پر آپ کا اہم کارنامہ ہے۔ اردو اور انگریزی میں آپ کی کئی کتابیں بڑی اہم ہیں۔ اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے والوں میں جگن ناتھ آزاد کا بڑا ہاتھ ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 25 جولائی 2026

دیا نرائن نگم اور زمانہ

میرٹھ: رسالہ 'زمانہ' بریلی سے نکلنا شروع ہوا اور کانپور بعد میں آیا۔ اس زمانے میں کانپور میں 13 پریس تھیں جو دیگر شہروں کے مقابلے میں زیادہ تھیں۔ اس زمانے میں ایک مسجد کے تہہ خانے میں ان کی پریس تھی۔ اس وقت کانپور سے 54 رسائل و اخبارات نکلتے تھے۔



کانپور میں کچھ ایسی آسانیاں میسر تھیں جن کی بنا پر یہاں سے بہ آسانی اخبارات و رسائل نکالے جاسکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں رسالہ 'زمانہ' ایک بڑا رسالہ تھا جس میں سماج کے تمام موضوعات پر مضامین ہوتے تھے۔ اس رسالے کو شائع کرانے میں رائے بہادر کافی مدد کرتے تھے۔ یہ الفاظ تھے حلیم پی جی کالج، کانپور کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر خان فاروق کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'دیانرائن نگم اور زمانہ' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور ڈاکٹر خان فاروق صدر شعبۂ اردو، حلیم پی جی کالج، کانپور نے آنلائن شرکت کی۔ مہمانانِ ذی وقار کے بطور ایجوکیشن اویرنس کمیٹی، لکھنؤ کے بانی، ڈاکٹر مسیح الدین اور ڈاکٹر حنا افشاں (دیانند گرلز پی جی کالج، کانپور) پروگرام میں شریک رہے۔ مقالہ نگار کے بطور علی گڑھ کے معروف شاعر ڈاکٹر مجیب شہزر نے شرکت فرمائی۔ پروگرام میں ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر اویس جمال شمسی نے ادا کیے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دیانرائن نگم نے رسالہ 'زمانہ' کے معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ادبی رسالہ نکالنا اس زمانے میں بڑی ٹیڑھی لکیر تھی۔ اس زمانے کے بڑے لکھنے والے اقبال، پریم چند، عبدالماجد دریابادی وغیرہ عمدہ تخلیقات پیش کررہے تھے اور ان کی یہ تمام تخلیقات 'زمانہ' میں شائع ہورہی تھیں۔ ڈاکٹر حنا افشاں نے کہا کہ یہ ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ ہم ادیب، صحافی اور اعلیٰ شخصیت کے مالک دیانرائن نگم کی خدمات پر پروگرام کررہے ہیں۔ دیانرائن نگم نے اپنے نقش پا خود بنائے، ادب پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ پریم چند کو منشی پریم چند بنانے والے دیانرائن نگم ہی تھے۔ ڈاکٹر مسیح الدین نے کہا کہ 60 سال کی عمر میں دیانرائن نگم صاحب کا انتقال ہوگیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 10 جولائی 2026

خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں گیارہواں جلسۂ تقسیم اسناد

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے گیارہویں جلسۂ تقسیم اسناد میں اتر پردیش کی گورنر اور یونیورسٹی چانسلر آنندی بین پٹیل نے کہا ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد صرف ڈگری حاصل کرنا نہیں بلکہ ایسے ذمہ دار، باکردار، احساس اور بااخلاق شہری تیار کرنا ہے جو معاشرے، ملک اور انسانیت کی خدمت میں موثر کردار ادا کریں۔ انھوں نے کہا کہ ترقی یافتہ بھارت 2047@ کے عزم کی تکمیل میں نوجوانوں کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے اور اس کے لیے علم، جدت، اخلاقی اقدار، ہندوستانی تہذیب وثقافت اور سماجی ذمہ داری کا امتزاج ناگزیر ہے۔ وہ یونیورسٹی کے گیارہویں تقریب جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کررہی تھیں۔ اس موقعے پر راجیہ سبھا کے رکن پارلیمنٹ اور معروف مفکر ڈاکٹر سدھانشو ترویدی مہمان خصوصی جب کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تعلیم یوگیندر اپادھیائے مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے موجود تھے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے سالانہ ترقیاتی رپورٹ پیش کرتے ہوئے جامعہ کی تعلیمی، تحقیقی، اختراعی اور بنیادی ڈھانچے سے متعلق نمایاں کامیابیوں پر روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی خطاب میں گورنر آنندی بین پٹیل نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے موثر نفاذ، ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم و تدریس، ہنرمندی، اسٹارٹ اَپ، اختراع، تحقیق، خواتین کو بااختیار بنانے، صحت سے متعلق بیداری اور سماجی خدمات کے میدان میں یونیورسٹی کی کوششوں کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ میں سنسکرت، پالی، ہندی، اردو، فارسی اور انگریزی کے ساتھ جرمن، جاپانی، چینی، فرانسیسی اور اودھی زبان کی تدریس اس کی منفرد شناخت ہے۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سدھانشو ترویدی نے کہا کہ تعلیم کا مقصد صرف روزگار حاصل کرنا نہیں بلکہ علم، ارادے اور عمل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرکے ایک مثالی شخصیت کی تعمیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھارت دنیا کا سب سے نوجوان ملک ہے اور یہی نوجوان طاقت ترقی یافتہ بھارت کی مضبوط بنیاد ہے۔ یوگیندر اپادھیائے نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی کے مطابق اقدار پر مبنی، معیاری اور روزگار سے ہم آہنگ تعلیم ہی ترقی یافتہ بھارت کی بنیاد ہے۔ انھوں نے زبانی تعلیم، تحقیق، اختراع، ہنرمندی، سماجی ذمہ داری اور عالمی روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یونیورسٹی کی کوششوں کی ستائش کی۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ تعلیمی سال 26-2025 کے امتحانات میں شریک 1270 طلبہ میں سے 1236 کامیاب ہوئے جب کہ گیارہویں کانووکیشن میں 125 نمایاں طلبہ کو تمغے دیے گئے جن میں 54 طلائی تمغے شامل ہیں۔ آخر میں وائس چانسلر نے جامعہ کے آئندہ منصوبوں سے بھی آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں نئی زبانی تجربہ گاہوں کا قیام، بنیادی ڈھانچے کی توسیع، کھیلوں کی سہولیات میں اضافہ، تحقیق اور پیٹنٹ کی حوصلہ افزائی، جدید لیبارٹریوں کی اب گریڈیشن، پائیدار توانائی، صنعت و جامعہ اشتراک اور قومی و بین الاقوامی تعلیمی تعاون کو مزید مضبوط بنایا جائے گا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر نیرج شکلا نے انجام دی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 9 جولائی 2026

ادبی تقریب

لکھنؤ: رنج وغم کی کیفیت ایک فطری اور شدید انسانی ردعمل ہے۔ اس کیفیت کو حساس دل انسان شدید اداسی، ذہنی کشمکش، تناؤ اور دلی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ لکھنؤ کے حساس دل شعرا نے 'رنج وغم' کو بطور ردیف برتا، تو رنج و غم کی تاریخی حقیقت بشکل اشعار سامنے آئی، خوب خوب اشعار سننے میں آئے۔ موقع تھا 'مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے ماہانہ مشاعرے کا، جو ہمیشہ کی طرح سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خاں میں ہوا۔ نظامت رضوان احمد فاروقی نے کی۔ بحیثیت صدر ممتاز صحافی و افسانہ نگار احمد ابراہیم علوی نے شرکت فرمائی اور اپنے پرجوش خطاب میں کہا کہ نوجوان شاعری کے ذریعے اردو میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اچھے اشعار کہہ رہے ہیں۔ انھیں دوسری زبانوں کے مطالعے کے ساتھ دنیا کے حالات کا بغور مشاہدہ کرنا چاہیے۔ بطور سرپرست محمد فاروق جاذب لکھنوی شریک مشاعرہ رہے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے مرزا شارق لاہرپوری اور محسن

قدوائی نے شرکت کی اور مہمان اعزازی کے طور پر نجمی لکھنوی مشاعرے کا حصہ رہے۔ جسٹس آنند نرائن کے استاد لکشمی نرائن رونق لکھنوی کے شعری مجموعے کا رسم اجرا بدست احمد ابراہیم علوی ہوا۔ واضح رہے کتاب کے مرتب بزرگ شاعر نجمی لکھنوی ہیں جنھیں سبھی نے مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر منصور حسن خاں نے ان کے جذبے کو سراہا۔ رضوان احمد فاروقی نے کہا 99 برس عمر پانے والے تعلیم یافتہ شاعر کا شعری اثاثہ شائع کرنے والا شخص بجا طور پر لائق تحسین وستائش ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لکشمی نرائن رونق لکھنوی جیسے بے لوث خادمین ادب پر تحقیقی مقالات لکھے جانے چاہئیں۔ اس کے بعد مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 جولائی 2026

ماریشس میں اردو

میرٹھ: ماریشس کا اگر میں نے کوئی عاشق دیکھا ہے تو وہ طاہر پرویز ہیں۔ عیدن صاحب کے علاوہ یوپی، اعظم گڑھ کے لوگوں نے ماریشس میں اردو ادب کو فروغ دینے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز اگر بنا ہے تو وہ ماریشس ہے۔ ماریشس ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہندی اور اردو الگ نہیں ہے۔ وہاں پر ہندی اور اردو کے اساتذہ مل کر کام کر رہے ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم، علی گڑھ کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'ماریشس میں اردو ادب' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف و ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کے بطور ڈاکٹر آصف علی عادل علی محمد (سابق صدر شعبۂ اردو مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشس) اور مہمان اعزازی کے بطور ڈاکٹر سکینہ بہادر (صدر شعبۂ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشس) نے آن لائن شرکت فرمائی۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان، لیکچرر، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشس اور ڈاکٹر مہرین قادر حسین، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشس کی لیکچرار شریک ہوئیں۔ مقررین کے بطور معروف ناقد پروفیسر انور پاشا، (دہلی)، پروفیسر محمد کاظم، (دہلی)، معروف داستان گو جاوید دانش (کناڈا) اور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات فرحت اختر، نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم ایم اے اردو کی طالبہ مہوش نے ادا کیے۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اس پروگرام کو کئی ملکوں میں دیکھا جا رہا ہے۔ آج کے پروگرام میں پڑھے گئے مقالوں کو مہتاب قدر (سعودی عرب) اپنے شماروں میں پیش کریں گے۔ آج کے موضوع میں ہم جانیں گے کہ ماریشس میں اردو کیسے شروع ہوئی۔ وہاں داستان کب سے آئی، افسانہ کب شروع ہوا اور ناول کیسے اور کب سے تحریر کیے جا رہے ہیں۔ معروف داستان گو جاوید دانش نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ان کی جو تڑپ تھی وہ واقعی تعریف کے قابل ہے۔ داستان کے حوالے سے وہاں کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ وہاں تلفظ کا بڑا مسئلہ ہے مگر ان بچوں سے ہمیں حوصلہ بھی ملا اور وہاں کے بچوں نے مل کر ایک ہفتے میں ڈرامہ بھی تیار کر لیا اور وہ ڈرامہ اسٹیج بھی ہوا۔ وہ ڈرامہ اتنا پسند کیا گیا کہ وہاں کے ٹی وی پر وہ نشر بھی ہوا۔ ماریشس میں تلفظ پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ مجھے دو بار ماریشس جانے کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں پر جب ڈرامے کی زمین تیار ہوئی تو ہم نے ڈرامے کی ابتدا کے حوالے سے کام کیا۔ وہاں اردو زبان ہر اسکول میں پڑھائی جاتی ہے اور اب پی ایچ ڈی تک کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 جولائی 2026

'مہاجنی سبھیتا اور پریم چند'

پریاگ راج: منشی پریم چند کی 146 ویں سالگرہ کے موقعے پر انجمن ترقی پسند مصنّفین، الہ آباد شاخ کی جانب سے اردو گھر میں 'مہاجنی سبھیتا اور پریم چند' کے عنوان سے ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت بنارس سے آئے ہندی کے معروف ادیب و ناقد پروفیسر گیا سنگھ نے کی اور نظامت ایشور سرن ڈگری کالج، الہ آباد میں شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر امرجیت رام نے کی۔ نشست میں ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے بطور مہمانِ خصوصی اور ہندی کہانی کار پروفیسر انیتا گو پیش نے بطورِ مہمانِ اعزازی شرکت کی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ تمام طرح کی سیاست اور مصلحت سے بالاتر ہو کر زبان و ادب کے بنیادی اور سنجیدہ موضوع پر گفتگو کی جا رہی ہے اور کی جانی چاہیے۔ آج اس کی بڑی ضرورت ہے۔ ان موضوعات اور مسائل پر ارباب فکر و نظر نے پہلے بھی غور کیا تھا، مختلف عنوانات کے حوالے سے خود ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ادب اور زندگی، ادب اور سماج، ادب و تہذیب کے بارے میں خوب خوب سوچا گیا، لکھا گیا۔ اس حد تک کہ اس پر ردعمل بھی ہوا۔ پروفیسر انیتا گو پیش نے کہا کہ پریم چند ہماری رگوں میں لہو بن کر دوڑتے ہیں۔ پریم چند نے جس مہاجنی سبھیتا کے خلاف اپنی فکشن رائٹنگ میں باقاعدہ ایک تحریک چلائی وہ آج بھی ریلیونٹ ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین، اتر پردیش کے جنرل سکریٹری سنجے سریواستوا نے کہا کہ پریم چند نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے جن آدرشوں کو پیش کیا ہمیں آج بھی ان کی ضرورت ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین، الہ آباد شاخ کے صدر سریندر کمار راہی نے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنی تحریروں میں مہاجنی سبھیتا پر گہری چوٹ کی ہے۔ ان کی کہانیوں میں اس کے جا بجا نشانات ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنند کمار مالویہ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ مہمانوں کا استقبال پرکرش مالویہ نے کیا اور شکریہ کی رسم سنیل کمار نے ادا کی۔ دیگر شرکا میں رشمی مالیہ، سدھا نشو مالویہ، شاہد علی شاہد، محمد خالد، ڈاکٹر حسین جیلانی، ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم اور محی الدین کے نام اہم ہیں۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 4 اگست 2024

پریم چند: فکر و فن کے آئینے میں

میرٹھ: پریم چند پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ پریم چند سیاسی، معاشی مسائل پر لکھتے ہیں اور ترقی پسند افسانے لکھتے ہیں۔ پریم چند نے عربی اور فارسی بھی پڑھی تھی مگر اپنے سادہ انداز



بیان سے انھوں نے استعاروں کو استعمال کیا۔ ان کی کہانیاں 'دوبیل' اور 'روشنی' وغیرہ میں سیاسی اور سماجی مسائل ملتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب اور سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے پروفیسر طارق چھتاری کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'پریم چند: فکر و فن کے آئینے میں' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب اور سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ پروفیسر طارق چھتاری نے انجام دیے۔ خصوصی مقرر کے بطور سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم نے شرکت فرمائی۔ لکھنؤ ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی پروگرام میں موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات محمد زبیر، نظامت کے فرائض سیدہ مریم الٰہی اور شکریہ کی رسم لمرانے ادا کی۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند اپنے زمانے میں بھی بڑے تھے اور آج بھی بڑے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے بہت سے پہلو جو پہلے عیاں نہیں تھے وہ اب عیاں ہو رہے ہیں۔ پریم چند نے اردو فکشن کو گاؤں گاؤں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ پریم چند اردو، ہندی دونوں کے مشترکہ قلمکار ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ پریم چند نے جس عہد میں آنکھ کھولی اس کو اگر فکر کے اعتبار سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ آپ اپنے بزرگوں کی کاوشوں سے بہت متاثر تھے۔ جذبۂ حب الوطنی، جاں نثاری کی لہریں ان کے فن پاروں میں موجود ہیں۔ وہ کرداروں کی کشمکش اور گفتار سے خوبصورت ماحول بناتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے طرزِ تحریر میں اردو و فارسی کے ساتھ ساتھ دیہاتی زبان کو استعمال کیا۔ انھوں نے فارسی کے ساتھ ہندی کے ان الفاظ کا استعمال کیا جو عوام کے لیے نامانوس نہیں تھے۔ انھوں نے بیانیہ کو پراثر بنانے کے لیے بیانیہ پر خوب زور دیا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 31 جولائی 2026

اترا کھنڈ

امیر خسرو، اردو اور ہندی کے پہلے شاعر

دھرادون: حکومت ہند کی وزارت ثقافت کے تعاون



سے 19 جولائی کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں 'امیر خسرو، اردو اور ہندی کے پہلے شاعر' پر ایک علمی اور ادبی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ملک بھر سے ممتاز ادبی شخصیات، اسکالرز، محققین اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت معروف ادبی شخصیت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی جب کہ ڈاکٹر ایس فاروق، صدر تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی معروف ماہر تعلیم نے بطور مہمان خصوصی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر جے پی شرما اور پروفیسر اختر الواسع نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے، جس میں اردو، ہندی، فارسی، اور ہندوستان کے بھرپور ثقافتی اور ادبی ورثے کی ترقی میں حضرت امیر خسرو کی منفرد شراکت پر روشنی ڈالی گئی۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر ایس فاروق نے کہا کہ حضرت امیر خسرو ہندوستان کی گنگا جمنی ثقافت، قومی اتحاد اور لسانی ہم آہنگی کی علامت ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کی نوجوان نسل کو خسرو کے افکار، شاعری اور ثقافتی ورثے سے متعارف کرانا وقت کی ضرورت ہے کیونکہ ان کی تعلیمات آج بھی محبت، رواداری اور قومی یکجہتی کی اقدار کو ابھارتی ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر مقررین نے امیر خسرو کی ادبی اور ثقافتی خدمات کو عوام تک پہنچانے اور ان کی وراثت کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے اس طرح کی تعلیمی اور ادبی تقریبات کا انعقاد جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ سامعین نے لیکچر کی تعریف کرتے ہوئے اسے انتہائی معلوماتی، فکر انگیز اور فکری طور پر افزودہ قرار دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 جولائی 2020

بہار

پریم چند کے یوم پیدائش پر پروگرام

بودھ، گیا: منشی پریم چند نے اپنے افسانوں اور



ناولوں کے ذریعے ہندوستانی سماج کے مسائل، دیہی زندگی، معاشرتی ناانصافی، طبقاتی کشمکش، انسانی اقدار اور اخلاقی شعور کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا۔ ان کی تحریریں آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ہمارے لیے رہنمائی کا اہم ذریعہ ہیں۔ یہ باتیں مگدھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شاہد رضوی نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کے افکار موجودہ دور میں بھی اسی قدر اہم ہیں جتنے ان کے عہد میں تھے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عبدالحی نے پریم چند کے افسانوں کی روشنی میں ان کی حب الوطنی اور جذبہ ایثار پر اظہار خیال کیا اور اس بات پر زور دیا کہ پریم چند کا ادب صرف ادبی سرمایہ نہیں بلکہ سماجی شعور، قومی یکجہتی، انسانی ہمدردی اور انصاف پسندی کا موثر پیغام بھی ہے۔ شعبہ کی استاد ڈاکٹر ترنم جہاں نے کہا کہ پریم چند کی تخلیقات ہمیں معاشرے میں مثالی شہری بننے کا پیغام دیتی ہیں۔ ایک اچھا سماج محبت و اخوت کی بنیاد پر ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سمی اقبال نے پریم چند کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب پر گفتگو کی اور کہا کہ آج ہمیں تمام بھید بھاؤ سے اوپر اٹھ کر سماج میں اتحاد و اتفاق کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ضیاء اللہ نے طلبا کو پریم چند کی تخلیقات پڑھنے پر زور دیا اور کہا کہ پریم چند ہر عہد کے لیے رول ماڈل ہیں اور ان کی تخلیقات کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس موقع پر ڈاکٹر شکیلہ نگار نے اپنے پرمغز خطاب میں کہا کہ پریم چند ایک عظیم افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ہی ایک عظیم انسان بھی تھے۔ اس ادبی پروگرام کے دوران ڈاکٹر شکیلہ نگار اور ڈاکٹر سمی اقبال کے زیر نگرانی شعبہ اردو کے طلبا کا تیار کردہ دیواری پرچہ (وال میگزین) کاوش کے پانچویں شمارے کا اجرا بھی کیا گیا جو پریم چند کی حیات و خدمات پر مبنی ہے۔ 'کاوش' کے تازہ شمارے میں مختلف موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ایم اے سمسٹر تھرڈ کے طلبا نور افشاں، لئیقہ فاطمہ، نرگس پروین، رخسانہ پروین، شائنہ پروین، شائقہ ناز، کنیز فاطمہ، نرگس خاتون، زیبا پروین، شگفتہ پروین، مسکان پروین وغیرہ نے وال میگزین کے لیے مضامین لکھے ہیں۔ اس پروگرام میں طلبا نے بھی پریم چند کے حوالے سے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس پروگرام کی نظامت شعبہ اردو کی ریسرچ اسکالر نازش ہاشمی نے کی۔

ڈکٹر شکیلہ نگار نے کاوش کے پانچویں شمارے کی کامیابی پر طلبا کو مبارکباد پیش کی۔ اس پروگرام میں شعبے کے تمام اساتذہ ریسرچ اسکالر اور طلبا موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 جولائی 2026

پریم چند پر ادبی سمینار

بھار شریف: ہیڈکوارٹر بہار شریف شہر کے مشہور و مقبول تعلیمی ادارہ نالندہ کالج میں 30 جولائی کے دن عظیم کہانی کار اور ناول نگار منشی پریم چند کی یوم پیدائش



کی مناسبت سے کالج کے آڈیٹوریم میں ایک ادبی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کالج کی پرنسپل پروفیسر (ڈاکٹر) سنیتا سنہا نے کی۔ اس موقع پر پرنسپل پروفیسر سنیتا سنہا نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کا ادب ہندوستانی سماج کا زندہ آئینہ ہے۔ اس نے انھیں پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کا مطالعہ کرنے اور ان کے نظریات کو اپنی زندگی میں اپنانے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کا ادب جدید دور میں بھی متعلقہ ہے۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں میں موجود سماجی پیغامات آج بھی معاشرے کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ کلیدی مقرر اور سنسکرت ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ڈاکٹر ششی بھوشن بھٹ نے کہا کہ پریم چند نے اپنے ادب کے ذریعے مروجہ سماجی برائیوں، کسانوں کے مسائل، استحصال زدہ طبقے کے مصائب اور انسانی حساسیت کو موثر انداز میں پیش کیا۔ ان کا ادب سماجی حقیقت اور انسانی اقدار کی شاندار ترکیب کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مرتیونجے کمار، ڈاکٹر وجے کمار، ڈاکٹر سنتوش کمار، ڈاکٹر سنجیت اور ڈاکٹر راج دیو کمار نے بھی سمینار سے خطاب کیا اور پریم چند کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروگرام کے دوران طلبا نے پریم چند کی مشہور کہانیوں سے منتخب اقتباسات سنائے، جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور سماجی نقطۂ نظر کو واضح طور پر ظاہر کرتے تھے۔ آخر میں پریم چند کی ادبی خدمات کو نئی نسل تک پہنچانے کا عہد کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اگست 2026

پریم چند پر ادبی سمپوزیم

بھار شریف: نالندہ ضلع کے مشہور تعلیمی ادارہ نالندہ مہیلا کالج میں 31 اگست کے روز اردو اور ہندی ادب



کے عظیم کہانی کار منشی پریم چند کا یوم پیدائش شعبہ اردو کے زیر اہتمام انتہائی پروقار اور ادبی ماحول میں منایا گیا۔ اس موقعے پر منعقدہ سمپوزیم میں اساتذہ، طلبا اور ادب سے محبت کرنے والوں نے پریم چند کی شخصیت اور ان کے کاموں پر تفصیلی گفتگو کی اور ان کی ادبی خدمات کو یاد کیا۔ پروگرام کا افتتاح کالج کے پرنسپل پروفیسر (ڈاکٹر) جتیندر رجک اور فیکلٹی نے اجتماعی طور پر شمع روشن کر کیا۔ سمپوزیم سے خطاب کرتے ہوئے پرنسپل پروفیسر (ڈاکٹر) جتیندر رجک نے کہا کہ منشی پریم چند ہندی اور اردو ادب کے عظیم کہانی کار ہیں، جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کی صحیح تصویر پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کا ادب آج بھی اتنا ہی متعلق ہے جتنا کہ ان کے زمانے میں تھا۔ انھوں نے طلبا پر زور دیا کہ وہ ادب کے مطالعہ میں دلچسپی پیدا کریں اور ایسے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر آسیہ پروین نے منشی پریم چند کی زندگی، ادبی سفر اور ان کے لازوال کاموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کے محروم، استحصال زدہ اور مظلوم طبقوں کی آواز کو بلند کیا۔ ان کے ناول اور کہانیاں ہندوستانی سماج کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ پروگرام میں ناگمنی کمار نے پریم چند کی مشہور کہانی 'نمک کا داروغہ' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہانی ایمانداری، لگن اور اخلاقی اقدار کی فتح کا پیغام دیتی ہے۔ ڈاکٹر راکیش کمار رنجن نے موضوعات، سماجی سیاق و سباق اور پریم چند کے مقبول ناولوں 'گودان'، 'نرملا' اور 'غبن' کے وسیع اثرات پر روشنی ڈالی۔

سمینار میں طلبا و طالبات نے بھی جوش و خروش سے شرکت کی۔ صالحہ خاتون نے 'پریم چند کی کہانی تحریر'، شمع فاطمہ نے 'ناول نرملا کا معائنہ' پیش کیا۔ عطیہ پروین نے کہانی 'شکوہ شکایت'، سبرین پروین نے 'پریم چند کی کہانی لکھنا' اور رشو کماری نے 'پریم چند کی سوانح نگاری' پیش کی۔ طلبا کی پریزنٹیشنز کو فیکلٹی اور مہمانوں نے بے حد سراہا۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر رینو کماری نے تمام شرکا، اساتذہ اور طلبا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اگست 2026

مختصر کہانی فیسٹیول کا انعقاد

بھار شریف: سمائیک پرویش کے زیر اہتمام گیارہویں آدی شکتی پریم ناتھ کھنہ فیسٹیول کے دوسرے دن پٹنہ



میوزیم میں ایک مختصر کہانی فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا۔ سینئر مختصر افسانہ نگار ڈاکٹر بھگوتی پرساد دویدی کی صدارت میں تین درجن سے زیادہ مختصر کہانی لکھنے والوں نے اپنی تخلیقات پڑھیں۔ تقریب میں ادب سے محبت کرنے والوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس تقریب کے دوران مصنفہ ممتا مہروترا کے ذریعہ ایڈٹ کردہ مختصر کہانیوں کا مجموعہ 'شبد ستیو' بھی ریلیز کیا گیا۔ مہمان خصوصی، سینئر مصنف اور 'نئی دھارا' کے ایڈیٹر پروفیسر شیونارائن نے کہا کہ پٹنہ ایک بار پھر ملک میں مختصر کہانی کی سرگرمیوں کے ایک اہم مرکز کے طور پر ابھر رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہاں بچوں اور خواتین کی بڑی تعداد مختصر کہانی لکھنے سے وابستہ ہو رہی ہے جو کہ انتہائی خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے۔ مہمان خصوصی، بہار میوزیم کے ایڈیشنل ڈائرکٹر اشوک کمار سنہا نے کہا کہ پٹنہ میں مختصر کہانیوں کے میدان میں ستیش راج پشکرنا کی جانب سے کی گئی سرشار کوششوں کے مثبت نتائج اب واضح طور پر نظر آ رہے ہیں۔ آل انڈیا پروگریسو شارٹ اسٹوری فورم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر دھرو کمار نے ممتا مہروترا کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مدون کتاب 'شبد ستیو' اس سمت میں ایک اہم شراکت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ممتا مہروترا دیگر ادبی اصناف کے ساتھ مختصر کہانیاں لکھنے میں پوری لگن اور ایمانداری کے

ساتھ سرگرم ہیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر بھگوتی پرساد دویدی نے مختصر کہانی لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم فراہم کرنے کے لیے سمائک پرویش اور آل انڈیا پروگریسو شارٹ اسٹوری فورم جیسی تنظیموں کی تعریف کی۔ روپک سنہا اور سنیل جھا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ریچا ورما، پونم کٹاریار، ویبھا رانی سریواستو، منی مشرا، پونم دیوا، انیل رشمی، ڈاکٹر آشا کماری، مدھو دیویا، آلوک چوپڑا، نوتن سنہا، آشا رگھو دیو، احمد رضا ہاشمی، تنوجا سنگھ، شروتکرتی، ریکا کمار، پریا کمار سمیت کئی مصنّفین مثلاً چودھری رجنی پربھاور بندیشور پرساد گپتا نے اپنی مختصر کہانیاں سنائیں اور سامعین سے داد وصول کی۔ اس کے علاوہ سمراٹ سمیر کی قیادت میں کلکاری سے وابستہ تقریباً ایک درجن بچوں کی مختصر کہانی لکھنے والوں نے بھی اپنی پیشکشوں سے سامعین کے دل موہ لیے۔ دیگر بچوں کے لیے مصنّفین، بشمول انوراگ، اتل رائے، خوشی کماری، سمن کمار، ثریا کماری، اکریتی راج، پیہو کماری، امیتیش راج، رنجنا کماری، ویشنوی کماری، آدتیہ گھوش، ستیم کمار، ویدانت سری، اپیکس راج، راجیہ وردھن سنگھ اور کشیش کماری نے بھی اپنی مختصر کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے اپنی مختصر کہانیوں کو متاثر کن پڑھا۔ سمائک پرویش کی صدر ممتا مہروترا نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سمراٹ سمیر نے اسٹیج کی نظامت کی جب کہ تقریب کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر دھروب کمار نے شکریہ کا کلمہ پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 26 جولائی 2026

تلنگانہ

مانو میں 'سیڈ' کا جلسہ تقسیم وظائف

حیدرآباد: طلبہ میں تعلیم کے شوق کے ساتھ ساتھ اکادمک ایمانداری اور ڈسپلن کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ان کے لیے یونیورسٹی کے قوانین وضوابط پر عمل کرنا لازمی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 17 جولائی کو کیا۔ وہ ڈین بہبودی طلبہ کی جانب سے سیڈ فاؤنڈیشن، امریکہ اور پبلک کیریئر ٹرسٹ، حیدرآباد کی میرٹ کم مینس اسکالرشپ کی تقسیم کے سلسلے میں منعقدہ جلسے سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم سبھی سیڈ امریکہ کے ذمہ داران خصوصاً سید مظہرالدین حسینی صاحب کے شکرگزار ہیں کہ وہ اسکالرشپ کے ذریعے اردو یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کو تعاون فراہم کررہے ہیں اور ہر سال اس کی تعداد میں اضاف ہورہا ہے۔ یہ تنظیم ہماری یونیورسٹی کے علاوہ دیگر ضرورت مندوں کی بھی مدد کرتی ہے۔ شیخ الجامعہ نے کہا کہ اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخلہ کے بعد طلبہ کو اختراعیت اور اپنی مہارت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ اس موقعے پر جناب سید مظہرالدین حسینی، ڈائرکٹر، سیڈ نے اپنی تنظیم کی کارگزاریوں کا تعارف کرایا اور بتایا کہ سیڈ یعنی سپورٹ فار ایجوکیشنل اینڈ اکانومک ڈیولپمنٹ ہندوستان میں تعلیمی وظائف کے علاوہ تربیتی مراکز وغریب اور مجبور خواتین کی مالی مدد بھی کرتی ہے۔ انھوں نے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ترقی کے لیے کچھ اقدار پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ محنت، سچائی، ایمانداری، خلوص، انکسار اور ڈسپلن بہت ضروری ہے۔ انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ اچھے انسان بنیں۔ والدین کا احترام کریں اور ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کریں۔ پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار نے اپنے خطاب میں اس اسکالرشپ کے آغاز کے سلسلے میں سابق ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر سید علیم اشرف جائسی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ سیڈ جس طرح مانو کے طلبہ کی مالی مدد کررہا ہے وہ قابل قدر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبہ کی تربیت اور ان کی صلاحیت سازی میں مانو کے کردار سے اس تنظیم کے ارباب اختیار مطمئن ہیں۔ انھوں نے ڈین بہبودی طلبہ پروفیسر صدیقی محمد محمود کی ستائش کی جن کی قیادت میں مانو کے اساتذہ اور اسٹاف اس کی تمام فارملیٹیز پوری کررہے ہیں۔ جناب عبدالمنان خان، ممبر بورڈ آف ڈائرکٹرز، سیڈ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سخت محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ ہمیں وقت کی ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو اپڈیٹ کرتے رہنا اور اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس پروگرام میں جوائنٹ ڈین بہبودی طلبہ، مانو پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی اور جناب قطب الدین سنجری کنٹری ہیڈ سیڈ فاؤنڈیشن بھی شہ نشین پر موجود تھے۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر اعلیٰ عہدیداران کے علاوہ ہیلپنگ ہینڈ کے ڈائرکٹر جناب احمد مجتبیٰ حسین، دیگر ذمہ داران اور بڑی تعداد میں طلبہ بھی موجود تھے۔ ناظم اجلاس ڈاکٹر جرار احمد، اسسٹنٹ ڈین بہبودی طلبہ نے پروگرام کے آغاز میں بتایا کہ اس برس 800 طلبہ کو اسکالرشپ دی جارہی ہے۔ پہلی قسط کے طور پر سیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے 25 لاکھ روپے جاری کیے جارہے ہیں۔



روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 18 جولائی 2026

اردو یونیورسٹی کا دورہ کریں

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ملک بھر کے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے عصری اعلیٰ تعلیم کے



حصول کا ایک اہم مرکز ہے۔ جہاں پر انتہائی کم فیس کے ساتھ روایتی اور پروفیشنل کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کیا۔ وہ آج 'اردو یونیورسٹی کا دورہ کریں' پروگرام کے افتتاحی اجلاس کو مخاطب کررہے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 'اردو یونیورسٹی کا دورہ کریں' پروگرام کا آغاز گذشتہ برس ہی کیا گیا تھا جس کا مقصد اردو یونیورسٹی میں دستیاب تعلیمی مواقع کے متعلق طلبہ کی اسکولی سطح ہی پر آگہی میں اضافہ کرنا ہے۔ آج کے 'اردو یونیورسٹی کا

دورہ کریں' پروگرام کی افتتاحی تقریب میں تین دینی مدارس دارالعلوم رحمانیہ، المعہد العالی والعربی اور عائشہ نسواں کے طلبا و طالبات کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ پروفیس عین الحسن کے مطابق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ملک بھر میں اردو زبان میں روایتی اور عصری تعلیم فراہم کرنے والی ایک اہم جامعہ ہے جس میں تقریباً 50 ہزار طلبا و طالبات زیرِتعلیم ہیں۔ اردو یونیورسٹی کا دورہ کریں، پروگرام کی افتتاحی تقریب کے آغاز میں اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، صدر مانو المنائی ایسوسی ایشن نے خیرمقدمی کلمات کہے اور وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن کے ان اقدامات کی ستائش کی جس کے ذریعے سے وائس چانسلر زیادہ سے زیادہ مقامی طلبہ کے داخلوں کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق پروفیسر سید عین الحسن مانو کے پہلے ایسے وائس چانسلر ہیں جنھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ شہر حیدرآباد میں قائم اردو یونیورسٹی میں شہر حیدرآباد کے طلبہ کو ان کا مستحق مقام دیا جانا چاہیے۔ پروفیسر سید نجم الحسن، کوآرڈینیٹر المنائی افیئرس نے بھی افتتاحی تقریب کو مخاطب کیا اور کہا کہ اردو یونیورسٹی اردو والوں کے لیے ایک نعمت غیرمترقبہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی میں روایتی کورسز کے ساتھ ساتھ سائنس اور دیگر مضامین میں بھی پروفیشنل تعلیم دی جاتی ہے اور یونیورسٹی کا فیس کا ڈھانچہ انتہائی کم ہے۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ علی سروری، ایسوسی ایٹ پروفیسر ایم سی جے نے بھی افتتاحی اجلاس کو مخاطب کیا اور کہا کہ اردو یونیورسٹی کا دورہ کریں۔ پروگرام کے تحت اس برس اسکولی طلبہ کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے طلبہ کو یونیورسٹی کا دورہ کروایا جائے گا تاکہ انھیں اسکول اور مدرسہ کے سطح پر ہی اردو یونیورسٹی میں دستیاب تعلیمی مواقع کے متعلق آگہی ہوسکے۔ انھوں نے دینی مدارس کے طلبہ کو مشورہ دیا کہ جو طلبہ بی اے یا ایم اے کے علاوہ سائنس یا لا وغیرہ کے کورسز کرنا چاہتے ہیں وہ ریاستی حکومت اوپن اسکولنگ یعنی TOSS سے اپنی دسویں اور بارہویں کے امتحانات کامیاب کریں۔ اس کے بعد وہ مانو کے کسی بھی تکنیکی یا پیشہ ورانہ کورس میں داخلہ لینے کے اہل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدوس، اسسٹنٹ رجسٹرار اور ناصر حسین شعیب، جنرل سکریٹری المنائی ایسوسی ایشن بھی شہ نشین پر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 16 جولائی 2026

اعزاز و اکرام

عالمی اردو ایوارڈ 2026

نئی دھلی: عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کی میٹنگ یہاں ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں حسب سابق امسال بھی 9 نومبر کو 'عالمی یوم اردو' کے موقعے پر اردو زبان کے مختلف اصناف اور شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی اہم شخصیات کو 'عالمی اردو ایوارڈ 2026' دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے بتایا کہ ایوارڈ کمیٹی نے امسال کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ڈاکٹر ادریس احمد کو دینے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ادریس احمد تقریباً چار دہائیوں سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ وہ فی الوقت غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے ڈائرکٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے مزید بتایا کہ صحافی جلال الدین اسلم، سہیل انجم اور جاوید اختر پر مشتمل ایوارڈ کمیٹی نے صحافت، شاعری، اردو ادب اور فارسی زبان و تحقیق نیز تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں چند دیگر شخصیات کو بھی عالمی یوم اردو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ جن دیگر شخصیات کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ان میں ڈاکٹر دبیر احمد، پروفیسر سید آل ظفر، رئیس وارثی ڈاکٹر چوبدار محمد شفیع عبدالستار اور ڈاکٹر خبیب احمد شامل ہیں۔

نمایاں خدمات کے لیے ایوارڈ کے لیے منتخب کیے گئے صحافیوں میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی، عبدالرشید، سعیدا حمد، ڈاکٹر ذکی طارق، منجیت بھاوڑیا مجید، عبدالعظیم مدنی جھنڈانگری اور ڈاکٹر محمد شمیم اختر شامل ہیں۔ اردو ادب کے دیگر اصناف میں نمایاں خدمات کے لیے بھی کئی شخصیات کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان میں شہاب انور، محمد احمد دانش، ڈاکٹر جاوید اختر، ڈاکٹر محمد مقیم، پروفیسر شمس الہدیٰ، ڈاکٹر ارشد حسن خان اور مولانا محمد شمشاد ندوی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جن دیگر شخصیات کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان میں ڈاکٹر شبانہ نظیر، محمد رفیع، ڈاکٹر سفیان انصاری، خان نوید الحق، راکیش کمار شرما کے نام شامل ہیں۔ امسال کا منشی نول کشور عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے نشر و اشاعت ہادی پبلی کیشنز کو دیا جائے گا۔

ڈاکٹر سید احمد خاں نے بتایا کہ یہ ایوارڈز نئی دہلی میں 9 نومبر کو ایک تقریب میں دیے جائیں گے۔

انھوں نے امید ظاہر کی کہ مذکورہ ایوارڈ یافتگان اردو کی ترویج و ترقی میں مزید معاون ہوں گے۔ عالمی یوم اردو کے موقعے پر حسب سابق یادگاری مجلّہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اس سال کا مجلّہ گورکھپور کی ایک عظیم علمی و ادبی شخصیت محمد حامد علی کی حیات و خدمات پر مشتمل ہوگا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 29 جولائی 2026

ایوارڈ تقریب

نئی دھلی: گذشتہ شب ادبی چوپال فاؤنڈیشن، دہلی کے زیراہتمام ایوانِ غالب، نئی دہلی میں تنظیم کے صدر و بانی خمار دہلوی کے یوم پیدائش پر ایک شاندار کل ہند مشاعرہ و ایوارڈ تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کو منعقد کرنے میں خمار دہلوی اور پنڈت پریم بریلوی، جنرل سکریٹری کا اہم کردار رہا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر سجاد سید نے کی۔ قاضی نجم الاسلام نجم اور احترام صدیقی مہمانانِ خصوصی کے طور پر جب کہ ایڈمرل خرم نور، چاند خان چاند اور قاضی ظاہر بجنوری اور ڈاکٹر طاہر خان نے مہمانِ مکرم کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض اسلم بیتاب نے انجام دیے۔ مشاعرے کا افتتاح مشترکہ ہاتھوں سے شمع روشن کرکے عمل میں آیا۔ مشاعرے سے قبل ملک کے مختلف شعرا کو اردو ادب کی نمایاں خدمات کے لیے ادبی چوپال فاؤنڈیشن 2026 ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا۔ ایوارڈ یافتگان میں استاد شمیم سردھنوی، او پی اگروال، سراج دہلوی، اعجاز انصاری، پیکر پانی پتی، معید رہبر لکھنوی، تابش رامپوری اور سلیم دریاپوری کے نام شامل ہیں۔ ایوارڈز خوبصورت شیلڈ اور توصیفی سرٹیفکیٹ پر مشتمل تھے۔ اس موقعے پر تمام شعرائے کرام کو شال کے ساتھ توصیفی اسناد بھی پیش کی گئی۔ ڈاکٹر سجاد سید نے اپنی صدارتی تقریر میں ادبی چوپال فاؤنڈیشن کی اس کاوش کو نہایت قابل ستائش قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام نئی نسل کو ادب سے جوڑنے اور شعر و ادب کی روایت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مشاعرے میں متعدد شعرا نے اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 7 جولائی 2026

دسویں سالانہ ایوارڈ تقریب

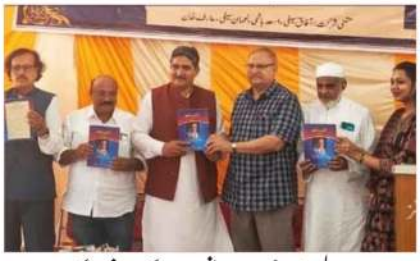
حیدرآباد: تلنگانہ کے وزیر اقلیتی بہبود اور سابق کرکٹر محمد اظہر الدین نے کہا ہے کہ صحافت ایک باوقار اور ذمہ دارانہ پیشہ ہے، جب کہ اردو صحافیوں کے مسائل کا حل ریاستی حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحافیوں کی تعمیری تنقید اور تجاویز کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے اور ان پر عمل کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ نام پلی میں واقع میڈیا اکیڈمی آڈیٹوریم میں تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹ فیڈریشن (ٹی یو ڈبلیو جے ایف) کی دسویں سالانہ ایوارڈ تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ محمد اظہر الدین نے فیڈریشن کے صدر ایم اے ماجد اور جنرل سکریٹری سید غوث محی الدین کی اردو صحافیوں کے لیے خدمات کو سراہتے ہوئے ایوارڈ حاصل کرنے والے صحافیوں کو مبارکباد پیش کی۔ فیڈریشن کے صدر ایم اے ماجد نے مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ تنظیم کا مقصد اردو صحافیوں کے مسائل کو حکومت تک پہنچانا اور ان کی ہر ممکن معاونت کرنا ہے۔ تقریب میں محمد اظہر الدین اور حکومت تلنگانہ کے مشیر محمد علی شبیر نے نوید بلال، حافظ ایم قیوم، امتیاز خان، افضل خان، اعجاز احمد خان، عبدالاحد صدیقی اور عائشہ بتول کو توصیفی اسناد، یادگاری شیلڈ اور 10,000 روپے کے چیک پیش کیے۔ یہ ایوارڈز مرحوم فیض محمد اصغر، مرحوم تبسم فریدی، مرحوم حبیب علی جیلانی اور مرحوم پروفیسر عبدالرحیم کی یاد میں دیے گئے۔ تقریب کی نظامت ساجدہ بیگم عرف ثنا نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 2 اگست 2026

رسم اجرا

انتساب عالمی

سرونج: انتساب پبلی کیشنز اور سد بھاؤنا منچ کے مشترکہ زیر اہتمام سیفی لائبریری سرونج میں سہ ماہی



'انتساب عالمی' کے خصوصی 'انجم بارہ بنکوی نمبر' کی رسم اجرا

کے ساتھ ایک باوقار ادبی نشست اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب رونمائی کی صدارت سابق آئی اے ایس افسر ایم ڈبلیو انصاری نے کی، جب کہ مرزا عظیم بیگ مہمانِ خصوصی تھے۔ تقریب کا آغاز سہ ماہی 'انتساب' کے مدیر سیفی سرونجی کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا، جب کہ کلیدی خطبہ معروف ادیب ڈاکٹر مہتاب عالم نے پیش کیا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے کہا کہ انجم بارہ بنکوی نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور استعاروں کو نہایت خوبصورتی سے برتا ہے۔ انجم بارہ بنکوی پر یہ پہلا باقاعدہ ادبی پروگرام تاریخی شہر سرونج میں منعقد ہو رہا ہے، جو اس شہر کی ادبی ترقی کا ثبوت ہے۔ صدارتی خطاب میں ایم ڈبلیو انصاری نے کہا کہ 'انتساب عالمی' کا یہ خصوصی شمارہ سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے۔ سرونج کو گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم قرار دیتے ہوئے سیفی سرونجی اور سد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال کو اس کامیاب ادبی کاوش پر مبارکباد پیش کی۔ اس موقع پر سیفی سرونجی نے خصوصی شمارے کی اشاعت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ انجم بارہ بنکوی کو صرف مشاعروں کا شاعر نہیں بلکہ ایک صاحب اسلوب اور سنجیدہ ادبی شاعر سمجھتے ہیں۔ وجے تیواری نے کہا کہ انجم بارہ بنکوی کی شاعری میں انفرادیت اور خواعتمادی نمایاں ہے، جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز بناتی ہے۔ تقریب سے حسام الدین فاروقی، قمر علی شاہ، جاوید نعمانی، نصرت علی، تسنیم راجہ، ظفر سرونجی، سید عروج احمد، اسعد ہاشمی، خان آشو اور فرحان خان سمیت متعدد اہل قلم نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے انجم بارہ بنکوی کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ رسم اجرا کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں شعرا نے اپنے عمدہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 29 جولائی 2026

رمادالاحلام

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آئیڈیا کمیونیکیشن کے زیر اہتمام قطر میں مقیم مشہور ہندوستانی شاعر 'عزیز نبیل' کے منتخب اردو اشعار کے عربی ترجمہ 'رمادالاحلام' کی ایک شاندار تقریب رسم اجرا عمل میں آئی۔ یہ ترجمہ دراصل پروفیسر حبیب اللہ خان کی نگرانی اور ذاتی دلچسپی اور محنت کے نتیجے میں ان کے دو شاگردوں ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد عمیر کے ترجمے سے شائع ہوا ہے۔ پروگرام کی صدارت این پی سنگھ (ریٹائرڈ آئی اے ایس، چیئرمین بھارتیہ شکشا بورڈ) نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب پرتاپ سوم ونشی (مینیجنگ ایڈیٹر، ہندوستان، ہندوستان ٹائمز گروپ) نے شرکت کی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ پروفیسر فوزان احمد 'صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ' نے عزیز نبیل صاحب کی شاعری اور اس کے عربی ترجمہ پر ایک شاندار علمی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا، انھوں نے اپنے مقالے میں عزیز نبیل صاحب کی شاعری کے اہم مضامین، اس کی لفظیات اور معنوی خوبیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کئی اشعار کا کلاسیکل اور جدید شعرا کے مضامین سے موازنہ بھی کیا جن میں غالب اور فیض احمد فیض شامل ہیں، انھوں نے عربی ترجمہ کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ کسی شاعری کا ترجمہ ایک انتہائی دشوار عمل ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 7 جولائی 2026

ماہنامہ لاریب

لکھنؤ: بزم لاریب کے زیر اہتمام دفتر ماہنامہ لاریب، امین آباد لکھنؤ میں حافظ کرناٹکی نمبر (حصہ دوم) کی رسم اجرا و مشاعرہ کا انعقاد زیر صدارت کہنہ مشق شاعر مولانا دلاور حسین ندوی یقین فیض آبادی کیا گیا۔ نظامت کے فرائض عامر مختار نے انجام دیے جب کہ مہمانِ خصوصی کے طور پر اردو کے بے لوث خادم سید احمد فیصل رومی شریک محفل رہے۔ واصف رشید ایڈیٹر ماہنامہ لاریب نے شعرا کا استقبال کیا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے صدرِ محفل یقین فیض آبادی نے کہا کہ حافظ کرناٹکی نے مختلف صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں کی تعداد تقریباً 136 ہے۔ کرناٹک میں اردو کی تحفظ و بقا کے لیے حافظ کرناٹکی نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ رحمت لکھنوی نے کہا کہ ماہنامہ 'لاریب' نے ادھر کچھ برسوں میں کئی اہم نمبر شائع کیے ہیں اس لیے واصف رشید مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے مزید کہا حافظ کرناٹکی نے بچوں کے ادب پر بھی خاطر خواہ توجہ دی اور ادب اطفال کے حوالے سے کافی متاثر کن نظمیں اور نثری تخلیقات سپرد قلم کیں جو رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ کنوینر پروگرام واصف رشید

نے کہا کہ اس سے قبل حافظ کرناٹکی نمبر 2015 میں میرے والد مرحوم رشید قریشی نے نکالا تھا جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 جولائی 2026

'خواب منزل' اور 'ٹوٹتی سانسوں کے درمیان'

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی کے زیر اہتمام قطر میں

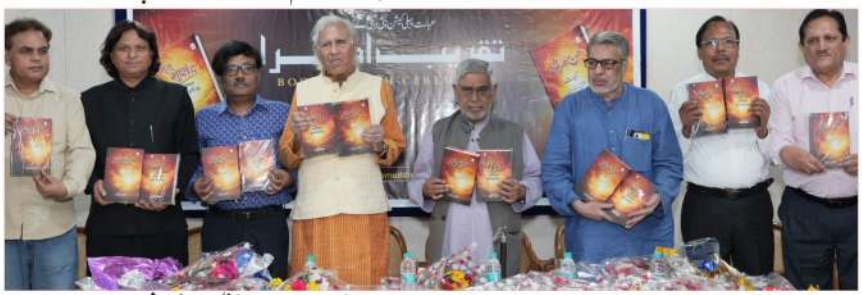


مقیم معروف شاعر اور فکشن نگار ڈاکٹر وصی الحق وصی کی دو کتابوں 'خواب منزل' (دیوانِ وصی) اور 'ٹوٹتی سانسوں کے درمیان' کی تقریب اجرا منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر ادیبوں، شاعروں اور ناقدین نے دونوں کتابوں پر اپنے تاثر پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر وصی الحق وصی کی ادبی خدمات اور تخلیقی جہات کا جائزہ لیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر وصی الحق وصی کی شاعری میں ہجرت، تنہائی، جدید انسان کی داخلی کشمکش، وقت کی بے ثباتی اور روحانی جستجو جیسے موضوعات نمایاں انداز میں سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے خواب منزل کو موضوعاتی تنوع اور فنی پختگی کا حامل دیوان قرار دیا، جب کہ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ڈاکٹر وصی الحق وصی نے اردو میں دیوان کی روایت کو نئی تازگی کے ساتھ پیش کیا ہے، جہاں جدت اور ندرت دونوں موجود ہیں۔ خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ نے شاعر کی شاعری اور افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی لفظیات، اسلوب اور مضمون آفرینی انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مجری شاعری کے تناظر میں ڈاکٹر وصی الحق وصی کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ہجرت کا کرب ان کی شاعری کا بنیادی حوالہ ہے۔ معروف صحافی سہیل انجم نے خواب منزل کی شعری زبان اور موضوعاتی وسعت پر روشنی ڈالی، جب کہ حقانی القاسمی نے کہا کہ شاعر نے 'خواب' کو ایک علامتی استعارے کے طور پر برتتے ہوئے اپنی شاعری کو نئی فکری اور جمالیاتی جہت عطا کی ہے۔ کورونا پر مبنی کہانیوں کے مجموعے 'ٹوٹتی سانسوں کے درمیان' پر عشرت ظہیر اور ڈاکٹر ذاکر فیضی نے اظہار خیال کرتے ہوئے اسے وبائی دور کے انسانی المیوں کی موثر تخلیقی دستاویز قرار دیا۔ تقریب کی نظامت معین شاداب نے کی۔ کتابوں کے اجرا کے بعد مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ مشاعرے میں پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر سہیل فاروقی، معین شادب، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر افروز طالب، وسیم خان، وسیم مجاز، ایم صدیقی، پروین شغف، اسرار رازی اور ڈاکٹر وصی الحق وصی نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں عبارت پبلی کیشن کے سربراہ سلام الدین خان نے شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جولائی 2026

من مرشد

نئی دھلی: اردو گھر میں واقع سیدنا سیف الدین آڈیٹوریم میں منفرد رنگ و آہنگ کے شاعر کرشن بہاری نور کی



شعری کلیات 'من مرشد' کی پروقار تقریب اجرا منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر اردو اور ہندی کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے کرشن بہاری نور کے شعری امتیازات، فکری جہات اور تخلیقی معنویت پر تفصیلی اظہار خیال کیا۔ واضح رہے کہ کرشن بہاری نور کے اس شعری کلیات کو معروف شاعر و ادیب معین شاداب نے مرتب کیا ہے۔ تقریب اجرا کی صدارت معروف ہندی کوی اور گیت کار بال سروپ راہی نے کی۔ انھوں نے کرشن بہاری نور سے وابستہ یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ان کے فنی اور تخلیقی امتیازات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر کرشن بہاری نور کے فرزند کنور ارون کمار بھی موجود تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ برج نارائن چکبست، رگھوپتی سہائے فراق اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی طرح کرشن بہاری نور کے بغیر اردو زبان کا تصور مکمل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح امیر خسرو اور ہندی دونوں زبانوں کے جنک تھے، اسی طرح کرشن بہاری نور نے بھی دونوں زبانوں کے درمیان ایک مضبوط پل کا کردار ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول، منصور عثمانی اور پروفیسر اخلاق آہن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ کتاب کے مرتب و مدون معین شاداب نے کلیات کی تدوین و ترتیب کے مراحل اور اس دوران پیش آنے والے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کرشن بہاری نور کی شاعری محبت، انسان دوستی، تہذیبی شعور اور زبان کی لطافت کا حسین امتزاج ہے، جسے نئی نسل تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ رسم اجرا کے بعد کرشن بہاری نور کی یاد میں 'دھیان میں گم تھا' کے عنوان سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس کی صدارت استاد شاعر سلیم شیرازی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ مشاعرے میں بال سروپ راہی، پروفیسر شہپر رسول، منصور عثمانی، منگل نسیم، ڈاکٹر کرشن کمار نام، دیکشت دنکوری، دیپک جین، اروند اثر، پروفیسر رحمٰن مصور، اختر اعظمی، انس فیضی، اسرار رازی، نادم ندیم، خوشبو سکسینہ، گایتری مہتہ اور شارقہ ملک سمیت متعدد شعرا نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کا اہتمام ڈریمس انڈیا ریسرچ فاؤنڈیشن نے اردو اکادمی، دہلی کے اشتراک سے کیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جولائی 2026

بیسویں صدی کے منتخب افسانے

نئی دھلی: سخن سرائے ادبی فورم کے زیر اہتمام سکھ دیو وہار کے پاکٹ اے میں واقع آر ڈبلیو اے کے



دفتر میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی مرتبہ کتاب 'بیسویں صدی کے منتخب افسانے' (جلد دوم) کی تقریب رسم اجرا منعقد ہوئی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر صادق نے کی، جب کہ مشہور افسانہ نگار، نگار عظیم اور ریجنل پی ایف کمشنر و معروف شاعر آلوک یادو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ ادبی فورم سخن سرائے کی روح رواں ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی ادبی خدمات، رسالہ 'بیسویں صدی' کی عالمی شہرت اور ان کی انتھک جدوجہد کا مختصراً ذکر کیا۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا جامع تعارف پیش کیا۔ معروف فکشن نگار ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی تن تنہا اردو اور رسالہ 'بیسویں صدی' کے لیے جو خدمات انجام دے رہی ہیں وہ کسی ایک فرد نہیں بلکہ پورے ادارے کا کام ہے۔ انھوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ اردو رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ ڈسٹرکٹ جج، امروہہ مینا خان نے کہا کہ ادب اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک قارئین خلوص کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے اور اسے فروغ دیتے رہتے ہیں۔ نگار عظیم نے کہا کہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نہ صرف ایک محنتی مدیرہ بلکہ ایک عمدہ تخلیق کار بھی ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی اردو ادب کی آبیاری کے لیے وقف رکھی ہے۔ افسانہ نگار عذرا نقوی نے کہا کہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی ادبی خدمات کو ملک ہی نہیں بلکہ بیرونِ ممالک میں بھی سراہا جا رہا ہے اور ان کی بین الاقوامی پذیرائی ان کی ادبی حیثیت کا واضح ثبوت ہے۔

آلوک یادو، شعیب رضا خاں وارثی، خورشید اکرم اور معروف شاعر معین شاداب نے بھی 'بیسویں صدی' کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر صادق نے ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ جس مستقل مزاجی اور خلوص سے ادب اور صحافت کی ترویج و ترقی میں مصروف ہیں، وہ اردو کا قیمتی سرمایہ ہے۔ پروفیسر صادق نے تجویز پیش کی کہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہونے والی منتخب شاعری کو بھی کتابی شکل میں مرتب کیا جانا چاہیے۔ آخر میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ادبی رسالہ جاری رکھنا انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔ انھوں نے مالی وسائل کی کمی اور مطالعے کے کم ہوتے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے اہل اردو سے اپیل کی کہ وہ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقت، تعاون اور وسائل کے ساتھ آگے آئیں۔ انھوں نے تقریب کے انعقاد پر ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کے اظہار تشکر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2026

ماہنامہ 'قرطاس'

ناگپور: صدر مسلم لائبریری، ناگپور میں 2 اگست 2026 کو منعقدہ ایک باوقار تقریب میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، ممبئی کے صدر جناب حسین اختر کے دستِ مبارک سے ماہنامہ قرطاس کے خصوصی 'پریم چند نمبر' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حسین اختر نے کہا کہ اردو رسائل کا تسلسل اور فروغ مستقل محنت، ادبی وابستگی اور اجتماعی تعاون کا متقاضی ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر اردو رسائل کی حوصلہ افزائی اور مالی معاونت کے لیے کوشاں ہے تاکہ معیاری ادبی جرائد کی اشاعت کا سلسلہ برقرار رہے۔

تقریب میں ماہنامہ 'قرطاس' کے مدیر محمد محبّ الامین، معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسداللہ، افسانہ نگار عبدالوحید، شاعر ریاض کامل، مصطفیٰ منیر اور صدر مسلم لائبریری کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسداللہ، 5 اگست 2026

وفیات

پروفیسر تاج انور

نئی دھلی: معروف ماہر تعلیم اور مرزا غالب کالج گیا کے بانی صدر شعبۂ اردو پروفیسر تاج انور کا 25 جولائی کو ہولی فیملی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 88 برس کے تھے اور گذشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ نماز جنازہ بعد نماز ظہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطے میں ادا کی گئی، جس کے بعد انھیں جامعہ ملیہ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پروفیسر تاج انور نے مگدھ یونیورسٹی سے وابستہ مرزا غالب کالج گیا میں طویل عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں اور شعبۂ اردو کے بانی صدر رہے۔ سبکدوشی کے بعد ایک عرصے تک اپنے گھر علی گنج روڈ نمبر 6 گیا میں مقیم تھے۔ پروفیسر تاج انور کی پیدائش 2 جنوری 1938 کو صادق پور پٹنہ سٹی میں ہوئی تھی جو ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے دادا عبدالکریم، والد عبدالحنان، والدہ حمیدہ خاتون تھیں۔ تاج انور تین بھائی، ایک بہن تھے۔ ان کا اصل نام محمد انور تھا۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹیاں شاداں تخیل، نور افشاں اور نوشینہ جمال ایک بیٹا ذیشان انور، پوتا پوتی، نواسہ، نویسی ہیں۔ اہلیہ مرحومہ صنوبر تاج تھیں۔ تاج انور میں یوں تو بہت ساری خوبیاں تھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمہ وقت ایک استاد تھے۔ طالب علم کے سوالیہ نگاہوں کا جواب بن جانا انھیں بہت مرغوب تھا۔ ان کے پاس کوئی بڑا اثاثہ نہیں ہے مگر مرزا غالب کالج گیا سے فارغ ہوکر نکلنے



والے ہزاروں طلبا و طالبات ان کا اثاثہ ضرور ہیں۔ ان کے انتقال پر علم و ادب سے وابستہ ادبی شخصیات نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی و دیگر ذرائع، 27 جولائی 2026

بانو سرتاج

چندرپور: اردو اور ہندی ادب کی معروف مصنفہ افسانہ نگار مزاح نگار اور مترجم ڈاکٹر بانو سرتاج قاضی 13 اگست 2026 کو 81 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

بانو سرتاج کی پیدائش 17 جولائی 1945 کو پاندھرکوڑ ضلع ایوت محل مہاراشٹر میں ہوئی۔ انھوں نے



بی ایڈ کے علاوہ اردو ہندی اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ تعلیم کے شعبے میں پی ایچ ڈی کی اور گاندھیائی افکار میں اعلیٰ تعلیمی ڈپلومہ حاصل کیا۔ انھوں نے تدریس کے میدان میں بھی طویل عرصے تک خدمات انجام دیں اور بلاس پور چھتیس گڑھ کے لال بہادر شاستری کالج آف ایجوکیشن کی پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالی۔

ادب اطفال میں بانو سرتاج کا نام بہت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے نئی نسل کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں ناول یک بابی ڈرامے، نظمیں، مضامین اور لوک کہانیاں تحریر کیں۔ بچوں کے تعلق سے لکھی گئی کتابوں میں، جنگل میں منگل اور پکیا اور پری چھم کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں میں دائروں کے قیدی، بارہ کہانیاں دو کی، 70 کہانیاں غیر ملکوں سے، مآل، ہندوستان کی اکتالیس اول خواتین وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بچوں کے ادب کے ساتھ انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ہمرٹھے میاں کی لکڑیاں 2006 میں منظر عام پر آیا۔ ان کی شاعری میں بچوں کے لیے محبت شفقت اور ممتا کا جذبہ نمایاں تھا۔ وہ بچوں اور بچوں کے ادب سے متعلق ادبی اجتماعات کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرتی رہیں۔ آگرہ یونیورسٹی کے پروگرام ہوں یا مہاراشٹر کی ادبی سرگرمیاں، دہلی کی کانفرنسیں ہوں یا کانپور کے پروگرام۔ ان کی تحریروں میں محفوظ بچپن ان کی سب سے قیمتی ادبی میراث ہے اور یہی میراث انھیں اردو ادب کی تاریخ میں دیر تک زندہ رکھے گی۔ انھیں مختلف اداروں اور تنظیموں کی جانب سے اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں۔ بال ساہتیہ پرسکار کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے بھی اعزاز مل چکا ہے۔

بشکریہ زیبا نسیم ممبئی، آواز دی وائس، 14 اگست 2025

سمت سرکار

دہلی: ممتاز مورخ اور جدید ہندوستانی تاریخ کے اسکالر، سمت سرکار کا 13 اگست 2026 کو نئی دہلی کے ایک نجی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 87 سال کے تھے۔ ان کی پیدائش برہمن سماج میں 1939 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے



پریسڈنڈی کالج کلکتہ سے بی اے (آنرز) کیا تھا۔ جب کہ کلکتہ یونیورسٹی سے انھوں نے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ تاریخ داں کے ساتھ سماجی خدمت گار کے طور پر بھی جانے جاتے تھے۔ یہ کئی برس تک کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ بعد میں بردوان یونیورسٹی میں بہ بحیثیت ریڈر اپنے فرائض انجام دیے۔ 1974-2004 تک وہ دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے اور وولفسن کالج، آکسفورڈ کے فیلو رہے۔ وہ امریکہ اور یورپ کی کئی نامور یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔

ان کی تصنیفات میں بنگال میں سودیشی تحریک، 1903-1908 (1973)، جدید ہندوستان (1989)، اور رائٹنگ سوشل ہسٹری (1998) شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی اہلیہ تانیکا سرکار کے ساتھ ویمن اینڈ سوشل ریفارم ان ماڈرن انڈیا (2007) اور کاسٹ ان ماڈرن انڈیا (2013) جیسی کتابیں بھی ایڈٹ کر چکے ہیں۔

بہ شکریہ، دی ہندو، دہلی، 14 اگست 2026

امیر احمد راجہ

نئی دھلی: اردو صحافت کے سینئر ترین اور معروف کرائم رپورٹر امیر احمد مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ وہ گذشتہ چار روز سے لوک نائک جے پرکاش (ایل این جے پی) اسپتال میں زیر علاج تھے۔ امیر احمد راجہ نے اپنی صحافتی زندگی کا بیشتر حصہ اردو صحافت میں جرائم کی رپورٹنگ کے لیے وقف کیا۔ وہ دہلی کے جرائم اور پولیس سے متعلق خبروں پر گہری نظر رکھتے تھے اور کئی دہائیوں تک اس شعبے میں اپنی منفرد شناخت قائم رکھی۔



ان کی رپورٹنگ میں خبر کی تہہ تک پہنچنے، حقائق کی تصدیق اور ذرائع سے مضبوط رابطے کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ امیر احمد راجہ نے اپنے طویل صحافتی سفر کے دوران پرتاپ، فیصل، ملاپ، ان دنوں، مشرقی آواز اور نئی دنیا سمیت متعدد اخبارات میں خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصے تک انھوں نے 'سیاسی تقدیر' اخبار میں بھی کام کیا۔ صحافت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ انھوں نے خود کو بھی ہم آہنگ کیا اور سال 2015 میں 'اردو نیوز سروس' کے نام سے اپنی ایجنسی قائم کی، جس کے ذریعے وہ فری لانس صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک تجربہ کار رپورٹر تھے بلکہ دہلی کی اردو صحافت میں نئی نسل کے متعدد صحافیوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بھی رہے۔ کرائم رپورٹنگ کے میدان میں ان کے وسیع تجربے، پولیس اور انتظامیہ کے ساتھ ان کے پیشہ ورانہ روابط اور خبر کو پرکھنے کی صلاحیت نے انھیں اپنے ہمعصر صحافیوں میں ممتاز مقام عطا کیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ امیر احمد راجہ کی نماز جنازہ بعد نماز عصر کوچہ پنڈت کی مسجد چاندوالی میں ادا کی گئی، جس میں صحافیوں، سماجی و سیاسی شخصیات، دوستوں، عزیزوں اور بڑی تعداد میں اہل علاقہ نے شرکت کی۔ نمازِ جنازہ کے بعد ان کا جسد خاکی دہلی گیٹ قبرستان لے جایا گیا جہاں سیکڑوں سوگوران کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 اگست 2026

خراجِ عقیدت

اسد بھوپالی

ایودھیا: معروف شاعر اسد بھوپالی کے یوم پیدائش کے موقعے پر اردو بچاؤ تحریک اور آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت مشترکہ طور پر ماسٹر ارشاد ربانی کی رہائش گاہ پر ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے نامور



شعرا اور ادبا نے شرکت کی۔ صدارت کررہے عزیز لکھنوی نے کہا کہ ہندی سنیما کا سنہری دور بہت ہی اچھا تھا۔ یہ اپنے اداکاروں اور موسیقاروں کی وجہ سے یادگار نہیں ہے، بلکہ اس کے گیت کاروں کی وجہ سے ہے جنھوں نے الفاظ کو جذبات کی روح سے ڈھالا ہے۔ اسد بھوپالی ایسے ہی ایک فنکار تھے، انھوں نے فلمو ں کے لیے کئی یادگار نغمے لکھے ہیں۔ نظامت کے دوران مزمل فدا نے بتایا کہ اسداللہ خان (اسد بھوپالی) جو کہ بھوپال میں 10 جولائی 1921 کو پیدا ہوئے، نے بھوپال میں اردو، فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق انھیں مشاعروں میں شرکت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ 1949 میں ان کی شاعری سے متاثر ہوکر فضلی برادران نے انھیں فلمی دنیا میں آنے کی دعوت دی۔ ساحر، شکیل، مجروح اور شیلندر جیسے عظیم فنکاروں میں ممبئی میں اپنا نام بنانا آسان نہیں تھا، لیکن اسد بھوپالی صاحب نے اپنی سادہ، دل کو گرما دینے والی فلم سے اپنی پہچان بنائی۔ انھوں نے اپنی طاقتور شاعری سے منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کے قلم نے اردو کی نزاکت اور ہندی کی سادگی کو یکجا کرکے براہ راست دل پر اثر کیا۔ انھیں 'کبوتر جا جا' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا لیکن تب تک بیماری نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسد بھوپالی 9 جون 1990 کو چل بسے لیکن ان کے گانے زندہ ہیں۔ ان کا یہ شعر آج بھی ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

دل کا سونا ساز ترانہ ڈھونڈے گا
مجھ کو میرے بعد زمانہ ڈھونڈھے گا

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 جولائی 2026

گلزار دہلوی

نئی دھلی: پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر ایوانِ غالب میں ایک یادگاری جلسہ منعقد کیا گیا۔ یہ تقریب گلزار دہلوی کی صد سالہ یادگار کمیٹی دہلی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی، جس میں سابق رکن



پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جے پرکاش اگروال نے گلزار دہلوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے مثال شخصیت کے مالک اور انتہائی نفیس انسان تھے۔ انھوں نے کہا کہ گلزار دہلوی ان کے والد رام چرن اگروال کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ اردو زبان پر ان کی ایسی گرفت تھی کہ بڑے بڑے اہل زبان بھی ان کی فصاحت و بلاغت کے معترف تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ آج ہم صرف ایک شاعر کو یاد کرنے کے لیے جمع نہیں ہوئے بلکہ دہلی کی اس تہذیبی روح کو سلام پیش کرنے آئے ہیں جس نے صدیوں سے مختلف مذاہب، زبانوں اور ثقافتوں کو ایک ہی گلشن کے رنگارنگ پھولوں کی طرح پروان چڑھایا ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ گلزار دہلوی اردو کو اپنی مادری زبان قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے اردو کو شیر مادر کے ساتھ پیا ہے، اس لیے یہ میرے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔ حسن ضیا نے کہا کہ گلزار دہلوی فرقہ وارانہ رواداری کی بہترین مثال تھے۔ ان کے نظریات کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ بنتا تو وہ پوری جرأت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ شاعری اور تقریروں میں بڑی بڑی باتیں کرنا آسان ہے، لیکن عملی زندگی میں اپنے اصولوں پر قائم رہنا مشکل ہوتا ہے، اور گلزار دہلوی نے اپنی نجی اور سماجی زندگی میں ہمیشہ رواداری اور انسان دوستی کو فروغ دیا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ گلزار دہلوی صرف ایک قادرالکلام شاعر ہی نہیں بلکہ مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے مضبوط علمبردار بھی تھے۔ جسٹس اقبال انصاری نے کہا کہ گلزار دہلوی کی زندگی محبت، رواداری اور آئینی اقدار کی پاسداری کا روشن نمونہ تھی۔ ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ گلزار دہلوی نے اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو کے ادبی سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ایڈوکیٹ اعجاز مقبول نے کہا کہ گلزار دہلوی کی شاعری میں محبت، انسانیت اور قومی ہم آہنگی کا پیغام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی یادیں، افکار اور ادبی سرمایہ ہمیشہ اہل اردو کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ اس تقریب کی نظامت شیخ علیم الدین اسعدی نے کی۔ جلسہ کے دوران ان کے مرتب کتابچہ 'گلزار دہلوی کی خوشبو' کا مہمانان کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ بعدازاں شعری نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت انتظار نعیم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جولائی 2026

قمر رئیس

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار برہ پور، بھاگلپور کے زیر اہتمام نوشین جہاں کی رہائش گاہ پر شاعر جوثر ایاغ کی صدارت میں پروفیسر قمر رئیس کی یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر انجمن باغ و بہار کے



جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے پروفیسر قمر رئیس کے حیات وفن کی روشنی میں کہا کہ اردو کی ادبی دنیا میں قمر رئیس کی پہچان کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ مارکس اور لینن سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ ان کی کتابوں میں پریم چند کے ناولوں میں تنقیدی مطالعہ، تلاش وتوازن، تنقیدی تناظر، شام نوروز، پریم چند فکر وفن، اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت اور ہمعصر رجحانات، اصناف ادب اردو وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، امتیاز میر ایوارڈ، بہار اردو اکادمی ایوارڈ، سید احتشام ایوارڈ، پریم چند ایوارڈ، نیاز فتح پوری ایوارڈ، غالب ایوارڈ اہم

ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسالہ کے مدیر رہے جن میں علی گڑھ میگزین، عصری آگہی، نیا سفر، ایوان اردو، آجکل، آب وگل خاص ہیں۔ اس موقعے پر جوثر ایاغ نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس ایک تنقید نگار کے علاوہ ایک بڑے نظم نگار بھی تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 13 جولائی 2026

منشی پریم چند کی 146 ویں یوم پیدائش پر یادگار نمائش

رامپور: رضا لائبریری نے ہندی ادب کے عظیم کہانی کار اور ناول نگار منشی پریم چند کی 146 ویں یوم پیدائش کی یاد میں ایک خصوصی نمائش کا افتتاح کیا۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے نمائش کا افتتاح کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کہا کہ رامپور رضا لائبریری باقاعدگی سے خاص مواقع پر نمائشوں کا اہتمام کرتی ہے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آج منشی پریم چند کی 146 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر اس نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ منشی پریم چند ادبی دنیا کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ وہ کاشی میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی ادبی تخلیق پروان چڑھی۔ انسانی تاریخ میں بہت کم لکھنے والے دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ منشی پریم چند کے لکھے مضامین کو شروع کیے ہوئے تقریباً 100 سال ہو چکے ہیں اور ان



کی مطابقت آج بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی کہ 100 سال پہلے تھی۔ منشی پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ان کی کہانیوں کو سماجی تانے بانے میں بنا گیا۔ اس لیے ان کا کوئی بھی ناول، کہانی، مضمون یا دیگر تحریریں پڑھیں تو اس وقت کے معاشرے کے اخلاق، افکار، رویے اور اقدار صاف نظر آتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ منشی پریم چند کو حقیقت پسند مصنف سمجھا جاتا تھا اور انھیں ہائپر ریئلسٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی بھی عظیم انسان کا یوم پیدائش منانے کا مقصد ان کی زندگی اور کردار سے سبق حاصل کرنا ہے۔ منشی پریم چند کی زندگی ہمیں ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ ہم پوری لگن کے ساتھ اپنے اہداف اور اپنے کام کو پوری لگن سے حاصل کرنا سیکھتے ہیں اور اپنا 100 فیصد دیتے ہیں۔ منشی پریم چند نے اپنے خاندانی یا مالی حالات سے قطع نظر اپنی مستعدی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ لکھتے رہے اور جس طرح ان کی تحریریں موجودہ نسل کے ذہنوں کو مالا مال کر رہی ہیں اسی طرح آنے والی نسلوں کے ذہنوں کو بھی مالا مال کرتی رہیں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ہم دنیا کی عظیم ترین ادبی شخصیات کی فہرست مرتب کریں تو منشی پریم چند کا نام ضرور شامل ہوگا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 2 اگست 2026

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر ..... بتاریخ ..... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

.....

پتہ : .....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

چنار بک فیسٹیول 2026 کی تصویری جھلکیاں
















उर्दू दुनिया, मासिक, सितम्बर–2026,वर्ष:28, अंक:09
URDU DUNIYA Monthly, September-2026, Vol.28, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/08/2026**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ



قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025